سرما ۱۹۹۵

# آج

ترتیب: اجمل کمال

خصوصی شمارہ: ہندی کہانیاں

امرکانت — رام کمار — اُشا پریم ودا — رویندر کالیا

کاشی ناتھ سنگھ — موہن راکیش — بھیشم ساہنی

نرمل ورما — شانی — اسغر وجاہت — منو بھنڈاری

راجی سیٹھ — سودیش دیپک — گووند مشر — عبدل بسم اللہ

شری لال شکل — گیان رنجن — اُدے پرکاش

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

# آج

شمارہ ۱۸: سرما ۱۹۹۵

جنوری-مارچ ۱۹۹۵

مینیجنگ ایڈیٹر

زینت حسام

اہتمام

آج کی کتابیں

بی ۱۳۰، سیکٹر ۱۱ بی، نارتھ کراچی ٹاؤن شپ، کراچی ۷۵۸۵۰

طباعت

ایجوکیشنل پریس

پاکستان چوک، کراچی

رابطے کے لیے پتا

اے-۱۶، سفاری ہائٹس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

فون: ۸۱۱۳۴۷۴

بیرونِ ملک خریداری کے لیے پتا

محمد عمر میمن

۵۳۱۷، ریجنٹ اسٹریٹ، میڈیسن، وِسکانسن ۵۳۷۰۵، یو ایس اے

"آج" کے شمارہ ۱۳ (بہار ۱۹۹۳) میں عربی کہانیوں کے انتخاب کی پہلی جلد اور شمارہ ۱۵ (سرما/بہار ۱۹۹۴) میں فارسی کہانیوں کے انتخاب کا پہلا حصہ پیش کیا گیا تھا۔ موجودہ شمارہ ہندی کہانیوں کے انتخاب کی پہلی جلد ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے اس منصوبے کا پہلا مرحلہ مکمل ہو جاتا ہے جس کا مقصد اردو سے لسانی قربت رکھنے والی زبانوں میں مختصر کہانی کے ارتقا کا جائزہ لینا اور "آج" کے پڑھنے والوں کے لیے ان زبانوں میں لکھی گئی کہانیوں کا ایک کم و بیش نمائندہ انتخاب تیار کرنا ہے۔ اس منصوبے کے اگلے مراحل آئندہ شماروں میں آپ کے سامنے آتے رہیں گے۔

اردو سے لسانی قربت کی بات ہندی کے سلسلے میں ایک منفرد اہمیت رکھتی ہے۔ یوں تو یہ بات لسانیات کے دائرے تک محدود نہیں رہتی، بہت سے اور مسئلوں تک جا پہنچتی ہے، لیکن یہاں ان مسئلوں سے بحث نہیں۔ جس پہلو کی طرف اشارہ مقصود ہے وہ یہ ہے کہ، مروج رسم خط کو چھوڑ کر، اردو اور ہندی آپس میں اتنا کچھ مشترک رکھتی ہیں کہ ہندی کے کسی متن کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے ترجمے کا لفظ استعمال کرتے ہوئے تامل ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس شمارے میں شامل کہانیوں کو اردو میں منتقل کرنے میں اوسطاً پانچ فیصد الفاظ تبدیل کیے گئے ہیں۔ یہ عمل بڑی حد تک محض رسمِ خط کی تبدیلی پر مشتمل ہے، جس کے لیے اردو میں اگر کوئی لفظ ہے تو وہ میرے علم میں نہیں، اس لیے اسے ترجمہ کہے بغیر چارہ نہیں۔

اس طرح دیکھا جائے تو اس انتخاب میں شامل ہندی کہانیوں کا مطالعہ ادبی ہی نہیں، لسانی تجربہ بھی ہے۔ اردو اور ہندی دونوں کی قواعد کی بنیاد کھڑی بولی کی قواعد پر ہے؛ اور بہت سے الفاظ کے علاوہ اردو کے بنیادی افعال تمام کے تمام وہی ہیں جو ہندی میں بھی موجود ہیں۔ البتہ جب نئی اصطلاحات وضع کرنے کا مرحلہ آتا ہے تو ہندی کو سنسکرت کی مدد لینی پڑتی ہے اور اردو کو فارسی اور عربی کی۔

اردو اور ہندی فکشن اپنے درمیان ایک اور بھی قدر مشترک رکھتے ہیں: دونوں کا آغاز پریم چند کی تحریروں سے ہوا تھا۔ اگرچہ ہندی میں بھی اُن سے پہلے کی لکھی ہوئی چند کہانیاں تلاش کر لی گئی ہیں اور اردو میں بھی پریم چند کو اُن کے مقام سے محروم کرنے کی سرکاری اور غیر سرکاری کوششیں جاری رہی ہیں، لیکن اس تمام جستجو سے جس بات پر ذرا بھی فرق نہیں پڑا وہ یہ ہے کہ پریم چند اب بھی اردو اور ہندی کے پہلے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ اور ہر بڑے ادیب کی طرح انھوں نے دونوں زبانوں میں فکشن کی روایت کے خدوخال متعین کیے ہیں۔

ہندی کہانیوں کا مطالعہ، اور اُن کا اردو فکشن سے موازنہ، اس نقطۂ نظر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ یہ روایت ہندی میں کس طرح پھلی پھولی اور اُن کے بعد آنے والے افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے تخلیقی جوہر کو کام میں لا کر اس روایت میں کیسے اضافے کیے۔

اس شمارے کے لیے ہندی کہانیوں کے متن حاصل کرنے میں ڈاکٹر نریندر ناتھ کالیا، ڈاکٹر شمیم حنفی، عبدالغنی، عبدل بسم اللہ اور زیبا علوی کا تعاون ہمیں حاصل رہا جس کے لیے ان کا شکریہ واجب ہے۔

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

# ترتیب


امر کانت

۹

ڈپٹی کلکٹری

رام کمار

۲۸

چیری کے پیڑ

اُشا پریسنم ودا

۳۶

واپسی

راجیندر یادو

۴۳

جہاں لکشمی قید ہے

کاشی ناتھ سنگھ

۶۴

صدی کا سب سے بڑا آدمی


Scanned with CamScanner

موہن راکیش

۶۲

بلبے کا مالک

بھیشم ساہنی

۸۳

وانگ چُو

۱۰۱

امرتسر آ گیا ہے

نرمل ورما

۱۱۳

ایک دن کا مہمان

شانی

۱۳۱

دوزخی

اصغر وجاہت

۱۴۳

کیک

منو بھنڈاری

۱۵۷

ترشنکو

راجی سیٹھ

۱۷۱

آمنے سامنے

سودیش دیپک

۱۷۹

تماشا

گووند مشر

۱۸۹

پھانس

عبدل بسم اللہ

۱۹۵

رہائی

۲۳۱

آدھا پھول آدھا شو

## شری لال شکل

۲۰۸

فساد

## گیان رنجن

۲۱۶

گھنٹا

## اودے پرکاش

۲۲۵

رام سجیون کی پریم کہانی

۲۳۱

ترچھ

***

۲۵۸

لکھنے والوں کا تعارف

# امر کانت

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

## ڈپٹی کلکٹری

شکل دیپ بابو لگ بھگ ایک گھنٹے بعد واپس لوٹے۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے انھوں نے بیٹھک میں جھانکا۔ کوئی موکل نہیں تھا، اور محرر صاحب بھی غائب تھے۔ وہ اپنے کمرے کے سامنے بیٹھک میں کھڑے ہو کر بندر کی طرح آنکھیں مٹامٹا کر دیکھنے لگے۔ ان کی بیوی جمنا چوکے کے پاس پیڑھی پر بیٹھی ہونٹ پر ہونٹ دبائے ترکاری کاٹ رہی تھی۔ وہ دھیمے دھیمے مسکراتے ہوئے اپنی بیوی کے پاس چلے گئے۔ ان کے چہرے پر ایک غیر معمولی اطمینان، اعتماد اور ایک قسم کے جوش کے آثار غالب تھے۔ گھنٹا بھر پہلے ایسی بات نہیں تھی۔

بات اس طرح شروع ہوئی۔ صبح شکل دیپ بابو دتون کلی کر کے اپنے کمرے میں بیٹھے ہی تھے کہ جمنا نے ایک طشتری میں دو جلیبیاں ناشتے کے لیے لا کر رکھ دیں۔ وہ بغیر کچھ بولے ناشتا کرنے لگے۔

جمنا پہلے تو ایک آدھ منٹ چپ رہی۔ پھر شوہر کی طرف اُچٹتی نظر سے دیکھتے ہوئے اس نے بات چھیڑ دی۔ "دو تین دن سے ببوا بہت اُداس رہتے ہیں۔"

"کیا؟" سر اُٹھا کر شکل دیپ بابو نے پوچھا اور اُن کی بھنویں تن گئیں۔ جمنا نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، "کل بولے اس سال ڈپٹی کلکٹری کی بہت سی جگہیں ہیں، مگر بابوجی سے کہتے ڈر لگ رہا ہے۔ کہہ رہے تھے دو چار دن میں فیس بھیجنے کی تاریخ نکل جائے گی۔"

شکل دیپ بابو کا بڑا لڑکا نارائن گھر میں ببوا کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اُس کی عمر لگ بھگ چوبیس سال تھی۔ پچھلے تین چار سال سے بہت سے امتحانوں میں بیٹھنے، ایم ایل اے لوگوں کے دروازوں کے چکر لگانے، اور اور بھی اُلٹے سیدھے فن استعمال کرنے کے باوجود اس کو اب تک کوئی نوکری نہیں ملی تھی۔

Scanned with CamScanner

دو مرتبہ ڈپٹی کلکٹری کے امتحان میں بھی وہ بیٹھ چکا تھا، پر بدقسمتی! اب ایک موقع اُسے اور ملا تھا جس کو وہ گنوانا نہیں چاہتا تھا، اور اسے یقین تھا کہ چوں کہ جگہیں کافی ہیں اور اس مرتبہ وہ جی جان لگا کر محنت کرے گا، اس لیے بہت ممکن ہے کہ وہ لے لیا جائے۔

شکل دیپ بابو مختار تھے، لیکن ادھر ڈیڑھ دو سال سے مختاری کی گاڑی اُن سے چلائے نہیں چل رہی تھی۔ بڑھاپے کی وجہ سے نہ ان کی آواز میں وہ زور رہا تھا نہ جسم میں وہ طاقت اور نہ چال میں وہ اکڑ، اس لیے مؤکل ان کے یہاں کم ہی پہنچتے تھے۔ کچھ تو آ کر بھڑک جاتے تھے۔ اس حالت میں وہ رام کا نام لے کر کچہری جاتے، کبھی کبھار کچھ پا جاتے جس سے دو وقت کی روٹی چل جاتی۔

جمنا کی بات سن کر وہ ایک دم بگڑ گئے۔ غصے سے ان کا منھ بن گیا اور وہ سر کو جھٹکتے ہوئے، کٹکھنے کُتے کی طرح بولے، "تو میں کیا کروں؟ میں تو حیران ہو گیا ہوں۔ تم لوگ میری جان لینے پر تلے ہوئے ہو۔ صاف صاف سن لو۔ میں تین بار کہتا ہوں، مجھ سے نہیں ہو گا، مجھ سے نہیں ہو گا، مجھ سے نہیں ہو گا!"

جمنا کچھ نہ بولی۔ کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ شوہر کا غصے میں آنا قدرتی بات ہے۔

شکل دیپ بابو ایک دو لمحے خاموش رہے، پھر داہنے ہاتھ کو اوپر نیچے نچاتے ہوئے بولے، "پھر اس کی گارنٹی کیا ہے کہ بابو صاحب اس مرتبہ لے ہی لیے جائیں گے؟ معمولی اسے جی آفس کی کلرکی میں تو پوچھے نہیں گئے، ڈپٹی کلکٹری میں کون پوچھے گا؟ آپ میں کیا خوبی ہے صاحب، کہ آپ ڈپٹی کلکٹر ہو ہی جائیں گے؟ تھرڈ کلاس بی اے آپ ہیں، چوبیس گھنٹے مٹر گشتی آپ کرتے ہیں، دن رات سگریٹ آپ پھونکتے ہیں، آپ میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں؟ بڑے بڑے بہہ جائیں، گدھا پوچھے کتنی تھاہ! پھر مقدر مقدر کی بات ہوتی ہے۔ بھائی سمجھ لو تمھارے مقدر میں نوکری لکھی ہی نہیں۔ ارے ہاں، اگر کتنے کاشی جانے لگے تو ہانڈیاں کون چاٹے گا؟ ڈپٹی کلکٹری، ڈپٹی کلکٹری! سچ پوچھو تو ڈپٹی کلکٹری کے نام سے مجھے نفرت ہو گئی ہے۔" اور ہونٹ لٹک گئے۔

جمنا نے اب دھیمے لہجے میں ان کی بات رد کی۔ "ایسی بدفال منھ سے نہیں نکالتے ہیں۔ ہمارے لڑکے میں کون سی ایسی خرابی ہے؟ لاکھوں میں ایک ہے۔ صبر کی سو دھار! میرا تو دل کہتا ہے ببوا ضرور لے لیے جائیں گے۔ پھر پہلے ہی بھوک پیاس میں پلا ہے۔ ماں باپ کا سکھ تو اس نے جانا ہی نہیں۔ اگر یہ بھی نہ ہوا تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ یوں ہی نہ معلوم کیوں اداس رہتا ہے۔ ٹھیک سے کھاتا پیتا نہیں، ٹھیک سے بولتا نہیں۔ پہلے کی طرح گاتا گنگناتا بھی نہیں۔ نہ معلوم میرے لڑکے کو کیا ہو گیا ہے!" وہ دوسری طرف منھ کر کے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کرنے لگی۔

جمنا کو روتا ہوا دیکھ کر شکل دیپ بابو آپے سے باہر ہو گئے۔ غصے اور طنز سے منھ چڑاتے ہوئے بولے، "لڑکا ہے تو لے کر چاٹو! ساری خرافات کی جڑ تم ہی ہو، اور کوئی نہیں! تم مجھے زندہ رہنے دینا نہیں چاہتیں۔ جس دن میری جان نکلے گی اُسی دن تمھارا کلیجا ٹھنڈا ہو گا۔" وہ ہانپنے لگے۔

انھوں نے اتنی بے رحمی سے جمنا پر جو الزام لگایا اُسے وہ سہہ نہ سکی۔ روتی ہوئی بولی، "اچھا ٹھیک

Scanned with CamScanner

ہے، میں ساری خرافات کی جڑ ہوں تو میں کمینی ہی بچی جو آج سے کوئی بات--- رونے کی وجہ سے وہ آگے نہ بول سکی اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

شکل دیپ بابو کچھ نہیں بولے۔ وہیں بیٹھے رہے۔ معلوم ہوتا تھا اور گردن ٹیڑھی ہو گئی تھی ایک آدھ منٹ تک اسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد وہ وہیں پڑے اخبار کے ایک پھٹے پرانے ٹکڑے کو اٹھا کر اس طرح سے پڑھنے لگے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

کوئی پندرہ بیس منٹ تک وہ ایسے ہی پڑھتے رہے۔ پھر اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے لنگی کی طرح پہنی دھوتی کو کھول کر ٹھیک سے پہن لیا اور اوپر سے پشاوری کوٹ ڈال لیا جو کچھ میلا ہو گیا تھا اور جس میں دو پیوند بھی لگے تھے، اور پرانا پمپ شو پہن، ہاتھ میں چھڑی لے، ایک دو بار کھانس کر باہر نکل گئے۔

شوہر کی باتوں سے جمنا کے دل کو گہری چوٹ پہنچی تھی۔ شکل دیپ بابو کو باہر جاتے اس نے دیکھا، پر کچھ نہ بولی۔ وہ منہ پھلائے گھر کے الٹے سیدھے کام کرتی رہی۔ اور ایک گھنٹے بعد جب شکل دیپ بابو باہر سے لوٹ کر اس کے پاس آ کھڑے ہوئے تب بھی وہ کچھ نہ بولی، چپ چاپ ترکاری کاٹتی رہی۔

شکل دیپ بابو نے کھانس کر کہا، سنتی ہو، یہ ڈیڑھ سو روپے رکھ لو۔ ڈیڑھ سو روپے ببوا کی فیس میں لگیں گے، اور پچاس روپے تک رکھ دینا، شاید کوئی اور کام آ پڑے۔

جمنا نے ہاتھ بڑھا کر روپے تو ضرور لے لیے، پر تب بھی وہ کچھ نہیں بولی

لیکن شکل دیپ بابو بہت خوش تھے، اور انھوں نے جوشیلی آواز میں کہا، سو روپے ببوا کو دے دینا۔ آج ہی فیس بھیج دیں۔ ہوں گے ضرور ہوں گے۔ ببوا ڈپٹی کلکٹر ضرور ہوں گے۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ نہ لیے جائیں۔ لڑکے کے دل میں کوئی خرابی تھوڑے ہی ہے۔ رام رام! کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ نارائن جی اس بار بھگوان کی کرپا سے ڈپٹی کلکٹر ضرور بنیں گے۔

جمنا اب بھی چپ رہی اور روپوں کو ٹرنک میں رکھنے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

شکل دیپ بابو اپنے کمرے کی طرف لوٹ پڑے۔ مگر کچھ دور جا کر پھر پلٹے اور جس کمرے میں جمنا گئی تھی اس کے دروازے کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے اور جمنا کو ٹرنک میں روپے رکھتے دیکھتے رہے۔ پھر بولے، غلطی کسی کی نہیں، سارا دوش تو میرا ہے۔ دیکھو نا، میں باپ ہو کر کہتا ہوں کہ بیٹا نکما ہے! نہیں نہیں، ساری خرافات کی جڑ میں ہی ہوں، اور کوئی نہیں۔

ایک دو پل وہ کھڑے رہے لیکن پھر بھی جمنا نے کوئی جواب نہیں دیا تو کمرے میں جا کر کپڑے بدلنے لگے۔

نارائن نے اسی دن ڈپٹی کلکٹری کی فیس اور فارم بھیج دیے۔

دوسرے دن عادت کے خلاف صبح صبح شکل دیپ بابو کی نیند اچٹ گئی۔ وہ ہڑبڑا کر آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر آ کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔ گھر کے سبھی لوگ نیند میں ڈوبے تھے۔ سوئے ہوئے لوگوں کی سانسوں کی آواز اور مچھروں کی بھن بھن سنائی دے رہی تھی۔ ابھی چاروں طرف

Scanned with CamScanner

اندھیرا تھا لیکن باہر کے کمرے سے دھیمی روشنی آ رہی تھی۔ شکل دیپ بابو چونک پڑے اور دبے پیروں کمرے کی طرف بڑھنے لگے۔

ان کی عمر پچاس سے اوپر ہوگی۔ گورے، ناٹے اور دبلے پتلے آدمی تھے۔ ان کے چہرے پر ان کی ہڈیوں کا جال پھیلا ہوا تھا اور بانہوں اور گردن کی کھال جھول گئی تھی۔

دروازے کے پاس پہنچ کر انہوں نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر، ہونٹ دبا کر، کمرے کے اندر جھانکا۔ ان کا انگ انگ ان سے بڑھ کر کبھی دشمن کے سامنے سر جھکانے پڑنے میں ہوتا۔

شکل دیپ بابو کچھ دیر تک حیرانی سے اپنے بیٹے کو دیکھتے رہے جیسے کوئی خوشی کی راز انہوں نے اچانک پا لیا ہو۔ پھر وہ چپ چاپ، دھیرے سے پیچھے ہٹ گئے۔ وہ وہیں کھڑے ہو کر ذرا مسکرائے، پھر دبے پاؤں واپس دھیرے سے وہیں لوٹے اور اپنے کمرے کے سامنے، کنارے کھڑے ہو کر خوشی سے آسمان کو دیکھنے لگے۔

ان کی عادت چھ ساڑھے چھ بجے سے پہلے اٹھنے کی نہیں تھی، لیکن آج اٹھ گئے تھے تو دل اندر سے خوش نہیں ہوا۔ آسمان پر تارے اب بھی چھٹکے ہوئے تھے اور باہر کے پیڑوں کو چھوتی ہوئی، آنگن میں نہ معلوم کس طرف سے آتی ہوئی ہوا ٹھنڈک کشش لگ رہی تھی۔ وہ دوبارہ مسکرا پڑے اور دھیرے سے پھسپھسائے، "چلو، اچھا ہی ہے۔"

اور اچانک ان میں نہ معلوم کہاں کا جوش آ گیا۔ انہوں نے اسی وقت منہ ہاتھ دھویا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد بھی اندھیرا ہی رہا تو بالٹی میں پانی بھر کر غسل خانے لے جا کر نہانے لگے۔ نہا کر جب وہ باہر نکلے تو ان کے جسم میں ایک عجیب سی چستی اور ایک ناقابل بیان، اندر سے پیدا ہوا اور جوش تھا۔

اگرچہ انہوں نے اپنے سبھی کام چپ چاپ کرنے کی کوشش کی تھی، پھر بھی تھوڑی جسمانی کمزوری کی وجہ سے کچھ کھٹ پٹ ہو گئی جس سے ان کی بیوی کی آنکھ کھل گئی۔ جمنا کو پہلے تو چور وور کا شک ہوا، لیکن اس نے کھٹ پٹ جب آ کر دیکھا تو اسے تعجب ہوا۔ شکل دیپ بابو آنگن میں کھڑے آسمان کو تاک رہے تھے۔

جمنا نے فکرمندی کے لہجے میں کہا، "اتنی جلدی نہانے کی کیا ضرورت تھی؟ اتنے سویرے تو کبھی نہیں اٹھا جاتا تھا۔ کچھ ہو ہوا گیا تو؟"

شکل دیپ بابو جھینپ گئے۔ جھوٹی ہنسی ہنستے ہوئے بولے، "دھیرے سے بولو بھئی، بچہ پڑھ رہے ہیں۔"

جمنا بگڑ گئی۔ "دھیرے سے کیوں بولوں؟ اسی بچپن سے پچھلے سال بیمار پڑ جایا گیا تھا۔"

شکل دیپ بابو کو کہیں ہو گیا کہ اس طرح بات چیت جاری رکھنے سے تکرار بڑھ جائے گی، شور شرابہ ہوگا، اس لیے انہوں نے بیوی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پیچھے گھوم گئے اور چپ چاپ اپنے کمرے

Scanned with CamScanner

میں آ کر رامائن کا پاٹھ کرنے لگے۔

پوجا ختم کر کے جب وہ اٹھے تو اجالا ہو گیا تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکل آئے۔ گھر کے بڑے لوگ تو جاگ گئے تھے پر بچے ابھی تک سوئے ہوئے تھے۔

جمنا رسوئی میں کچھ کھٹر پٹر کر رہی تھی۔ شکل دیپ بابو تاڑ گئے۔ وہ رسوئی کے دروازے کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے اور کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر بیوی کو تسلے میں چاول نکالتے ہوئے دیکھتے رہے۔

کچھ دیر بعد انھوں نے سوال کیا، "کیوں رانی، آج کل تمھارا پوجا پاٹھ نہیں ہوتا کیا؟" اور جھینپ کر مسکرائے۔

شکل دیپ بابو پریاگ میں بسنے والے ایک سادھو بابا سے، جو ایک بار گھومتے گھامتے یہاں آ پہنچے تھے، مرید ہو گئے تھے۔ امید ان کو یہ تھی کہ گھر کی عورتیں بھی انھیں کی مرید ہو جائیں گی، لیکن جیسا کہ کہا جاتا ہے، عورت ذات کا کوئی اعتبار نہیں۔ انھوں نے دور کے رشتے کی ایک بوڑھی چاچی کے کہنے سے متاثر ہو کر پیچھے سے رادھا سوامی دھرم کی چاکری قبول کر لی۔

شکل دیپ بابو اس سے پہلے رادھا سوامی دھرمیوں سے نہ صرف بیزار رہتے تھے بلکہ ان پر وقت بے وقت تنقید بھی کرتے رہتے تھے۔ ان باتوں پر عورتیں کبھی کبھی تردید بھی کرتی تھیں۔ اس لیے آج جب شکل دیپ بابو نے پوجا پاٹھ کی بات کی تو جمنا نے خیال کیا کہ وہ طنز کر رہے ہیں۔ اس نے بھی جواباً کہا، "ہم لوگوں کو پوجا پاٹھ سے کیا مطلب، ہم کو تو نرک میں جانا ہے۔ جن کو سورگ میں جانا ہو وہ کریں!"

"لو بگڑ گئیں،" شکل دیپ بابو دھیمے دھیمے مسکراتے ہوئے محبت سے بولے۔ "ارے، میں مذاق تھوڑے ہی کر رہا تھا۔ میں بڑی غلطی پر تھا۔ رادھا سوامی تو بڑے پہنچے ہوئے دیوتا ہیں۔"

جمنا کو رادھا سوامی کو دیوتا کہا جانا بہت برا لگا اور وہ تنک کر بولی، "رادھا سوامی کو دیوتا کہتے ہیں؟ وہ تو پرم پتا پرمیشور ہیں۔ ان کا درجہ سب سے اونچا ہے۔ ان سے نیچے ہی برہما، وشنو اور مہیش کے لوک ہیں۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، لیکن کچھ پوجا پاٹھ بھی کرو گی؟ سنتے ہیں سچے دل سے رادھا سوامی کی پوجا کرنے سے سبھی دعائیں پوری ہوتی ہیں۔" شکل دیپ بابو جواب دے کر کانپتے ہونٹوں سے مسکرانے لگے۔

جمنا نے دوبارہ ان کو ٹوکا۔ "اس میں دکھاوا تھوڑے ہی ہوتا ہے۔ دل میں نام لے لیا جاتا ہے، سبھی کام بن جاتے ہیں اور مرنے کے بعد آتما پرم پتا سے جا ملتی ہے۔ پھر چوراسی نہیں بھگتنا پڑتا۔"

شکل دیپ بابو نے بڑے جوش سے کہا، "ٹھیک ہے۔ بہت اچھی بات ہے۔ اور سویرے اٹھ کر نام لے لیا کرو۔ صبح نہانے سے طبیعت دن بھر صاف رہتی ہے۔ کل سے تم بھی شروع کر دو۔ میں تو بدقسمت تھا، میری آنکھیں آج تک بند رہیں۔ خیر کوئی بات نہیں، اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ کل سے تم بھی صبح چار بجے اٹھ جانا۔"

اس کو ڈانٹ کر صرف کہیں اس کی نوکری کی قناعت۔ آخر سے، اس بیٹے اتنا کہنے کے بعد وہ اٹھے اور وہاں سے چل دیے۔ لیکن یکایک کچھ یاد کر کے وہ لوٹ پڑے۔

"ہاں آج کل" تم سے بیوی سے مسکراتے ہوئے پوچھا، "ان کے لیے ناشتے کا کیا انتظام کرو گی؟"

"جو روز ہوتا ہے وہی ہو گا۔ اور کیا ہو گا!" تم نے نسبتاً لاپروائی کے انداز میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن آج حلوا کیوں نہیں بنا لیتیں؟ گھر کا سامان بھی ہوتا ہے۔ اور کچھ میوے منگا لو۔"

"حلوے کے لیے گھی نہیں ہے۔ پھر اتنے پیسے کہاں ہیں؟" تم سے مجبوری ظاہر کی۔

"وہ پچاس روپے تو رکھے ہیں نا؟ انھی میں سے خرچ کرو۔ ... پانی کا جمع اڑائے کو پیسے کس نے کو نہیں ہے گا تو وہ ... زیادہ ہے کا؟ روپے کی فکر مت کرو۔ ابھی میں زندہ ہوں!" اتنا کہہ کر شنکل دیپ بابو قصہ الگ رکھ بڑھے۔ وہاں سے جاتے ہوئے وہ بیوی کو یہ بھی ہدایت کرتے گئے، "ایک بات اور کرو، تم ... ڈانٹ ... کہہ دینا کہ باہر کے کمرے میں ... نہیں تو ... پڑے گی۔ ہاں، پڑھنے میں ... ہو گا۔ دوسری بات یہ کہ ... سے کہہ دینا، وہ اندر کے کمرے میں بیٹھ کر اطمینان سے پڑھیں۔ میں باہر صحن میں بیٹھا کروں گا۔"

شنکل دیپ بابو ... ایک ... گھنٹے باہر کے کمرے میں بیٹھتے تھے۔ وہاں وہ لوگوں کا انتظار کرتے اور انھیں سمجھاتے بجھاتے۔

اس دن سے وہ ... کی ... باہر پیپل کے پیڑ کے نیچے، جہاں کافی سایہ رہتا تھا، ایک میز اور ... بیٹھتے۔ ... وہاں سے ... دیکھ کر حیران ہوتے۔ جب ... ہوتے ہیں ... بیٹھک کا ... سے پوچھا، "... صاحب، آج کیا بات ہے؟" تو ... سے ... کہا، "... گرمی ہے۔" ... جوڑ کی طرح ہاتھ ہلا لیا اور ... ایسے ... زندگی ... ہو۔

شام کو ... وہ پہلے ہی سے گھر ... آ جاتے تھے ... اس دن دیر سے ہوٹے۔ انھوں نے بیوی کے ہاتھ میں چار روپے تو دیے ہی، ساتھ دو سیب اور پانچ قیمتی سگریٹ کے پیکٹ بھی بڑھا دیے۔

"سگریٹ کیا ہو گی؟" جمنا نے تعجب سے پوچھا۔

"تمہارے لیے ہیں،" شنکل دیپ بابو نے دھیرے سے کہا اور دوسری طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔ لیکن ان کا چہرہ شرم سے کچھ ... تھا۔

تم نے ... ساڑی کو ... کھینچتے ہوئے کہا، "کبھی سگریٹ پی بھی ہے کہ آج ہی پیوں گی؟ اس عمر میں مذاق کرتے شرم نہیں آتی؟"

شنکل دیپ بابو کچھ بولے نہیں اور تھوڑا مسکرا کر ... تھے۔ ... کچھ ... ہو کر دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا، "... کو دے دینا۔" اور فوراً وہاں سے چلتے بنے۔

Scanned with CamScanner

جمنا بھونچکی ہو کر کچھ دیر اس کو دیکھتی رہی، کیوں کہ آج سے پہلے تو وہ یہی دیکھتی آ رہی تھی کہ نارائن کی سگریٹ نوشی کے وہ سخت خلاف رہتے ہیں اور اس معاملے پر اسے کئی بار ڈانٹ پھٹکار بھی چکے ہیں۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہ یہ سمجھ کر مسکرا دی کہ عقل ماری گئی ہے۔

نارائن دن بھر پڑھنے لکھنے کے بعد ٹہلنے گیا ہوا تھا۔

شکل دیپ بابو جلدی سے کپڑے بدل کر، ہاتھ میں جھاڑو لے، باہر کے کمرے میں جا پہنچے۔ انھوں نے جلدی جلدی اچھی طرح کمرے کو جھاڑا بہارا۔ اس کے بعد نارائن کی میز کو صاف کیا اور میز پوش کو زور زور سے کئی بار جھاڑ کر صفائی کے ساتھ اس پر بچھا دیا۔ آخر میں نارائن کی چارپائی پر پڑے بستر کو کھول کر اس کی ایک ایک چیز کو ٹھیک سے تہہ کر کے رکھنے لگے۔

اتنے میں جمنا نے آ کر دیکھا تو دھیمے سے بولی، کچہری سے آنے پر یہی کام رہ گیا ہے کیا؟ بچھونا روز بچھ ہی جاتا ہے اور کمرے کی صفائی بھی مہری کر ہی دیتی ہے۔

اچھا ٹھیک ہے۔ میں بڑی خوشی سے کر رہا ہوں۔ کوئی زبردستی تھوڑے ہی ہے۔

شکل دیپ بابو کے چہرے پر ہلکی سی جھینپ کے آثار ابھر آئے اور وہ اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے ایسی آواز میں بولے جیسے انھوں نے اچانک ہی یہ کام شروع کر دیا تھا، اور جب اتنا کر ہی لیا ہے تو بیچ میں چھوڑنے سے کیا فائدہ، پورا ہی کر لیں۔

کچہری سے واپسی پر ان کا یہ معمول تھا کہ تھوڑا بہت کچھ کھا پی کر پلنگ پر لیٹ جاتے تھے۔ اکثر ان کو نیند آ جاتی تھی اور وہ تقریباً آٹھ بجے تک سوتے رہتے تھے۔ اگر نیند نہ آئی تو بھی وہ اسی طرح چپ چاپ پڑے رہتے تھے۔

ناشتا تیار ہے،" یہ کہہ کر جمنا وہاں سے چلی گئی۔

شکل دیپ بابو کمرے کو جھاڑ بہار کر، بچھونے، میز اور کرسیوں کو ترتیب سے سجانے کے بعد آنگن میں آ کر کھڑے ہو گئے اور بلاوجہ ہنستے ہوئے بولے، ایسا کام ہمیشہ اپنے ہاتھ سے کرنا چاہیے۔ نوکروں کا کیا ٹھیک۔ لیکن ان کی بات کا نہ تو کسی نے کوئی نوٹس لیا اور نہ کسی نے کوئی جواب دیا

دھیرے دھیرے دن بیتتے گئے اور نارائن سخت محنت کرتا رہا۔

کچھ دنوں سے شکل دیپ بابو روز شام کو گھر سے کوئی ایک میل دور شیو جی کے مندر میں جانے لگے تھے۔ وہ بہت چلتا ہوا مندر تھا۔ اس میں عقیدت مندوں کی بہت بھیڑ ہوتی تھی۔ کچہری سے لوٹنے کے بعد وہ نارائن کے کمرے کو جھاڑتے بہارتے، آخر میں ناشتا کر کے مندر کے لیے روانہ ہو جاتے۔ مندر میں ایک ڈیڑھ گھنٹا رہتے اور تقریباً دس بجے گھر لوٹتے۔

ایک دن جب وہ مندر سے لوٹے تو ساڑھے دس بج گئے تھے۔ انھوں نے دبے پاؤں نارائن کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ اور اسے پڑھتے دیکھ کر دبی دبی مسکراہٹ ان کے لبوں پر پھیل گئی۔

Scanned with CamScanner

پھر وہ مدراپ کہ سے ہیں آخر جھنجی وہ ار سے گھا، تو منہ اصو، تا سے ہیں کھا سے لیے جا کر بیٹھ گئے۔

بیوی سے کہا ماں نے دھر دیا۔ شکل دیپ ہا ہوئے لوا چباتے اسے پوچھا، و کو میا سے دسے دیے تھے؟"

وہ آج ما جب کچہری سے لوٹے تھے تو بیوے پیے آئے تھے۔ انھوں نے بیوے کو بیوی کے ہو سے لرتے ہوئے کہا تا سے صرف ما ں ہی کو دیا اور ی کو نہیں۔

ممتا و صلی آ ں نہی مگر اس نے شوہر کی بات ں ی سنی کر دی، کہاں امیوہ ٹرنک میں رکھ دیا پاس کو کھ ما آ ہیں کے تو سے دوں گی۔ بڑا لڑکے تو صوت نے ہوئے ہیں، کو کو کیا، آ آ سے کسی نہ بچ ا نے ں۔ ں ں نے کہیں سے دیکھ لیا ں سے ں ا کا سا رکھا ڈال۔

ں ں شکل دیپ ہا کا سب سے چھوٹا تک تک ، و تھ دیں کا، سے حد شہر ر ڑ کا تھا۔

یوں شکل دیپ ہا چا سے۔ اں کا سہ کھل یا تا و یاں وٹی کا ایک چھوٹا سا گڑا ظ آ ا تھا

جس کچھ ہا ہوا

سے شکل ، ب ہا و سے تھے سے بیوی کا سہ ڑا ئے ہوئے کہا، کچھ کیا آ م کو کہیں سیں کی گیا؟ ھ لو ں سے ں سے سے ا ں ا ں کچھ کیا ہی کیا ہا

ممتا ہی ہا ب ں ہ یا ہو لیا؟ کسی بیل بھوں، یا ہ ممتا ں تو ں کو نصیب ہوتی سیں ہے۔ چا سے ھا ہا ئی و کچھ کی ں ں ہ سے ں پر صہ رکھتے ہیں ہے ہاتھ سے مرہ کر کسی کچھ دیا بھی تو سیں یا ہو ں تو سے ں چل لیا ہو کا ں یا۔ ھ ں سے سے ہ ہا تھی۔ اب یاں تو سیں لے ہیں ہے

ہیں تو ہ و ہ تو سے ا ہوئے ہیں ں ہ ہے کی ے پر لعنت ا وہ غصے سے تمتما تا ہوئے ہ ڑے و چھ ہوئے سے تو ا کر سے ہیں چلے ہے۔

ں ہ ں ، ٹھے ہو ا ت سے ہ ے لگی۔ ں سے ہی کھا سیں کھا یا ور چا پا ئی پر سو ڈھا پ کر پڑ رہی۔

دو سے ں ں تیج ہی شکل دیپ ہا کا صہ ٹھنڈ سیں ہوا و ں ے سا ئے ہوئے اور یوجا ر ے سے ھ سے ہ ہا کا م پ کر ں ں کا سب ں ں ہ کا تو سے پا ں طلبا ور اس سے پوچھا کہ ں سے ہ یا ہیں کی یا سب ں ں و کوئی جواب نہ سوجھا تو وہ سہ ا پنے باپ کی طرف دیکھنے لا تو شکل دیپ ہا ہوئے گئی تا پنے اسے جڑ دیے۔

ڈ ئی گنگنا ں کا ں ں ا آ ا ہیں ہوئے والا تھا و وہاں و ہ ہوئے سے دن آ گئے تھے۔ ں یک ا ں سے ہی ڑی سب کی تھی نہ کسی کو کہ صہ ں ں ہے۔ ا ں ہ ہیں گھنٹے تک پڑھتا ہتا۔ اس کی

پڑھائی میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہونے پائی۔ اسے بس پڑھنا تھا۔ اس کو کھانا وقت سے ملتا، بچھونا بچھا ملتا، دونوں وقت گاؤں کے اصلی گھی کے ساتھ دال بھات، سبزی، روٹی ملتی۔ جسم کی طاقت اور دماغ کی تازگی کو بنائے رکھنے کے لیے ناشتے میں سویرے حلوا، دودھ، اور شام کو میوے یا پھل۔ اور تو اور لڑکے کی طبیعت اچاٹ نہ ہو، اس لیے سگریٹ کا بھی اچھا بھلا انتظام۔ جب سگریٹ کے پیکٹ ختم ہوتے تو جمنا اس کے پاس اور پیکٹ رکھ جاتی۔

جس دن نارائن کو الہ آباد جانا تھا، شکل دیپ بابو کی چھٹی تھی اور وہ سویرے ہی گھومنے نکل گئے۔ وہ کچھ دیر تک کمپنی باغ میں گھومتے رہے، پھر وہاں طبیعت نہ لگی تو ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ وہاں بھی دل نہ لگا تو اپنے قریبی دوست کیلاش بہاری، مختار، کے گھر پہنچ گئے۔ وہاں بہت دیر تک گپیں لڑاتے رہے، اور جب گاڑی کا وقت قریب آیا تو جلدی جلدی گھر کی طرف چل دیے۔

گاڑی نو بجے نکلتی تھی۔ جمنا اور نارائن کی بیوی نے تڑکے اٹھ کر کھانا بنا لیا تھا۔ نارائن نے کھانا کھایا اور سب کو پرنام کر کے اسٹیشن کے لیے چل پڑا۔ شکل دیپ بابو بھی ساتھ گئے۔

نارائن کو رخصت کرنے کے لیے اس کے چار پانچ دوست بھی اسٹیشن پہنچے تھے۔ جب تک گاڑی نہیں آئی، نارائن پلیٹ فارم پر ان دوستوں سے باتیں کرتا رہا۔ شکل دیپ بابو الگ کھڑے ادھر ادھر اس طرح دیکھتے رہے جیسے نارائن سے ان کا تعارف ہی نہ ہو۔ اور جب گاڑی آئی اور نارائن اپنے دوستوں اور باپ کی مدد سے سامان کے ساتھ گاڑی پر چڑھ گیا تو شکل دیپ بابو وہاں سے دھیرے دھیرے کھسک گئے اور وہیلر کے بک اسٹال پر جا کر کھڑے ہو گئے۔

بک اسٹال کا آدمی جان پہچان کا تھا۔ اس نے سلام کر کے پوچھا، "کہیے مختار صاحب، آج کیسے آنا ہوا؟"

شکل دیپ بابو نے اطمینان سے مسکراتے ہوئے جواب دیا، "لڑکا الہ آباد جا رہا ہے ڈپٹی کلکٹری کا امتحان دینے۔ شام تک پہنچ جائے گا۔ ڈیوڑھے درجے کے پاس جو ڈبا ہے نا، اسی میں ہے۔ وہ جو چار پانچ لڑکے کھڑے ہیں وہ اس کے دوست ہیں۔ سوچا، بھئی ہم لوگ بوڑھے ٹھہرے، لڑکے امتحان وغیرہ کی بات کر رہے ہوں گے، اس لیے ادھر چلا آیا۔" ان کی آنکھیں کچھ خوشی اور ایک عجیب واہیات انداز سے سکڑ گئیں۔

وہاں وہ تھوڑی دیر تک رہے۔ اس کے بعد جا کر گھڑی میں وقت دیکھا، کچھ دیر تار گھر کے باہر تار بابو کو کھٹر پٹر کرتے دیکھتے رہے اور پھر وہاں سے ہٹ کر ریل گاڑیوں کے آنے جانے کا ٹائم ٹیبل پڑھنے لگے۔ لیکن ان کا دھیان گاڑی ہی کی طرف لگا ہوا تھا، کیوں کہ جب ٹرین چھوٹنے کی گھنٹی بجی تو وہ وہاں سے سرک کر نارائن کے دوستوں کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔

نارائن نے جب ان کو دیکھا تو اس نے جھٹ پٹ نیچے اتر کر ان کے پیر چھوئے۔

"خوش رہو بیٹا، بھگوان تمہیں کامیاب کرے!" انھوں نے لڑکے سے گدگد ہو کر کہا اور دوسری

Scanned with CamScanner

طرف دیکھنے لگے۔

[illegible] کا زی کھٹے ی ولی تھی۔ [illegible] اپنے کوٹ کی جیب میں [illegible] معلوم [illegible] لگے۔

کا زی سے [illegible] چونک پڑے۔ [illegible] جیب سے وہ [illegible] نکال کر مٹھی میں باندھ لی اور اسے نارائن کو دینے دوڑ پڑے۔

[illegible]

[illegible] عقیدت کے ساتھ کھالینا۔ بھگوان شنکر کا پرساد ہے۔

[illegible] پتا نہیں کیوں نارائن کو دینا بھول گئے تھے۔

[illegible] لڑکے نے پوچھا، بابوجی، کیا بات تھی؟ ہم سے کہہ دیتے۔

[illegible] سے آگے بڑھ لئے۔

[illegible] ہیں بدلتے جاتے ہیں!

لیکن بات نارائن نے جھوٹ نہیں کہی تھی، کیوں کہ ایک دن اس کو خبر ملی کہ پبلک سروس کمیشن الہ آباد کے سامنے اسے انٹرویو کے لیے حاضر ہونا ہے۔

یہ خبر سارے شہر میں بجلی کی طرح پھیل گئی۔ بہت برسوں بعد کوئی لڑکا اس شہر سے ڈپٹی کلکٹری کے لیے بلایا گیا تھا۔ لوگوں کے تعجب کا ٹھکانا......

شام کچہری سے واپسی پر شتل دیپ بابو سیدھے آنگن میں جا کر کھڑے ہوگئے اور زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ پھر کمرے میں جا کر کپڑے بدلنے لگے۔

شتل دیپ بابو نے کوٹ کھونٹی پر ٹانگتے ہوئے، لپک کر آتی ہوئی جمنا سے کہا، "اب کرو بات! ہمیشہ شور مچائے رہتی ہیں کہ یہ نہیں ہے، وہ نہیں ہے۔ یہ معمولی بات نہیں ہے کہ بسو انٹرویو میں بلائے گئے ہیں۔ بس آیا ہی سمجھو!"

"جب آ جائیں تبھی نا!" جمنا نے کنجوسی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

شتل دیپ بابو تھوڑا خفا ہوتے ہوئے بولے، "تم کو اب بھی شک ہے؟ تو میں کہتا ہوں کہ بسو ضرور آئیں گے، ضرور آئیں گے! نہیں تو میں اپنی مونچھ منڈوا دوں گا۔ اور کوئی کچھ نہ کہے مگر میں تو اس بات کو پہلے ہی سے جانتا ہوں۔ ارے میں کیا، سارا شہر یہی کہتا ہے! اچھیا بابو وکیل مجھے بدھائی دیتے ہوئے بولے: انٹرویو میں بلائے جانے کا مطلب ہے کہ اگر انٹرویو تھوڑا بھی اچھا ہو گیا تو انتخاب یقینی ہے۔ امیر اناک میں دم تھا۔ جو بھی سنتا، بدھائی دینے چلا آتا۔"

"محلے کے لڑکے مجھے بھی بدھائی دے گئے ہیں۔ چاچی، کمل اور گوری تو ابھی ابھی گئے ہیں،" جمنا نے خوب بڑی آنکھوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے خبر دی۔

"تو تمہاری کوئی معمولی ہستی ہے! ارے تم ڈپٹی کلکٹر کی ماں ہونا جی!" اتنا کہہ کر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

جمنا کچھ نہیں بولی، بلکہ اس نے دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ ساڑی کا پلو سر تک کھینچ لیا اور منہ ٹیڑھا کر لیا۔

شتل دیپ بابو نے جوتے اتار کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا، "ارے بھائی، ہم کو تم کو کیا لینا، ایک کونے میں پڑ کر رام رام جپا کریں گے۔ لیکن میں تو ابھی یہ سوچ رہا ہوں کچھ سان اور تیاری کروں گا۔ نہیں، یہی ٹھیک رہے گا!" انھوں نے گال پھلا کر دو ایک مرتبہ مونچھوں پر تاؤ دیا۔

جمنا نے ان کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا، "لڑکا ہمارے کا تھوڑے ہی۔ کھینچ لے جائے گا۔ ہمیشہ یہ دیکھ کر اس کا دل دکھتا ہے کہ بابوجی اتنی محنت کرتے ہیں اور وہ کچھ بھی مدد نہیں کر پاتا۔"

"کچھ کہہ رہا تھا کیا؟" شتل دیپ بابو نے دھیرے سے پوچھا اور بیوی کی طرف دیکھ کر دروازے کے باہر دیکھنے لگے۔

جمنا نے یقین کے ساتھ کہا، "میں جانتی نہیں کیا؟ اس کا چہرہ بتاتا ہے۔ باپ کو اتنا کام کرتے

دیکھ کر اس کو کوئی چپ تھوڑے ہی لگتا ہے۔ آخر ہیں یں ہے ناک سمجھ لی۔

پس ہم دونوں کا ٹرانسفر ہو گیا، اور ان کے ٹرانسفر کی کافی چرچا ہے۔ وہ گھر واپس آیا تو اس کا دل خوشی و ولولے سے بھرا ہوا تھا۔ اور جب اس نے یہ بتایا کہ صاحب اور لوگوں کا ٹرانسفر ہیڈ کوارٹر کا ہوا ہے اور ان کا پورے بہار میں ڈسٹرکٹ تک ٹرانسفر ہوتا رہا اور ان سے کسی سوال کے جواب کافی اطمینان بخش دیے، تو اب یہ کسی سے ان کو کہا ان کا بیٹا ہی ہے۔

دوسرے دن کچہری میں ہم وکیلوں اور مختاروں سے کُل دیپ بابو کو مبارک باد دی اور یہ یقین ظاہر کیا کہ ان کا ٹرانسفر ہو جائے گا۔ کُل دیپ بابو مسکرا مسکرا کر لوگوں کی مبارک باد کا شکریہ ادا کرتے اور سنتے رہے اور ان کی ڈرتی ہوئی دو ایک باتیں سنا دیتے اور آخر میں مسکرا کر سر کو تھپکی دیتے دل کا در کہہ دیتے، آپ سے دس دن پہلے بھی شک تھی، سو آپ سے شک ہے، لیکن آپ لوگوں کی دعا سے اب وہ دور ہو گیا ہے۔

جب وہ گھر لوٹے تو ان کی گوری اور کُل دروازے پر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ بار بار ٹرانسفر سے ہمیں کچھ بتا رہا تھا۔ وہ بیٹے باپ کو آتا دیکھ کر دھیرے دھیرے بولنے لگا۔ کُل دیپ بابو چپ چاپ وہاں سے ہٹ گئے، میں دوڑتی ہی ان کے ساتھ گئی تو ان کو سنائی پڑا: تمہارا ہو گیا، اب تم موج کرو!

تب سنتے ہی کُل دیپ بابو گھر کے اندر لوگوں کے پاس آ کر صاحب سے پوچھا، کیا؟ ان کی آنکھیں میں اور چہرے پر جیسے آنسو دکھائی دیے جیسے وہ کسی مشکل میں پھنس گئے ہوں۔

ایک دو دن سے بوڑھا اور اس سے صاحب اندر ہی مسکرائے۔ پھر گوری نے جو کہا تھا سو اس کی تائید کرتے ہوئے کہا، میں کہہ رہا تھا ہمارا ان کا بیٹا ہی ہے۔

کُل دیپ بابو نے سوچ سے کری ہوئی ایک موڑ کو دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے کہا، ہاں دیکھیے! صاحب نے ایک دھرم دھرا کے پہنچے ہیں وہاں سب سے تو ہیں ڈسٹرکٹ کا ٹرانسفر ہوتا ہے۔ پورے بہار ڈسٹرکٹ کا اگر ہمیں لینا ہو تو بہار ڈسٹرکٹ تک ٹرانسفر کرنے کی کیا ضرورت ہی باقی اس ڈسٹرکٹ پر جو کچھ کرنے۔۔۔

گوری نے ہمارا اس کی بات کی تائید کی، اور کُل نے کہا، پہلے کا زمانہ ہوتا تو کسی بھی نہیں جا سکتا تھا لیکن اب تو ہے ساتھ و بے سوالی آئی نہیں ہوتی ہوگی۔

کُل دیپ بابو نے آنکھیں چھپاتے ہوئے دھیمی دھیمی آواز میں پوچھا، ہے بے ایمانی تو نہیں ہوتی ہے؟

اس بات کی نہیں ہوتی۔ پہلے بات دوسری تھی وہ زمانہ بدل گیا، گوری نے جواب دیا

کُل دیپ بابو ہلکی آواز پر زور دیتے ہوئے بولے، ہمارے اب بھی بے ایمانی صاحب؟ وہی اور سپاہی، ہمارے بے ایمانی کی کرنی ہوتی ہو تو کس دن تک ان کا ٹرانسفر ہوتا؟ ٹرانسفر میں بڑا ہی نہیں ہوتا۔

اور بلاتے بھی تو پانچ دس منٹ پوچھ تاچھ کر کے رخصت کر دیتے۔

ان کا کسی نے جواب نہیں دیا تو وہ مسکراتے ہوئے اندر کمرہ میں چلے گئے۔

کمرہ میں پہنچنے پر جمنا سے بولے۔ ”بہو ابھی سے کسی افسر کی طرح لگتے ہیں۔ دروازے پر ہیرا، گوری اور کمل باتیں کر رہے تھے۔ میں نے دور ہی سے غور کیا۔ جب نارائن بابو بولتے ہیں تو ہاتھ ہلاتے ہیں تو ان کے بولنے اور ہاتھ ہلانے سے ایک۔۔۔ عجب سی ایک شان ٹپکتی ہے۔ ان کے دوستوں میں وہ بات کہاں!

آج دوپہر میں مجھ سے کہہ رہے تھے کہ تجھے موٹر میں گھماؤں گا۔“ جمنا نے خوش خبری سنائی۔

شکل دیپ بابو خوش ہو کر ناک سڑکتے ہوئے بولے، ”ارے تو اس کو موٹر کی کمی ہوگی؟ گھومنا نا، جتنا چاہنا۔“ وہ اچانک چپ ہو گئے اور کھوئے کھوئے اس طرح مسکرانے لگے جیسے کوئی لذیذ چیز کھانے کے بعد اس کے مزے سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔

کچھ دیر بعد انھوں نے بیوی سے سوال کیا، ”کیا کہہ رہا تھا؟ موٹر میں گھماؤں گا؟“

جمنا نے پھر وہی بات دہرا دی۔

شکل دیپ بابو نے دھیرے سے دونوں ہاتھوں سے تالی بجاتے ہوئے مسکرا کر کہا، ”چلو اچھا ہے۔“ ان کے چہرے پر گہرے اطمینان کے آثار نمایاں تھے۔

سات آٹھ دن بعد نتیجہ نکلنے کا اندازہ تھا۔ سبھی کو یقین ہو گیا تھا کہ نارائن لے لیا جائے گا، اور سبھی بے چینی سے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔

اب شکل دیپ بابو اور بھی مصروف ہو گئے۔ پوجا پاٹھ کا ان کا معمول یوں ہی جاری رہا پہلے کی طرح۔ لوگوں سے بات چیت کرنے میں ان کو مزہ آنے لگا، اور وہ بات چیت کے دوران ایسے حالات پیدا کر دیتے کہ لوگوں کو کہنا پڑتا کہ نارائن ضرور لے لیا جائے گا۔ وہ اپنے گھر پر جمع نارائن اور ان کے دوستوں کی باتیں چپ چاپ کرسی پر سنتے اور کبھی کبھی اچانک ان کے جھنڈ میں گھس کر زبردستی بات کرنے لگتے۔ کسی نارائن کو یہ بات بری بھی لگتی اور وہ غصے میں دوسری طرف دیکھنے لگتا۔ رات میں شکل دیپ بابو چونک کر اٹھ بیٹھتے اور باہر آ کر کمرے میں سوتے ہوئے نارائن کو دیکھنے لگتے یا کبھی آنگن میں آ کر آسمان کو تاکا کرتے۔

ایک دن انھوں نے سویرے ہی سب کو سنانے والے انداز میں زور سے کہا، ”نارائن کی ماں، میں نے آج سپنا دیکھا ہے کہ نارائن بابو ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔“

جمنا رسوئی کے برآمدے میں بیٹھی چاول چُن رہی تھی اور اسی کے پاس نارائن کی بیوی نرملا گھونگھٹ کاڑھے دال بین رہی تھی۔

جمنا نے سر اٹھا کر اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا، ”سپنا سویرے دکھائی پڑا تھا کیا؟“

Scanned with CamScanner

سویرے کے نہیں تو کیا شام کے سپنے کے بارے میں تم سے کہنے آؤں گا؟ رستے ایک دم برہم صورت میں دیکھی تھی! دیکھتا ہوں کہ اخبار میں نتیجہ نکل گیا ہے اور اس میں ہمارے بابو کا بھی نام ہے۔ اب یہ یاد نہیں کہ کون نمبر تھا، پر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ نام کافی اوپر تھا۔

ہاں جی، سویرے کا سپنا تو بالکل سچا ہوتا ہے نا؟ بابو کی بیوی رملا نے دھیرے سے جھما سے پوچھا۔

معلوم ہوتا ہے رملا کی بات، شکل دیپ بابو نے سن لی۔ کیوں کہ انھوں نے ہنس کر کہا، کون بول رہا ہے؟ ڈپٹیائن جی ہیں کیا؟ کمرے میں وہ قصداً زور سے بولے

ہاں، کہہ رہی ہیں کہ سویرے کا سپنا سچا ہوتا ہے! سچ تو ہوتا ہی ہے! جھما نے مسکرا کر کہی۔

رملا شرم سے سمٹ گئی۔ اس نے اپنے بدن کو سکوڑ لیا اور سینے کو نیچے جھکا کر سر اپنے دونوں گھٹنوں کے بیچ چھپا لیا۔

اگلے دن بھی صبح شکل دیپ بابو نے گھر والوں کو خبر دی کہ انھوں نے ہو بہو وہی خواب دیکھا ہے۔

جھما نے کہا، سویرے کا خواب تو ہمیشہ ہی سچا ہوتا ہے۔ جب ہمارا لڑکا ہونے والا تھا، میں نے سویرے سویرے سپنا دیکھا کہ کوئی گنگا کی دیوی، ہاتھ میں لڑکا لیے آسمان سے ہمارے آنگن میں اتر رہی ہے۔ بس میں نے سمجھ لیا کہ لڑکا ہی ہے۔ اور لڑکا ہی ہوا۔

شکل دیپ بابو نے جوش میں آ کر کہا، اور ہاں اگر جھوٹ ہے تو یہ خواب ایک ہی دن دکھائی پڑتا، دوسرے دن بھی ہو بہو ویسا ہی سپنا کیوں دکھائی دیتا، اور وہ بھی ٹھیک صورت میں؟

بھولے نے بھی آج ویسا ہی سہانا سویرے دیکھا ہے!

ڈپٹیائن نے بھی؟ شکل دیپ بابو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہاں، ڈپٹیائن نے ہاں! ٹھیک سویرے، انھوں نے دیکھا کہ ایک بجے ہیں، ہم لوگ دوڑ رہے ہیں اور ہمارے دروازے پر موٹر کھڑی ہے،" جھما نے جواب دیا۔

شکل دیپ بابو کچھ دیر مسکراتے رہے، پھر بولے، اچھی بات ہے!

ایک دن رات کو تقریباً ایک بجے شکل دیپ بابو نے اٹھ کر بیوی کو جگایا اور اس کو ٹک لے جاتے ہوئے شرمسار ہنسی کی ہنسی ہنستے ہوئے پوچھا، کہو جی، کچھ کی سے کرو گا؟ بہت دیر سے نیند نہیں آتی ہے جیسے پیٹ کچھ بگڑ رہا ہے۔ پہلے میں نے سوچا جانے بھی دو۔ کوئی کمانے کا وقت ہے، پر اس کام کے بغیر نیند ہی نہیں دیکھی تو نہیں جگایا۔ شام کو کچھ یاد تھا، سب ختم ہو گیا۔

جھما حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے شوہر کو دیکھتی رہی۔ شادی شدہ زندگی کے اتنے برس بیت گئے ہیں، مگر تب تک کہ شادی کے شروع کے دنوں میں بھی انھوں نے رات کو یوں جگا کر کچھ کہا ہو ایسا نہیں تھا۔ وہ جھلا پڑی اور بولی، ایسا پیٹ تو کبھی نہیں تھا۔ نہ معلوم اس وقت رسوئی میں

Scanned with CamScanner

"کچھ بھی تو نہیں۔"

شکل دیپ بابو جھینپ کر مسکرانے لگے۔

ایک دو لمحے بعد جمنا نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے پوچھا، "صبح کے میوے میں سے تھوڑا سا دوں کیا؟"

شکل دیپ بابو محبت سے بولے، "ارے رام رام! میوہ تو تم جانتی ہو مجھے بالکل پسند نہیں۔ جاؤ تم سوؤ۔ بھوک وھوک تھوڑے ہی ہے، مذاق کیا تھا۔"

یہ کہہ کر وہ دھیرے سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ لیکن وہ بیٹھے ہی تھے کہ جمنا کمرے میں ایک طشتری میں ایک روٹی اور گڑ لے کر آ گئی۔ شکل دیپ بابو ہنستے ہوئے اٹھ بیٹھے۔

شکل دیپ بابو پوجا پاٹھ کرتے، کچہری جاتے، دنیا بھر کے لوگوں سے دنیا بھر کی باتیں کرتے، اور جب خالی رہتے تو کچھ نہ کچھ کھانے کو مانگ بیٹھتے۔ وہ چٹورے ہو گئے اور ان کو جب دیکھو تب بھوک لگ جاتی۔ اس طرح کبھی روٹی گڑ کھا لیتے، کبھی آلو بھون کر کھا لیتے اور کبھی ہاتھ پر چینی ہی لے کر پھانک جاتے۔ کھانے میں بھی تبدیلی چاہنے لگے۔ کبھی کھچڑی کی فرمائش کر دیتے، کبھی ستو پیا کرتے، کبھی صرف روٹی دال کی، اور کبھی صرف دال چاول کی۔ ان کا وقت کٹتا ہی نہ تھا، اور وہ وقت کاٹنا چاہتے تھے۔

اس بے ترتیبی اور ذہنی تناؤ کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیمار پڑ گئے۔ انھیں بخار رہنے لگا، دست بھی آنے لگے۔

ان کی بیماری سے گھر کے لوگوں کو بڑی فکر لاحق ہوئی۔ جمنا نے رو رو کر آنسوؤں میں کہا، "بار بار کہتی تھی، کچھ مت کھائیے۔ پر سنتا ہی کون ہے! اب بھگتنا پڑا نا؟"

پر شکل دیپ بابو پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ انھوں نے بات مذاق میں اڑا دی۔ "ارے میں تو کچھ ہی جانے والا تھا، پر یہ سوچ کر رک گیا کہ اب مختاری تو چھوڑنی ہی ہے، تھوڑا آرام کر لیا جائے۔"

"مختاری جب چھوڑنی ہو گی، ہو گی۔ اس وقت تو دو وقت کی دال روٹی کا انتظام کرنا ہے،" جمنا نے فکرمند ہوتے ہوئے کہا۔

"ارے تم کیسی باتیں کرتی ہو! بیماری دکھ تو سب کو لگی رہتی ہے۔ میں مٹی کا ڈھیلا تو ہوں نہیں کہ گل جاؤں گا۔ بس ایک آدھ دن کی بات ہے۔ اگر بیماری سخت ہوتی تو میں اس قدر خوش ہوتا؟" شکل دیپ بابو نے سمجھایا، اور آخر میں ان کے ہونٹوں پر ایک کمزور مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ دن بھر بے چین رہے۔ کبھی لیٹتے کبھی بیٹھتے اور کبھی باہر نکل کر ٹہلنے لگتے۔ لیکن کمزور اس قدر ہو گئے تھے کہ پانچ دس قدم ہی چل کر تھک جاتے اور دن بھر کمرے میں آ کر لیٹے رہتے۔

کرتے کرتے شام ہوئی اور جب شکل دیپ بابو کو یہ بتایا گیا کہ کیلاش بہاری مختار ان کی خیریت پوچھنے کے لیے آئے ہیں تو وہ اٹھ بیٹھے اور جھٹ پٹ چادر اوڑھ، ہاتھ میں چھڑی لے، بیوی کے لاکھ منع کرنے پر بھی باہر نکل گئے۔ دست تو بند ہو گئے تھے، پر بخار ابھی تھا اور اس عرصے میں یہ بھی ہوا کہ وہ انتہائی چڑچڑے ہو گئے تھے۔

Scanned with CamScanner

کیلاش بہاری نے انہیں دیکھتے ہی فکرمندی سے کہا، "ارے تم کہاں باہر آ گئے؟ مجھے اندر بلوا لیا ہوتا۔"

شیل دیپ بابو چارپائی پر بیٹھ گئے اور کچھ ہنسی ہنستے ہوئے بولے، "ارے مجھے کچھ ہوا تھوڑے ہی ہے۔ سوچا آرام کرنے کی عادت ہی ڈالوں۔" یہ کہہ کر وہ بہت معنی خیز نظر سے اپنے دوست کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائے۔

سب حال چال پوچھنے کے بعد کیلاش بہاری نے سوال کیا، "مدن بابو کہیں دکھائی نہیں دے رہے ہیں، کہیں گھومنے گئے ہیں کیا؟"

شیل دیپ بابو نے سادگی کے انداز میں کہا، "ہاں، گئے ہوں گے کہیں۔ لڑکے ان کو چھوڑتے ہی تو نہیں ہیں۔ گھر سے جاتے ہیں کہیں نہ کہیں۔"

کیلاش بہاری نے تعریف کرتے ہوئے کہا، "خوب ہوا صاحب! میں بھی جب اس لڑکے کو دیکھتا تھا، سوچتا تھا کہ یہ لڑکا آگے چل کر کچھ نہ کچھ ضرور بنے گا۔ وہ تو صاحب، دیکھنے ہی سے پتہ چل جاتا ہے۔ چال ڈھال اور بولنے چالنے کے طریقے میں کچھ ایسا ہے ہی کہ [illegible] بیٹھیے، کہہ سب ہی معنی میں بہت خوش قسمت ہیں۔"

شیل دیپ بابو ادھر ادھر دیکھنے کے بعد سر کو آگے بڑھا کر صلاح مشورے کی آواز میں بولے، "ارے بھائی صاحب، کہاں تک بتاؤں! اپنے منہ سے کیا کہوں، پر ایسا سیدھا سادھا لڑکا تو میں نے دیکھا نہیں۔ پڑھنے لکھنے کا اتنا شوق کہ رات میں گھنٹے لکھتا پڑھتا رہتا ہے۔ منہ کھول کر کسی سے کوئی بھی چیز مانگتا نہیں۔"

کیلاش بہاری نے بھی اپنے لڑکے کی تعریف میں کچھ باتیں پیش کر دیں۔ "لڑکے تو میرے بھی سیدھے ہیں، پر منجھلا لڑکا وشو، تو صحت کے سے اتنا اچھا نہیں۔ ٹھیک مدن بابو ہی کی طرح ہے۔"

"مدن تو ان پیٹ کا کوئی روگی سی دکھائی پڑتا ہے،" شیل دیپ بابو نے گمبھیرتا سے کہا۔ "بس ان کی پیٹ کی عادت ہے۔ میں ان کی ماں کو میوہ دے دیتا ہوں، اور مدن رات کو اپنی ماں کو جگا کر کھاتا ہے۔ اصلی روگی یہی ان کی یہی ایک عادت ہے۔ ارے بھئی، تم سے بتاتا ہوں، بچپن میں ہم نے اس کا نام بہاری لال رکھا تھا۔ پر ایک دن ایک مہاتما گھومتے ہوئے ہمارے گھر آئے۔ انہوں نے مدن کا ہاتھ دیکھ کر بولے: اس کا نام بہاری لال رکھنے کی ضرورت نہیں، بس آج سے اسے تارا ان کہا کرو، اس نے ان میں ایک ہوتی ہے۔ پچھلے زمانے کی بات دوسری تھی، لیکن آج کل راجا کا مطلب کیا ہے؟ ڈپٹی کلکٹر تو ایک معنی میں اب ہی ہوا آخر ہیں۔" آنکھیں مٹکا کر ہونٹوں سے مسکرانے کی کوشش کی، مگر ہانپنے لگے۔

دونوں دوست بہت دیر تک بات چیت کرتے رہے اور زیادہ تر وقت دونوں اپنے اپنے لڑکوں کا گن گان گانے میں لگے رہے۔

Scanned with CamScanner

شکل دیپ بابو کی بڑھتی ہوئی بیماری سب کے لیے فکر مندی کا باعث بنی رہی جسے وہ ہنسی ہنسی میں ٹال جاتے۔ "ارے کسی معمولی وید کی سستی دوا کھا کر ٹھیک ہو جائیں گے!" دو ایک دن بعد وہ کچھ ٹھیک بھی ہو جاتے، لیکن جسم لاغر ہوتا چلا گیا۔

جس دن ڈپٹی کلکٹری کا نتیجہ نکلا، اتوار کا دن تھا۔ شکل دیپ بابو صبح رامائن کا پاٹھ کرنے اور ناشتہ کرنے کے بعد مندر چلے گئے۔ چھٹی کے دن وہ مندر جلدی چلے جاتے اور وہاں دو تین گھنٹے بتانا ان کا معمول بن گیا تھا، اور کبھی کبھی تو چار پانچ گھنٹے بھی ہو جاتے۔

وہ آٹھ بجے مندر پہنچ گئے۔ جس گاڑی سے نتیجہ آنے والا تھا، وہ دس بجے آتی تھی۔

شکل دیپ بابو پہلے تو مندر کی سیڑھی پر بہت دیر سستاتے رہے۔ وہاں سے اٹھ کر اوپر آئے تو نندلال پانڈے سے، جو چندن ماتھے پر رگڑ رہا تھا، نارائن کے رزلٹ کے بارے میں پوچھ تاچھ کی۔ شکل دیپ بابو وہاں کھڑے ہو کر غیر معمولی تفصیل کے ساتھ سب کچھ بتانے لگے۔ وہاں سے جب ان کو چھٹی ملی تو دھوپ کافی بڑھ چکی تھی۔ انھوں نے مندر کے اندر جا کر بھگوان شو کے سامنے ماتھا ٹیک دیا۔ کافی دیر تک وہ اسی طرح پڑے رہے، پھر اٹھ کر چاروں طرف گھوم کر، انھوں نے مندر کے گھنٹے بجاتے ہوئے منتر پڑھا اور شنکھ بجایا۔ آخر میں بھگوان کے سامنے دوبارہ جھک کر نکلے ہی تھے کہ جنگ بہادر سنگھ ماسٹر مندر میں داخل ہوئے اور شکل دیپ بابو کو مندر میں دیکھ کر انھیں تعجب ہوا۔ "ارے مختار صاحب، گھر نہیں گئے۔ ڈپٹی کلکٹری کا نتیجہ تو نکل آیا۔"

شکل دیپ بابو کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ انھوں نے اپنے سوکھے ہونٹوں کو زبان سے تر کیا۔ ان کے ہونٹ کانپنے لگے اور انھوں نے بڑی مشکل سے مسکرا کر پوچھا، "اچھا، کب آیا؟"

جنگ بہادر نے بتایا، "ارے دس بجے کی گاڑی سے آیا۔ نارائن بابو کا نام تو ضرور ہے لیکن ـــــ" وہ کچھ آگے نہ بول سکے۔

شکل دیپ بابو کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے انھوں نے پوچھا، "کیا کوئی خاص بات ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔ ان کا نام تو ہے ہی۔ یہ ہے کہ ذرا نیچے ہے۔ دس لڑکے لیے جائیں گے، لیکن میرا خیال ہے کہ ان کا نام سولہواں سترھواں پڑے گا۔ لیکن کوئی فکر کی بات نہیں۔ کچھ لڑکے تو کلکٹری میں چلے جاتے ہیں، کچھ میڈیکل ہی میں نہیں آتے، اور اس طرح پوری امید ہے کہ نارائن بابو لے لیے جائیں گے۔"

شکل دیپ بابو کا چہرہ فق ہو گیا۔ ان کے پیروں میں زور نہیں تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ گر جائیں گے۔ جنگ بہادر سنگھ تو مندر سے چلے گئے، لیکن وہ کچھ دیر سر جھکائے یوں کھڑے رہے جیسے کوئی بھولی بات یاد کر رہے ہوں۔ پھر وہ چونک پڑے اور اچانک انھوں نے تیزی سے چلنا شروع کر دیا۔ ان کے منھ

Scanned with CamScanner

سے دیکھی تو وہ بھی جلدی جلدی شنو! شنو! نکل رہا تھا۔ تھوڑی دور آگے بڑھنے پر انھوں نے چال اور تیز کر دی، پر جلدی ہی وہ تھک گئے اور ایک نیم کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہو کر ہانپنے لگے۔

چار پانچ منٹ سستانے کے بعد انھوں نے پھر چلنا شروع کیا۔ وہ چھڑی کو ٹھکاتے گڑاتے، سینے پر سر لٹکائے، شنو شنو کا وظیفہ پڑھتے، ہوا کے ہلکے جھونکے سے، دھیرے دھیرے، ٹیڑھے ترچھے، اڑتے ہوئے سوکھے پتے کی طرح ڈگمگ ڈگمگ چلے جا رہے تھے۔ کچھ لوگوں نے ان کو سلام کیا تو انھوں نے دیکھا نہیں، اور کچھ لوگوں نے ان کو دیکھ کر مسکرا کر آپس میں سرگوشیاں شروع کر دیں تب بھی انھوں نے کچھ نہیں دیکھا۔ لوگوں نے حیرانی سے، افسوس سے اور ہمدردی سے دیکھا، پر انھوں نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ ان کو بس ایک ہی دھن تھی کہ وہ کسی طرح گھر پہنچ جائیں۔

گھر پہنچ کر وہ اپنی چارپائی پر دھم سے بیٹھ گئے۔ ان کے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا: نارائن کی ماں!

سارے گھر میں مردنی چھائی ہوئی تھی۔ چھوٹے سے آنگن میں گندہ پانی، مٹی، باہر سے آئے ہوئے سوکھے پتے اور سڑے گلے کاغذ پڑے تھے، اور نالیوں سے بدبو آ رہی تھی۔ آنگن میں پڑے برتن پر پرسوں سے میلے کپڑے پڑے تھے اور رسوئی سے اس وقت بھی دھواں اٹھ کر سارے گھر کی سانس کو گھونٹ رہا تھا۔ کہیں کوئی کھٹر پٹر نہیں ہو رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ گھر میں کوئی ہے ہی نہیں۔

جلدی ہی جمنا معلوم نہیں کدھر سے نکل کر کمرے میں آئی اور شوہر کو دیکھ کر گھبرا کر اس نے پوچھا، طبیعت تو ٹھیک ہے؟

شکل دیپ بابو نے مسکرا کر کہا، مجھے کیا ہوا جی؟ پہلے یہ بتاؤ نارائن بابو کہاں ہیں؟

جمنا نے باہر کے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا، اسی میں پڑے ہیں۔ نہ کچھ بولتے ہیں نہ ہنستے ہیں۔ میں پاس گئی تو کچھ نہ بولے، پڑے رہے۔ میں تو ڈر گئی ہوں۔

شکل دیپ بابو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ارے کچھ نہیں! سب اچھا ہوگا۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ پہلے یہ بتاؤ، ہوا کہ تم نے کسی سے تو نہیں بتایا تھا کہ ان کی فیس اور کھانے پینے کے لیے چھ سو روپے میں نے ادھار لیے تھے۔ میں نے تم کو منع کر دیا تھا کہ ایسی کسی صورت میں بھی نہ کرنا۔

جمنا نے کہا، میں اتنی بے وقوف تھوڑے ہی ہوں۔ لڑکے نے دو ایک بار کرید کرید کر پوچھا بھی تھا کہ اتنے روپے آتے کہاں سے ہیں۔ ایک بار تو یہاں تک کہا تھا کہ یہ پھل میوہ دودھ بند کر دو، بابو جی قرضوں میں تباہ ہوئے جا رہے ہیں۔ پر میں نے کہہ دیا کہ تمھیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں، تم بے فکر ہو کر محنت کرو۔ بابو جی کو ادھر ادھر سے مل رہے ہیں۔

شکل دیپ بابو بچے کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولے، بہت اچھا! کوئی فکر کی بات نہیں۔ بھگوان سب ٹھیک کریں گے۔ بچوا گھر ہی میں ہیں نا؟

جمنا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شکل دیپ بابو سسکتے ہوئے اٹھے۔ ان کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا، آنکھیں دھنس گئی تھیں اور منہ پر مونچھیں جھاڑو کی طرح پھڑک رہی تھیں۔ جمنا سے یہ کہہ کر کہ "تم اپنا کام دیکھو، میں ابھی آیا!"، دبے قدموں سے باہر کے کمرے کی طرف بڑھے۔ ان کے پیر کانپ رہے تھے، سارا جسم کانپ رہا تھا، اور سانس گلے میں اٹکی جا رہی تھی۔

انھوں نے پیچھے برآمدے کی کھڑکی سے کمرے کے اندر جھانکا۔ باہر والا دروازہ اور کھڑکیاں بند تھیں، جس کی وجہ سے کمرے میں اندھیرا تھا۔ پہلے تو کچھ نہ دکھائی دیا، ان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لیکن انھوں نے تھوڑا اور آگے بڑھ کر غور سے دیکھا تو پلنگ پر کوئی شخص سینے پر ہاتھ باندھے چت پڑا تھا۔ وہ ہرامن ہی تھا۔

وہ دھیرے دھیرے چوروں کی طرح دبے پاؤں کمرے کے اندر داخل ہوئے۔ ان کے چہرے پر ایک غیر معمولی اور بے یقینی سے بھری مسکراہٹ تیر رہی تھی۔ وہ میز کے پاس پہنچ کر چپ چاپ کھڑے ہو گئے اور دھیرے سے ہی میز پر ایک کتاب الٹنے پلٹنے لگے۔ کوئی ڈیڑھ دو منٹ وہ وہیں اسی طرح کھڑے رہے۔ اس کے بعد بڑی پھرتی سے گھوم کر نیچے بیٹھ گئے اور کھسک کر چارپائی کے پاس چلے گئے اور چارپائی کے نیچے جھانک جھانک کر دیکھنے لگے جیسے کوئی چیز کھوج رہے ہوں۔ اس کے بعد پائینتی رکھی ہوئی ہرامن کی چپل کو اٹھا لیا اور ایک دو پل اس کو بھی الٹنے پلٹنے کے بعد دھیرے سے وہیں رکھ دیا۔ آخر وہ سانس روک کر اس طرح اٹھے گئے جیسے وہ کوئی چیز ڈھونڈنے آئے تھے اور اس میں کامیاب ہو کر چپ چاپ واپس لوٹ رہے ہوں۔ کھڑے ہوتے وقت وہ اپنا سر ہرامن کے منہ کے پاس لے گئے اور انھوں نے ہرامن کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ چپ چاپ پڑا ہوا تھا، لیکن کسی طرح کی کوئی آہٹ، کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شکل دیپ بابو ڈر گئے اور انھوں نے سہمے اور دھڑکتے دل سے اپنا کان ہرامن کے منہ کے بالکل نزدیک کر دیا، اور اس وقت ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا جب انھوں نے لڑکے کی سانس کو باقاعدگی سے چلتے پایا۔

وہ چپ چاپ جس طرح آئے تھے اسی طرح باہر نکل گئے۔ پتہ نہیں کب سے جمنا فکرمند، دروازے سے لگی کھڑی اندر جھانک رہی تھی۔

اس نے شوہر کا منہ دیکھا اور گھبرا کر پوچھا، "کیا بات ہے، آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔"

شکل دیپ بابو نے اشارے سے اسے بولنے سے منع کیا اور پھر اشارے ہی سے اس کو بلاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

جمنا نے کمرے میں پہنچ کر شوہر کو بے چینی اور فکرمندی کی نظر سے دیکھا۔

شکل دیپ بابو نے نہایت خوشی بھرے لہجے میں کہا، "بیٹو سو رہے ہیں!"

وہ آگے کچھ نہ بول سکے۔ ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگے۔

**

Scanned with CamScanner

# رام کمار

ہندی سے ترجمہ: ازہا علوی

## چیری کے پیڑ

یہ بنگلہ پار کرنے کی جس طرف سب سے پہلے ہمارا دھیان گیا وہ تھے گچھوں سے لدے پھندے پیڑوں پر لٹکتے کسی پھل کے گچھے۔ مکان کے اندر گھومنے کے بجائے ہم اس طرف دوڑے۔ کئی پیڑ تھے جن پر وہ لٹک رہے تھے۔ میں اچک اچک کر توڑنے پر بھی کسی کے ہاتھ میں ایک دو نہیں آیا۔ میں سب سے لمبی تھی میرا ہاتھ بھی نہیں چھوتے چھوتے رہ جاتے۔ ہمارا شور سن کر بڑی بہن اندر سے آئیں۔

"یہ توڑ دیجیے بار، نہ جانے کون سا پھل ہے! شاید آلوچے، آلوبخارے، خوبانی۔۔۔" ہم سب چلانے لگے۔

بڑی دیدی کسی تھاں سے ہماری طرف آنے لگیں۔ ہمیں غصہ آیا کہ وہ پہلے سوچنے پر بھاگ کے کیوں نہیں آئیں۔ میں ذرا ناراضگی سے جلدی آنے کے لیے کہا تو وہ کہیں واپس نہ چلی جائیں۔

"کیا ہیں یہ؟" انھوں نے اوپر پیڑ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"شاید آلوچے ہیں۔ توڑ دیجیے، جلدی۔"

"کوئی جنگلی پھل ہے شاید،" وہ بولیں۔

"نہیں، نہیں، جنگلی نہیں ہے۔ ہم کھائیں گے۔ ایک توڑ کر دے دیجیے۔۔۔"

ہماری طرف دھیان دیے بغیر وہ اوپر لٹکتے ہوئے گچھوں کو دیکھ رہی تھیں۔ پھر ایک دانہ توڑا اور اسے غور سے دیکھتی رہیں۔ "پتا نہیں کیا ہے۔ یہ پھل کبھی کسی پہاڑ پر تو دیکھا نہیں۔"

ہم سب نے آپس میں ایک دانہ بانٹ کر کھانے سوچے تھے اور اب اس ایک دانے کو لینے کے لیے چھینا جھپٹی کرنے لگے تھے۔

Scanned with CamScanner

"نہیں۔ یہ کھانا نہیں۔ کون جانے اس میں زہر ہو! پہلے مالی سے پوچھیں گے۔" پھر میری طرف دیکھ کر بولیں، "سنو! کوئی نہیں توڑے گا انہیں۔" یہ کہہ کر دھیمی چال سے وہ پھر مکان کے اندر چلی گئیں۔

ان کے حکم کی کوئی خلاف ورزی نہیں کر سکتا، یہ سوچ کر ہم سب دل مسوس کر رہ گئے۔ لیکن اس شام سارے باغ میں گھوم گھوم کر ہم نے پیڑوں کو گنا۔ دوسرے پیڑ بھی تھے لیکن ان کی اہمیت نہیں کے برابر تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی پہاڑ پر، اپنے ہی باغ میں کئی پھل کے اتنے پیڑ ساتھ ہوں۔ کبھی ایک آدھ آلوچے، خوبانی یا سیب کا پیڑ مل جاتا تھا یا پھر قریب ہی کسی دوسرے مکان میں ان پیڑوں کو دیکھ کر چپکے سے کچھ توڑ لیتے۔ لیکن اس بار اپنے ہی باغ میں اتنے پیڑ! ہماری خوشی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔

اندر بہن نے وہ دانہ پتا کے سامنے رکھ کر کہا، "پتا نہیں کون سا پھل ہے! باغ میں لگا ہے۔"

پتا اسے دیکھتے ہی بولے، "یہ چیری ہے۔ ابھی پکی نہیں ہے۔" چیری کا نام سنتے ہی ہماری خوشی اور بڑھ گئی۔ ہم نے آج تک چیری کا پیڑ نہیں دیکھا تھا، اور اب اپنے ہی باغ میں پندرہ بیس چیری کے پیڑ ہیں جنہیں توڑنے سے کوئی نہیں روکے گا، جن پر ہمارا پورا حق ہوگا۔

ہم اس ایک خوشی میں اس قدر ڈوب گئے تھے کہ اس سال کمروں پر جھگڑا نہیں ہوا۔ ہر سال پہلے دن جب یہ مسئلہ پیش آتا کہ کون سا کمرہ کس کا ہوگا، تو ہم آپس میں جھگڑتے تھے، ہاتھا پائی بھی ہوتی تھی اور غصے میں پتا ایک آدھ کو پیٹ بھی دیتے تھے۔ لیکن اس بار جس نے جہاں جس کا سامان رکھ دیا اس کی مخالفت کسی نے نہیں کی۔

رات کو بہن ہمارے کمرے میں آئیں۔ میں ایک کتاب کی تصویریں دیکھ رہا تھا۔

"سویا نہیں؟"

"نیند نہیں آ رہی۔" میں بولا۔ چھوٹے بھائی بہن سو گئے تھے۔

"مجھے بھی نئے گھر میں پہلی رات نیند نہیں آتی۔"

وہ کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئیں۔ کھڑکی بند تھی لیکن ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا جس میں سے وہ باہر جھانکنے لگیں۔ دو مہینے پہلے جب سے ان کی سگائی ہوئی تھی، وہ تب سے بہت چپ چپ رہنے لگی تھیں۔ اگلے جاڑوں میں ان کا بیاہ ہو جائے گا۔ ان سے چھٹکارا پانے کے تصور سے ہم لوگوں کا جوش بڑھ جاتا، لیکن بیاہ کے بعد وہ اس گھر میں نہیں رہیں گی، یہ سوچ کر دکھ بھی ہوتا۔

"یہ دیکھو،" انھوں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کیا ہے؟"

"ادھر آؤ---" وہ کھڑکی سے اپنا چہرہ ہٹاتے ہوئے بولیں۔

میں ان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ کھڑکی کے دوسرے شیشے سے باہر دیکھا، لیکن اندھیرے میں سامنے والے پہاڑ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔

Scanned with CamScanner

ممّوں نے دھیرے سے کھڑکی کی چٹخنی کھولی اور سر باہر نکال دیا۔

"کیا ہے؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"وہ دیکھو، کتنے تارے چمکتے ہیں۔"

مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ میں سمجھا تھا کہ ممّوں نے کوئی انوکھی چیز دیکھ لی ہوگی۔ "تارے تو سب جگہ دکھائی دیتے ہیں،" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"تارے اتنے پاس سے کہیں نہیں دکھائی دیتے۔ لگتا ہے جیسے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہی ہم انہیں چھو لیں گے۔"

میں نے بھی آسمان کی طرف دیکھا۔ مجھے بھی لگا کہ جیسے تارے بہت نیچے اتر آئے ہیں۔

"پہاڑوں پر تارے نزدیک دکھائی دیتے ہیں۔ ہم اونچائی پر آ گئے ہیں نا، اس لیے۔"

"نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ پچھلے سال وہ مسوری گئی تھیں تب اتنے پاس کبھی دکھائی نہیں دیے۔ تبھی تو کہتی ہیں۔۔۔"

مجھے ان باتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔

"تم نے نہیں پڑھا تھا کہ یہاں تارے بہت پاس دکھائی دیتے ہیں،" وہ بولیں۔

کھلی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا اندر آ رہی تھی۔ میں بھی چارپائی پر آ گیا اور لحاف سے اپنا سر ڈھانک لیا۔ وہ دیر تک کھڑکی پر کھڑی رہیں، پھر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ میں پھر تصویریں دیکھنے لگا۔

مجھے دن چڑھتے ہی سب سویرے چیری کے پیڑوں کے پاس پہنچ گئے۔ کوئی کسی پیڑ کے پاس پہنچ جاتا، دوسرا اس کو آواز دیتا: "دیکھو اوپر کی ڈالی پر چیری کتنی پکی ہوئی ہے! اس پیڑ کی چیری کتنی بڑی ہے اس کی چھوٹی۔" سب نے اپنی جیبیں چیریوں سے خوب بھر لیں۔ ایک پیڑ کی کچھ ٹہنیاں نیچے کی طرف جھکی ہوئی تھیں، لیکن بہت اچکنے کے باوجود بھی ہاتھ ان تک نہ پہنچ سکا۔ پھر چھوٹا اس کی ٹہنیوں کے بل بیٹھا اور تب اس کی پیٹھ پر کھڑے ہو کر چیری توڑنے لگا۔ صرف چار دانے ہاتھ آئے۔ ایک ایک سب کو دیا لیکن چھوٹی کے حصے میں نہیں آئی۔ وہ رونے لگی۔ میں نے اسے اپنی آدھی چیری دینے کا وعدہ کیا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ وہ ممّی جی سے شکایت کرنے کی دھمکی دیتی ہوئی روتی ہوئی گھر کی طرف بھاگی۔

کچھ دیر بعد ممّی جی ہمارے پاس آئیں۔ "کچی چیریاں کیوں توڑیں؟ انہیں کھا کر کیا پیٹ بھرنا ہے؟" پھر میری طرف دیکھ کر بولیں، "اگر کسی نے اب تک کچی چیری کھائی تو اسے سخت سزا ملے گی۔ کچا پھل توڑنے پر پاپ پڑتا ہے۔"

وہ لوٹ گئیں۔ سب بچوں کے منع کر دینے کے بعد کسی کی ہمت چیری کھانے کی نہیں ہوئی۔ اگر چھپ کر کھا لیں اور کسی کو پتا چل گیا تو کیا حال ہوگا، اس خیال ہی سے ڈر لگنے لگا۔ وہ کبھی کسی کو پیٹتی نہیں تھیں، زیادہ غصہ آنے پر ڈانٹتی بھی نہیں۔ ان کی سزا ہوتی تھی، قصوروار سے بول چال بند۔ یہ سزا

Scanned with CamScanner

ناقابلِ برداشت بن جاتی تھی، مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ سے بھی زیادہ، جس سے ہم سب گھبراتے تھے۔

کسی بھی وقت جب ہم ساتھ بیٹھتے تو یہی ایک موضوع ہوتا۔

اب تو گلابی ہونے لگی ہے۔

"اوپر کی ڈالیوں پر تو لال ہو گئی ہے۔

"اب دو ہفتوں تک تیار ہو جائے گی، پھر ہی بھرکر کھا، پتا کہتے۔

بس کہتیں، ان کا بس چلے تو ابھی ہی کھا جائیں۔ اس بار تو یہ گھر سے باہر ہی نہیں نکلتے۔ بس جیری، جیری، جیری، اور کوئی بات ہی نہیں۔

ماں کو بہن کے بیاہ کی فکر لگی ہوئی تھی۔ جب گھر کا کوئی کام نہ ہوتا تو پتا سے اسی موضوع پر وہ نہ جانے کتنی باتیں کرتیں۔ پتا ایک کاپی میں ماں کی بتائی ہوئی لسٹ لکھ کرتے۔ یہ سامان منگوانا ہوگا، اتنا زیور گھڑنا پڑے گا، کتنی ساڑیاں، برات کہاں ٹھہرے گی

اس ذکر سے بہن کا چہرہ اور بھی گمبھیر ہو جاتا۔

ہر جیری کے پیڑ کے تنے پر چاقو کی نوک سے میں نے سب کے نام کھود دیے تھے۔ پیڑ پر جس کا نام ہوگا وہی اس کی جیری توڑے گا اور کھائے گا۔ سب اپنے اپنے پیڑوں کے نیچے کھڑے ہو کر اپنی جیریوں کی تعریف کرتے اور دوسروں کے پیڑوں کی برائی۔ ہر ایک کا دعویٰ ہوتا کہ اس کے پیڑ کی جیری تیزی سے پک رہی ہے۔

ایک دن ایک شخص ہمارے باغ میں آیا اور جیری کے پیڑوں کا چکر لگانے لگا۔ ہر پیڑ کے پاس جاتا اور شاخوں کو ادھر ادھر ہٹا کر اوپری سرے تک دیکھتا۔ کبھی ایک پیڑ کی جیری توڑ کر کھاتا کبھی دوسرے پیڑ کی۔ اتنا بے دھڑک ہو کر وہ باغ میں گھوم رہا تھا جیسے یہ اس کا گھر ہو۔ ہم جھنجھلا کر اس کی طرف دیکھتے رہے۔ اس کے رویے پر ہمیں غصہ آ رہا تھا، لیکن اس سے کچھ کہنے کی ہمت ہم میں سے کسی کی نہ تھی۔ اپنا کام ختم کر کے اس کی نظر ہماری طرف گئی اور وہ مسکرانے لگا، جس سے ہمیں اس کے اوپر کے دو بڑے بڑے پیلے دانت دکھائی دینے لگے۔

"آپ لوگ اس بنگلے میں رہتے ہیں؟

"ہاں یہ ہمارا مکان ہے،" میں نے ہمت سے جواب دیا۔

پتا سے ملنے کی خواہش ظاہر کرنے پر ہم اسے پتا کے کمرے میں لے گئے۔ ہمیں اس کے چہرے سے نفرت محسوس ہو رہی تھی اور یہ جاننے کی بے چینی بھی ہو رہی تھی کہ آخر وہ ہے کون۔ اس کے واپس چلے جانے کے بعد ہم پتا کے پاس گئے۔

"ٹھیکے دار تھا جس نے جیری کے پیڑ مالک مکان سے خرید لیے ہیں۔ کل سے اس کا آدمی ان پیڑوں کی رکھوالی کرے گا،" پتا بولے۔

ہم تو سمجھ رہے تھے کہ یہ ہمارے پیڑ ہیں۔ ہمارے باغ کے اندر ہیں، کوئی دوسرا انہیں کیسے

Scanned with CamScanner

خرید سکتا ہے؟" میں بولا۔

"پتا نہیں بیٹے۔ [illegible] کرائے پر لیا ہے۔ پیڑوں پر تو مالک مکان ہی کا حق ہوتا ہے۔"

"اب ہم چیری نہیں توڑ سکتے؟"

اس رات [illegible] کسی نے بھی چیری کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا۔ کسی نے بھولے سے کچھ کہا تو سب کو چپ دیکھ کر اسے فوراً ہی غلطی کا احساس ہو گیا۔ مجھے بہت رات تک نیند نہیں آئی۔ کھڑکی سے [illegible] باغ کی طرف دیکھا۔ چیری کے چھوٹے چھوٹے پیڑ [illegible] سے نیچے تک جگنے دکھائی دے رہے تھے۔ میں [illegible] اس موضوع پر [illegible] باتیں بھی پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ اس رات ہمارے کمرے میں نہیں آئیں۔

اگلے دن صبح [illegible] کے ساتھ ایک بوڑھا [illegible]۔ وہ اپنے ساتھ رسیوں کے ڈھیر، ٹوٹے ہوئے [illegible] اور [illegible] چٹائیاں [illegible]۔ باغ کے دوسرے سرے پر چٹائیوں سے [illegible] ایک جھونپڑی تیار کی۔ جھونپڑی [illegible] دری بچھائی۔ ایک کونے میں بوڑھے نے [illegible] کر دیا۔ ہم تھوڑی دور سے سب کچھ دیکھتے رہے۔ وہ [illegible] جتنی جلدی جھونپڑی تیار ہو گئی اس سے ہم کو [illegible] تعجب ہوا۔ وہ دونوں [illegible] کی ہماری طرف دیکھ کر مسکرائے تھے، لیکن ہم نے ان کی مسکراہٹ کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چھوٹے بھائی [illegible] ہمارے [illegible] ہیں اور ہماری ہی زمین پر اپنے جھنڈے گاڑ رہے ہیں۔

کنستروں میں چھوٹے چھوٹے پتھر [illegible] اور رسیوں کی مدد سے انہیں کچھ پیڑوں پر باندھ دیا گیا۔ [illegible] رسیوں کے [illegible] جھٹکے کے ساتھ [illegible] تو کنستر میں پڑے پتھر بجتے تھے اور ایک کرخت سی آواز ہمارے [illegible] میں [illegible]۔ ہماری [illegible] جیسی [illegible] ہو رہی تھی۔

کچھ دیر [illegible] جب [illegible] بھی [illegible] چلا گیا۔ [illegible] وہ بوڑھا جو جھونپڑی کے پاس ایک پتھر پر بیٹھا [illegible] تھا [illegible] ہمارے مقابلے میں [illegible] بوڑھے نے [illegible] زیادہ دوستی کے آثار دکھائی دیے۔ [illegible] ہمارے پاس پہنچے۔ اس نے [illegible] پیار سے [illegible] لڑکوں کو پاس بٹھایا۔ ہمارے پوچھنے پر [illegible] بتایا [illegible] پیڑوں کو [illegible] کے لیے ہیں۔ بہت سے پرندے، خاص کر [illegible] چیریوں پر [illegible] ہیں [illegible] سے وہ [illegible] ہوتی ہیں۔ [illegible] انہیں بھگایا جائے تو پیڑ کے پیڑ ختم ہو سکتے ہیں۔

"لیکن کنستر سب چیری کے پیڑوں پر کیوں نہیں باندھے جاتے ہیں؟"

"[illegible] پیڑوں سے [illegible] ایک کنستر کی [illegible] کافی ہے، [illegible]۔"

"کیا تم رات کو بھی یہیں رہو گے؟"

"ہاں، رات کو بھی ڈر رہتا ہے کوئی آدمی چیری نہ توڑ لے۔"

[illegible] سے چھوٹی [illegible] کا دھیان تختے کی طرف [illegible]۔ اس سے پوچھا، "یہ کیا ہے؟

کہ میں پڑھنے۔۔۔ یہ ان کی سگریٹ ہے، چھوٹا بھائی بولا۔

دھیرے دھیرے بوڑھے کی موجودگی کے سب عادی ہو گئے۔ رسی کھینچ کر کنستروں کا بجنا یا ہاہو۔۔۔ہاہو کی آواز نکال کر یا سیٹی بجا کر پرندوں کو اڑانا، ان سب آوازوں کی عادت پڑ گئی تھی۔ جیریوں کے بوجھ سے ڈالیاں اتنی جھک گئی تھیں کہ نیچے کھڑے ہو کر ہم آسانی سے دو چار دانے توڑ سکتے تھے، لیکن بوڑھے کی نظریں ہر وقت چوکنی ہو کر چاروں طرف گھومتی رہتیں، اس لیے ہمت نہیں ہوتی تھی۔

ماں دوسرے تیسرے دن بوڑھے کو چائے کا گلاس بھجوا دیتیں۔ وہ بھی کبھی کبھی کچھ پکی ہوئی جیریاں توڑ کر ہمیں دے دیتا۔ لیکن پیڑ پر چڑھ کر توڑنے، چھپ کر کھانے کا جس کا ہم نے شروع میں تصور باندھا تھا، وہ خواہش تو دل ہی میں رہ گئی۔ جب کسی کونے پر یا درخت پر جیری کا رکھا ہوتا اور بوڑھے کو پتہ نہ چلتا تو ہمیں بہت خوشی ہوتی۔ ہمارا بس چلتا تو سارے پیڑ پرندوں کو کھلوا دیتے، لیکن پرندے چپ چاپ جیریاں ہی کھاتے تھے۔ ایک دو دانے کھا کر جب کسی دوسری ڈال پر بیٹھتے تو بوڑھے کو پتا چل جاتا اور وہ رسی کھینچ کر کنستر بجا دیتا۔

آپا دن بھر کسی پیڑ کے نیچے دری بچھا کر ہم میں سے کسی کا پل اوور بنا کرتیں۔ اس سال گرمیوں کی چھٹیوں میں انھوں نے کسی کتاب کو ہاتھ تک نہیں لگایا نہیں تو ہر بار وہ اپنے کورس کی کوئی کتاب پڑھتی رہتیں۔ کچھ دن پہلے ان کا انٹرمیڈیٹ کا نتیجہ نکلا تھا اور وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئی تھیں۔ وہ آگے پڑھنا چاہتی تھیں لیکن ماں کو ان کی شادی کی جلدی تھی۔

ہمارے گھر سے تھوڑی دور ایک چشمہ بہتا تھا جہاں ہم دوسرے تیسرے دن نہانے چلے جاتے تھے۔ کبھی بازار، کبھی سنیما، کبھی پارک، دھیرے دھیرے ہمارے روز کے پروگرام میں اب دوسری دلچسپیاں شامل ہو گئی تھیں۔ یہ شاید پہلا موقع تھا کہ آپا نے کسی چیز میں حصہ نہیں لیا۔ پہاڑوں میں وہ ہمارے بہت قریب آ جاتی تھیں۔ رات کو کھانے کے بعد چارپائیوں میں دبکے ہم ان سے کہانیاں سنا کرتے تھے، شام کو اپنے ساتھ گھمانے لے جاتی تھیں، اور پتنگ کی تو کوئی حد ہی نہیں تھی۔ اس مرتبہ وہ بہت کم گھر سے نکلیں، اور جب باہر جاتی بھی تھیں تو اکیلی ہی جاتیں۔

ایک دن صبح آنکھ کھلتے ہی باہر باغ میں کئی لوگوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں چارپائی پر لیٹا لیٹا کچھ دیر تک تعجب سے اس شور و غل کے بارے میں سوچتا رہا۔ کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھنے ہی والا تھا جب آپا کسی کام سے کمرے میں آئیں۔

"یہ شور کیسا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ لوگ آ گئے۔"

"کون لوگ؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"وہی ٹھیکیدار کے آدمی۔ جیری توڑنے کے لیے،" وہ بولیں۔

میں جھٹ سے باہر دوڑا۔ پیڑوں پر ٹوکریاں لیے ٹھیکیدار کے آدمی چڑھے ہوئے تھے۔ دونوں

Scanned with CamScanner

ہاتھوں سے اور ڈنڈے کی جھڑبیریاں توڑ توڑ کر کھاتے جا رہے تھے۔ کسی دور کی شاخ کو پکڑ کر اپنے پاس گھسیٹتے پر چر چر کی آوازیں گونجنے لگتیں۔ سارے باغ میں شور مچا ہوا تھا۔

ہم ڈھیر سے ڈھیر سے ہر کے پیڑ تلاش کرنے لگے۔ ہر پیڑ کے پاس کچھ دیر کھڑے رہ کر وہ بڑے آدمی کو دیکھتے۔ لگ رہا تھا جیسے آج ہماری شکست کا آخری دن ہو گا۔

ہر پیڑ کے نیچے بہت سی جھڑبیریاں گری پڑی تھیں۔ چھوٹی بہن نے ایک کچا اٹھایا تو بھائی نے اس کے ہاتھ سے چھین کر پھینک دیا۔ جانتی نہیں کہ بس نے کیا کہا ہے؟ کوئی ایک بھی جھڑبیری منہ میں نہیں رکھے گا۔

ہم منڈی کے پاس ٹھیکیدار چار پانچ لوگوں کے ساتھ جھڑبیریاں چن چن کر پیٹیوں میں رکھ رہا تھا۔ اس کے پاس ہی لکڑی کی خالی پیٹیاں پڑی تھیں اور دری پر توڑی ہوئی جھڑبیریوں کا ایک ڈھیر۔ وہ سب بہت تیزی سے کام کر رہے تھے۔ ہمیں کھڑے دیکھ کر ٹھیکیدار نے ایک ایک مٹھی جھڑبیری ہم سب کو دینی چاہی، لیکن ہم نے انکار کر دیا۔

ہم لوگ باغ ہی میں گھومتے رہے۔ گھر سے باہر کہیں جانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ جھڑبیری کے پیڑ ڈھیر سے خالی ہوتے جا رہے تھے۔ اس دن غلیل چلانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بلبل اور دوسرے پرندے پیڑوں کے اوپر ہی چکر لگاتے رہے، کسی کو پیڑ پر بیٹھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

یہ دیکھو، اس پیڑ کے نیچے کیا پڑا ہے؟ چھوٹی بہن نے ایک پیڑ کی طرف اشارہ کیا۔

ہم نے اس طرف دیکھا لیکن پتا نہیں چل سکا کہ کیا ہے۔ پاس جانے پر پیڑ کے نیچے ایک مری ہوئی بلبل دکھائی دی۔ اس کی گردن پر خون جما ہوا تھا۔ ہم کچھ دیر تک چپ چاپ دیکھتے رہے۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا لیکن اس میں جان باقی نہیں بچی تھی۔

یہ کیسے مر گئی؟

کسی نے اس کی گردن پر پتھر مارا ہے۔

انھیں لوگوں نے مارا ہو گا۔

تبھی کوئی بلبل پیڑ پر نہیں بیٹھ رہی۔

ہم نے ٹھیکیدار اور اس کے آدمیوں کو بھی بد دعائیں دیں۔ ان لوگوں پر پہلے ہی بہت غصہ آ رہا تھا، جب بلبل کی موت دیکھی تو ان سے بدلہ لینے کا جذبہ ایک دم بھڑک اٹھا۔ کتنے ہی منصوبے بنائے لیکن ہر بار ان میں کوئی کمی نظر آتی جس کی وجہ سے وہ ادھورا چھوڑ دینا پڑتا۔ پھر یہ سوچ کر کہ اگر یہ بلبل یہیں پڑی رہی تو بلی یا کتا اسے کھا جائے گا، ہم نے پاس ہی ایک گڈھا کھود کر اس میں بلبل کو لٹا دیا اور اوپر سے مٹی ڈال دی۔

اس دن بھی ہم نے باغ میں دیر تک نہیں رکے۔ ہم نے جب مری ہوئی بلبل دیکھی، پیڑوں سے جھڑبیریوں کا ٹوٹنا۔ ہمیں پیڑوں سے پھل توڑنا اچھا نہیں لگتا۔ پودوں، پھلوں اور پھولوں میں بھی جان

Scanned with CamScanner

سوتی ہے۔ جنہیں تو شاید ہی کبھی رات جتنا ہی جب ... وہ مجھ سے کہا کرتی تھیں۔

وہ خوب شام کو بہت دیر تک جھیری کے ... سے۔ پھر ایک لڑکی آ کر کہتی تھیں وہ سب بیٹیاں لادی گئیں، اور وہ سب چلے گئے۔ ... وہ صرف جھیری کے نیچے جن پر ایک بھی جھیری دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ... آخری سانسیں لے رہی ہوں ... بچے گری تھیں۔ شاید انہیں بہت ... سے ڈر لگتا ہے۔

کھانے کے وقت ہم دن بھر کے واقعات کا ذکر کرتے رہے۔ ... میں نے ... کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ ان کے ... جیسے وہ ... سن رہی ہوں۔ کھانا بھی انھوں نے بہت کم کھایا۔

رات کو دیر تک نیند نہیں آئی۔ تو کوئی کتاب پڑھنے میں دل لگا۔ چھوٹے ... چارپائی پر لیٹتے ہی سو گئے۔ ... بہت کوشش کرنے پر بھی نیند نہیں آئی۔

کچھ دیر بعد میں کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ ... چمک رہے تھے۔ تارے یہاں بہت قریب دکھائی دیتے ہیں، ... اور تارے ... دکھائی دیتے ہیں ... پیڑوں کے نیچے کسی کی پرچھائیں دکھائی دی۔ مجھے ڈر سا لگا۔ لیکن ... تک سوئی نہیں...

میں بھی دبے پاؤں باہر آ گیا۔ وہ جھیری کے پیڑوں کے نیچے ٹہل رہی تھیں۔ ... نیچے تک جھول رہا تھا۔

ابھی تک سوئے نہیں؟ میری طرف دیکھے بغیر انھوں نے پوچھا۔

ان کی آواز سن کر میں چونک پڑا۔ ... پایا ہوگا۔ میں نے دھیمے سے میں کہا، نہیں! ابھی نیند نہیں آئی۔ ... رات کے سناٹے میں گونج جاتی۔ ... ہو گئی تھی۔

"آج بہت اندھیرا ہے،" میں بولا۔

"آج کل اندھیری راتیں ہیں۔"

کبھی کبھی ... کسی کسی پیڑ کو دیکھتیں ... کی شاخوں کے بیچ سے آسمان میں چمکتے تارے دکھائی دیتے۔

"آج تارے بہت قریب دکھائی دے رہے ہیں،" میں نے کہا۔

انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

Scanned with CamScanner

# اُشا پریم ودا

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

## واپسی

گجادھر بابو نے کمرے میں جمع سامان پر ایک نظر دوڑائی۔ دو بکس، ڈولچی، بالٹی۔ "یہ ڈبّہ کیسا ہے گنیشی؟" انھوں نے پوچھا۔ گنیشی بستر باندھتا ہوا کچھ گھمنڈ، کچھ دکھ، کچھ شرم سے بولا، "گھر والی نے ساتھ کے لیے کچھ بیسن کے لڈّو رکھ دیے ہیں۔ کہا، بابوجی کو پسند تھے۔ اب کہاں ہم غریب لوگ آپ کی کچھ خاطر کر پائیں گے۔" گھر جانے کی خوشی میں گجادھر بابو کو ایک دکھ کا احساس ہوا، جیسے ایک جانی پہچانی، مانوس، آرام دہ دنیا سے ان کا ناتا ٹوٹ رہا ہو۔

"کبھی کبھی ہم لوگوں کی بھی خبر لیتے رہیے گا۔" گنیشی بستر میں رسّی باندھتے ہوئے بولا۔

"کبھی کچھ ضرورت ہو تو لکھنا گنیشی۔ اس اگہن تک بٹیا کی شادی کر دو۔"

گنیشی نے انگوچھے کے کنارے سے آنکھیں پونچھیں۔ "اب آپ لوگ سہارا نہ دیں گے تو کون دے گا۔ آپ یہاں رہتے تو شادی میں کچھ حوصلہ رہتا۔"

گجادھر بابو چلنے کو تیار بیٹھے تھے۔ ریلوے کوارٹر کا یہ کمرہ جس میں انھوں نے کتنے سال بتائے تھے، بدصورت اور ننگا لگ رہا تھا، سامان کے ہٹ جانے سے۔ آنگن میں بوئے پودے بھی جان پہچان کے لوگ لے گئے تھے، اور جگہ جگہ مٹی بکھری پڑی تھی۔ مگر بیوی بچوں کے ساتھ رہنے کے خیال سے یہ دکھ ایک کمزور لہر کی طرح اٹھ کر کھو جاتی تھی۔

گجادھر بابو خوش تھے، بہت خوش۔ پینتیس سال کی نوکری کے بعد وہ ریٹائر ہو کر جا رہے تھے۔ ان برسوں میں زیادہ تر وقت انھوں نے اکیلے رہ کر کاٹا تھا۔ ان اکیلے لمحوں میں وہ اسی وقت کا تصور کرتے رہے تھے جب وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ رہ سکیں گے۔ اسی امید کے سہارے وہ اپنی محرومیوں کا بوجھ ڈھوتے

Scanned with CamScanner

رہے تھے۔ دنیا کی نظر میں ان کی زندگی کامیاب کہی جا سکتی تھی۔ انھوں نے شہر میں ایک مکان بنوا لیا تھا، بڑے لڑکے امر اور بڑی لڑکی کانتی کی شادیاں کر دی تھیں، دو بچے بڑی کلاسوں میں پڑھ رہے تھے۔ گجادھر بابو نوکری کی وجہ سے اکثر اسٹیشنوں پر رہے اور ان کے بیوی بچے شہر میں، تاکہ پڑھائی میں رکاوٹ نہ رہے۔ گجادھر بابو سبھاؤ میں بڑے بامحبت آدمی تھے اور محبت کے بھوکے بھی۔ جب بیوی بچے ساتھ تھے تو ڈیوٹی سے لوٹ کر بچوں سے ہنستے بولتے، بیوی سے کچھ ہنسی مذاق کرتے۔ ان کے چلے جانے سے گجادھر بابو کی زندگی میں بڑا سونا پن آ گیا تھا۔ خالی وقت میں ان سے گھر میں ٹکا نہ جاتا۔ شاعری کا مذاق نہ رکھنے پر بھی انھیں بیوی کی پیار بھری باتیں یاد آتی رہتیں۔ دوپہر میں گرمی ہونے پر بھی وہ دو بجے تک آگ جلائے رکھتی اور ان کے اسٹیشن سے لوٹنے پر گرم گرم روٹیاں سینکتی۔ ان کے کھا چکنے کے بعد بھی منع کرنے کے باوجود ان کی تھالی میں اور کھانا ڈالتی اور ان سے بڑے پیار سے اصرار کرتی۔ جب وہ تھکے ہارے باہر سے آتے تو ان کی آہٹ پا کر وہ رسوئی کے دروازے پر آ کھڑی ہوتی اور اس کی شرمیلی آنکھیں مسکرا اٹھتیں۔ گجادھر بابو کو تب ہر چھوٹی بات بھی یاد آتی اور وہ اداس ہو جاتے۔ اب کتنے برس بعد وہ موقع آیا تھا کہ وہ اس پیار بھرے ماحول میں رہنے جا رہے تھے۔

ٹوپی اتار کر گجادھر بابو نے چارپائی پر رکھ دی، جوتے کھول کر نیچے کھسکا دیے۔ اندر سے رہ رہ کر قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔ اتوار کا دن تھا اور ان کے سب بچے اکٹھے ہو کر ناشتہ کر رہے تھے۔ گجادھر بابو کے خشک چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اسی طرح مسکراتے ہوئے وہ بغیر کھنکھارے اندر چلے گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ نریندر پچھلی رات کو دیکھی کسی فلم کے ناچ کی نقل کر کے ہاتھ رکھے کر رہا ہے اور بسنتی ہنس ہنس کر دوہری ہوئی جا رہی ہے۔ امر کی دلہن کو اپنے تن بدن، گھونگھٹ، کسی چیز کا ہوش نہیں تھا اور وہ بھی بے تحاشہ ہنس رہی تھی۔ گجادھر بابو کو دیکھتے ہی نریندر دھپ سے بیٹھ گیا اور چائے کا پیالہ اٹھا کر منھ سے لگا لیا۔ بہو کو ہوش آیا اور اس نے جھٹ سے ماتھا ڈھک لیا۔ صرف بسنتی کا جسم رہ رہ کر ہنسی دبانے کی کوشش میں ہل رہا تھا۔

گجادھر بابو نے مسکراتے ہوئے ان لوگوں کو دیکھا پھر کہا، "کیوں نریندر، کیا نقل ہو رہی تھی؟"

"کچھ نہیں بابوجی۔" نریندر نے سٹپٹاتے ہوئے کہا۔ گجادھر بابو نے چاہا تھا کہ وہ بھی اس ہنسی مذاق میں شامل ہوتے مگر ان کے آتے ہی سب چپ ہو گئے۔ اس سے ان کے دل میں تھوڑی مایوسی آ گئی۔ بیٹھتے ہوئے بولے، "بسنتی، مجھے بھی چائے دینا۔ تمھاری ماں کی پوجا ابھی چل رہی ہے کیا؟"

بسنتی نے ماں کی کوٹھری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "ابھی آتی ہی ہوں گی۔" اور پیالے میں ان کے لیے چائے بنانے لگی۔ بہو چپ چاپ پہلے ہی چلی گئی تھی، اب نریندر بھی چائے کا آخری گھونٹ پی کر اٹھ کھڑا ہوا۔ صرف بسنتی، باپ کے لحاظ میں، چوکے میں بیٹھی ان کی راہ دیکھنے لگی۔ گجادھر بابو نے ایک گھونٹ چائے پی، پھر کہا، "بٹی، چائے تو پھیکی ہے۔"

Scanned with CamScanner

"لائیے، چینی اور ڈال دوں،" بسنتی بولی۔

"رہنے دو۔ تمہاری ماں جب آئے گی تبھی پی لوں گا۔"

تھوڑی دیر میں ان کی بیوی ہاتھ میں لٹیا میں پانی لیے نکلی اور جاپ کرتے ہوئے اسے تلسی کے پودے میں ڈال دیا۔ انہیں دیکھتے ہی بسنتی بھی اُٹھ گئی۔ بیوی نے آ کر گجادھر بابو کو دیکھا اور کہا، "ارے، آپ اکیلے بیٹھے ہیں! یہ سب کہاں گئے؟"

گجادھر بابو کے دل میں چبھن سی ہوئی۔ "اپنے اپنے کام میں لگ گئے ہیں۔ آخر بچے ہی ہیں۔"

بیوی آ کر چوکے میں بیٹھ گئیں۔ انہوں نے ناک بھوں چڑھا کر چاروں طرف جھوٹے برتنوں کو دیکھا، پھر بولیں، "سارے میں جھوٹے برتن پڑے ہیں۔ اس گھر میں دھرم کرم کچھ نہیں ہے۔ سب سے کہاں تک کہا جائے، سیدھے چوکے میں گھسو۔" پھر انہوں نے نوکر کو پکارا، جب جواب نہ ملا تو ایک بار اور زور سے آواز دی۔ پھر شوہر کی طرف دیکھ کر بولیں، "بہو نے بھیجا ہو گا بازار۔" اور ایک لمبی سانس لے کر چپ ہو رہیں۔

گجادھر بابو بیٹھ کر چائے اور ناشتے کا انتظار کرتے رہے۔ انہیں اچانک گنیشی کی یاد آ گئی۔ روز صبح پیسنجر آنے سے پہلے وہ گرم گرم پوریاں اور جلیبی بناتا تھا۔ گجادھر بابو جب تک اٹھ کر تیار ہوتے، ان کے لیے جلیبیاں اور چائے لا کر رکھ دیتا تھا۔ چائے بھی کتنی بڑھیا، کانچ کے گلاس میں اوپر تک بھری لبالب، پورے ڈھائی چمچ چینی اور گاڑھی ملائی۔ پیسنجر بھلے ہی رانی پور لیٹ پہنچے، گنیشی نے چائے پہنچانے میں کبھی دیر نہیں کی۔ کیا مجال کہ اس سے کبھی کچھ کہنا پڑے۔

بیوی کی شکایت بھری آواز سن کر ان کے خیالات میں خلل پڑا۔ وہ کہہ رہی تھیں، "سارا دن اسی کھچ کھچ میں نکل جاتا ہے۔ اس گرہستی کا دھندا پیٹتے پیٹتے عمر بیت گئی۔ کوئی ذرا ہاتھ بھی نہیں بٹاتا۔"

"بہو کیا کرتی ہے؟" گجادھر بابو نے پوچھا۔

"پڑی رہتی ہے۔ بسنتی کو تو پھر کہو کالج جانا ہوتا ہے۔"

گجادھر بابو نے جوش میں آ کر بسنتی کو آواز دی۔ بسنتی بھابھی کے کمرے سے نکلی تو گجادھر بابو نے کہا، "بسنتی، آج سے شام کا کھانا بنانے کی ذمہ داری تمہاری ہے۔ صبح کا کھانا تمہاری بھابھی بنائیں گی۔"

بسنتی منہ لٹکا کر بولی، "بابوجی، پڑھنا بھی تو ہوتا ہے۔"

گجادھر بابو نے پیار سے سمجھایا، "تم صبح پڑھ لیا کرو۔ تمہاری ماں بوڑھی ہوئیں، ان کے جسم میں اب وہ طاقت نہیں ہے۔ تم ہو، تمہاری بھابھی ہے، دونوں کو ان کے کام میں ہاتھ بٹایا کرو۔"

بسنتی چپ رہ گئی۔ ان کے جانے کے بعد اس کی ماں نے دھیرے سے کہا، "پڑھنے کا تو بہانہ ہے۔ کبھی جی ہی نہیں لگتا۔ لگے کیسے؟ شیلا سے فرصت ملے تب نا۔ بڑے بڑے لڑکے ہیں اس گھر میں۔ ہر وقت وہاں گھسے رہنا مجھے نہیں بھاتا۔ منع کرو تو سنتی ہی نہیں۔"

ناشتا کر کے گجادھر بابو بیٹھک میں چلے گئے۔ گھر چھوٹا تھا اور سیٹنگ کچھ ایسی ہو چکی تھی کہ اس میں گجادھر بابو کے لیے کوئی جگہ نہ بچی تھی۔ جیسے کسی مہمان کے لیے وقتی طور پر کوئی بندوبست کر دیا جاتا ہے، اسی طرح بیٹھک میں کرسیوں کو دیوار سے لگا کر ان کے لیے پتلی سی چارپائی ڈال دی گئی تھی۔

گجادھر بابو اس کمرے میں پڑے پڑے کبھی کبھی چپ چاپ اس وقتی بندوبست پر غور کرتے۔ انھیں یاد آتی ان گاڑیوں کی جو آتیں اور تھوڑی دیر رک کر کسی اور مقام کی طرف بڑھ جاتیں۔ گھر چھوٹا ہونے کی وجہ سے بیٹھک ہی میں اپنا انتظام کیا تھا۔ ان کی بیوی کے پاس اندر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، پر وہ ایک طرف اچار کے مرتبانوں، دال چاول کے کنستروں اور گھی کے ڈبوں سے گھرا ہوا تھا۔ دوسری طرف پرانی رضائیاں دریوں میں لپٹی اور رسیوں میں بندھی رکھی تھیں۔ ان کے پاس ایک بڑے سے ٹین کے بکس میں گھر بھر کے گرم کپڑے رکھے تھے۔ بیچ میں ایک الگنی بندھی ہوئی تھی جس پر زیادہ تر بسنتی کے کپڑے بے ترتیبی سے لٹکے تھے۔ وہ جان بوجھ کر اس کمرے میں جانے سے بچتے تھے۔ گھر کا دوسرا کمرہ امر اور اس کی بیوی کے پاس تھا۔ تیسرا کمرہ جو سامنے کی طرف تھا، بیٹھک تھا۔ کرسیوں پر نیلی گدیاں اور بہو کے ہاتھ کے کاڑھے کشن پڑے تھے۔

جب بھی ان کی بیوی کو کوئی لمبی شکایت کرنی ہوتی تو وہ اپنی چٹائی بیٹھک میں ڈال پڑ جاتی تھیں۔ ایک دن وہ چٹائی لے کر آ گئیں۔ گجادھر بابو نے گھر گرہستی کی باتیں چھیڑیں۔ وہ گھر کا حساب دیکھ رہے تھے۔ بہت ہلکے سے انھوں نے کہا، اب ہاتھ میں پیسہ کم رہے گا۔ کچھ خرچ کم ہونا چاہیے۔

سبھی خرچ تو واجب ہے۔ کس کا پیٹ کاٹوں؟ یہی جوڑ گانٹھ کرتے کرتے بوڑھی ہو گئی۔ نہ من کا پہنا نہ اوڑھا۔

گجادھر بابو نے زخمی اور دکھی نگاہوں سے بیوی کو دیکھا۔ ان سے اپنی حیثیت چھپی نہ تھی۔ ان کی بیوی تنگی کا رونا روتیں، یہ فطری بات تھی، لیکن ان کے لہجے میں چھپے طنز کا احساس گجادھر بابو کو بہت چبھا۔ ان سے اگر اس مسئلے پر بات کی جاتی کہ گھر کا انتظام کیسے چلے، کیسے پورا ہو، تو شاید انھیں کچھ سکون ملتا۔ لیکن ان سے صرف شکایت کی جاتی تھی، جیسے کنبے کی ساری پریشانیوں کے ذمے دار وہی ہوں۔

تمھیں کس بات کی کمی ہے امر کی ماں۔ گھر میں بہو ہے، لڑکے بچے ہیں۔ صرف روپے ہی سے آدمی امیر نہیں ہوتا۔ گجادھر بابو نے کہا، اور کہنے کے ساتھ ہی اندازہ لگایا کہ یہ محض ان کی اپنی سوچ ہے، جسے ان کی بیوی نہیں سمجھ سکتی۔

ہاں، بڑا سکھ ہے بہو سے نا۔ آج کھانا بنانے گئی ہے، دیکھو کیا ہوتا ہے۔ یہ کہہ کر بیوی نے آنکھیں موند لیں اور سو گئیں۔ گجادھر بابو بیٹھے بیوی کو دیکھتے رہ گئے۔ کیا یہی تھی ان کی بیوی جس کے نرم ہاتھوں کے لمس، جس کی مسکراہٹ کی یاد میں انھوں نے زندگی کاٹ دی تھی؟ انھیں لگا کہ وہ خوب صورت دوشیزہ زندگی کی راہ میں کہیں کھو گئی ہے اور اس کی جگہ آج جو عورت ہے وہ ان کے دل اور روح کے لیے یکسر اجنبی ہے۔ گہری نیند میں سوئی ہوئی عورت کا جسم ایک دم بے ڈول اور بھدا لگ رہا تھا۔

چہرہ سُنا ہوا اور بے رونق سا۔ گجادھر بابو ایک پلک بیوی کو دیکھتے رہ گئے اور پھر لیٹ کر چھت کی طرف تاکنے لگے۔

اندر کچھ گرا اور ان کی بیوی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ "لو بلی نے کچھ گرا دیا شاید!" وہ اندر بھاگیں۔ تھوڑی دیر میں لوٹ کر آئیں تو ان کا منہ پھولا ہوا تھا۔ "دیکھا بہو کو، رسوئی کھلی چھوڑ آئی۔ بلی نے دال کی پتیلی گرا دی۔ سبھی تو کھا کے سوئے ہیں، اب کیا کھلاؤں گی۔" وہ سانس لینے کو رکیں اور بولیں، "ایک ترکاری اور چار پراٹھے بنانے میں سارا ڈبہ گھی انڈیل کر رکھ دیا۔ ذرا سی درد نہیں ہے۔ کمانے والا ہڈیاں توڑے اور یہاں چیزیں لٹیں۔ مجھے تو معلوم تھا کہ یہ سب کام کسی کے بس کا نہیں ہے۔"

گجادھر بابو کو لگا کہ بیوی اور کچھ بولے گی تو کان جھنجھنا اٹھیں گے۔ ہونٹ بھینچ کر کروٹ لے انھوں نے پیٹھ بیوی کی طرف کر لی۔

رات کا کھانا بسنتی نے جان بوجھ کر ایسا بنایا تھا کہ ایک کور حلق سے نہ اترے۔ گجادھر بابو چپ چاپ کھا کر اٹھ گئے، پر نریندر تھالی سرکا کر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا، "میں ایسا کھانا نہیں کھا سکتا۔"

بسنتی تنک کر بولی، "تو نہ کھاؤ، کون تمہاری خوشامد کر رہا ہے۔"

"تم سے کھانا بنانے کو کس نے کہا تھا؟" نریندر چلایا۔

"بابوجی نے۔"

"بابوجی کو بیٹھے بیٹھے یہی سوجھتا ہے۔"

بسنتی کو اٹھا کر ماں نے نریندر کو منایا اور اپنے ہاتھ سے کچھ بنا کر کھلایا۔ گجادھر بابو نے بعد میں بیوی سے کہا، "اتنی بڑی لڑکی ہو گئی اور اسے کھانا بنانے کا ڈھنگ نہیں آیا؟"

"ارے آتا تو سب کچھ ہے، کرنا نہیں چاہتی۔" بیوی نے جواب دیا۔

اگلی شام ماں کو رسوئی میں دیکھ کر کپڑے بدل کر بسنتی باہر آئی تو بیٹھک سے گجادھر بابو نے ٹوک دیا۔ "کہاں جا رہی ہو؟"

"پڑوس میں، شیلا کے گھر،" بسنتی نے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے، اندر جا کر پڑھو۔" گجادھر بابو نے کڑے لہجے میں کہا۔ کچھ دیر تذبذب میں کھڑی رہ کر بسنتی اندر چلی گئی۔

گجادھر بابو روز شام ٹہلنے چلے جاتے تھے۔ لوٹ کر آئے تو بیوی نے کہا، "کیا کہہ دیا بسنتی سے؟ شام سے منہ لپیٹے پڑی ہے۔ کھانا بھی نہیں کھایا۔"

گجادھر بابو جھنجھلا اٹھے۔ بیوی کی بات کا انھوں نے جواب نہیں دیا۔ انھوں نے دل میں طے کر لیا کہ بسنتی کی شادی جلد کر دینی ہے۔

اس دن کے بعد سے بسنتی باپ سے کٹی کٹی رہنے لگی۔ جانا ہوتا تو پچھواڑے سے جاتی۔ گجادھر بابو نے دو ایک بار بیوی سے پوچھا تو جواب ملا، "روٹھی ہوئی ہے۔"

گجادھر بابو کو غصہ آیا۔ "لڑکی کے اتنے مزاج! چلنے سے روک دیا تو باپ سے بولے گی نہیں؟"

پھر ان کی بیوی نے خبر دی، "امر الگ رہنے کی سوچ رہا ہے۔"

"کیوں؟" گجادھر بابو نے حیرت سے پوچھا۔

بیوی نے کوئی صاف جواب نہیں دیا۔ امر اور اس کی بیوی کو بہت شکایتیں تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ گجادھر بابو ہمیشہ بیٹھک میں پڑے رہتے ہیں، کوئی آنے جانے والا ہو تو کہیں بٹھانے کی جگہ نہیں۔ امر کو اب بھی وہ چھوٹا سمجھتے تھے اور موقع بے موقع ٹوک دیتے تھے۔ بہو کو کام کرنا پڑتا تھا اور ساس جب تب پھوہڑپن کے طعنے دیا کرتی تھیں۔

"ہمارے آنے سے پہلے بھی کبھی کوئی ایسی بات ہوئی تھی؟" گجادھر بابو نے بیوی سے پوچھا۔

بیوی نے سر ہلا کر بتایا کہ نہیں۔ پہلے امر گھر کا مالک بن کے رہتا تھا۔ بہو کو کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ امر کے دوستوں کا اکثر یہیں اڈا جما رہتا تھا اور اندر سے ناشتا چائے تیار ہو کر جاتا رہتا تھا۔ بسنتی کو بھی وہی اچھا لگتا تھا۔

گجادھر بابو نے دھیرے سے کہا، "امر سے کہو جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے۔"

اگلے دن وہ لوٹ کر آئے تو انھوں نے دیکھا کہ بیٹھک میں ان کی چارپائی نہیں ہے۔ اندر جا کر پوچھنے ہی والے تھے کہ ان کی نظر رسوئی میں بیٹھی بیوی پر پڑی۔ انھوں نے یہ پوچھنے کو منہ کھولا کہ بہو کہاں ہے، پھر کچھ یاد کر کے چپ ہو گئے۔ بیوی کی کوٹھری میں جھانکا تو اچار، رضائیوں اور کنستر کے بیچ اپنی چارپائی لگی پائی۔ گجادھر بابو نے کوٹ اتارا اور ٹانگنے کے لیے دیوار پر نظر دوڑائی۔ پھر اسے موڑ کر الگنی کے کچھ کپڑے کھسکا کر ایک کنارے ٹانگ دیا۔ کچھ کھائے بغیر ہی اپنی چارپائی پر لیٹ گئے۔ کچھ بھی ہو، تن آخر بوڑھا ہی تھا۔ صبح شام کچھ دیر ٹہلنے ضرور چلے جاتے تھے، پر آتے آتے تھک جاتے تھے۔

گجادھر بابو کو اپنا بڑا سا کھلا کوارٹر یاد آیا۔ بے فکر زندگی۔ صبح پسنجر ٹرین آنے پر اسٹیشن کی چہل پہل، جانے انجانے چہرے، اور پٹری پر ریل کے پہیوں کی کھٹ کھٹ جو ان کے لیے مدھر سنگیت کی طرح تھی۔ طوفان اور ڈاک گاڑی کے انجنوں کی چنگھاڑ ان کی اکیلی راتوں کی ساتھی تھی۔ سیٹھ رام جی مل کی مل کے کچھ لوگ کبھی ان کے پاس آ بیٹھتے۔ وہی ان کا حلقہ تھا، وہی ان کے ساتھی تھے۔ وہ زندگی اب نہیں ایک کھوئی ہوئی دولت معلوم ہوئی۔ انھیں لگا کہ وہ زندگی سے دھوکا کھا گئے، ٹھگے گئے۔ انھوں نے جو کچھ چاہا اس میں سے ایک بوند بھی انھیں نہیں ملا۔

بیٹھے ہوئے وہ گھر کے اندر سے آتی ہوئی مختلف آوازیں سنتے رہے۔ بہو اور ساس کی چھوٹی موٹی جھڑپ، بالٹی پر کھلے نل کی آواز، رسوئی کے برتنوں کی کھٹ پٹ، اور اسی میں دو گوریوں کی بات چیت۔ اور اچانک ہی انھوں نے ارادہ کر لیا کہ اب گھر کے کسی معاملے میں دخل نہیں دیں گے۔ اگر گھر کے مالک کے لیے پورے گھر میں ایک چارپائی کی جگہ نہیں ہے تو یہیں پڑے رہیں گے۔ اگر کہیں اور ڈال دی گئی

Scanned with CamScanner

تو وہاں چلے جائیں گے۔ اگر بچوں کی نظر میں ان کی کوئی وقعت نہیں ہے یا اس گھر میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے تو اپنے گھر میں پردیسیوں کی طرح پڑے رہیں گے۔

اور اس دن کے بعد گجادھر بابو بیچ میں کچھ نہیں بولے۔ نریندر روپے مانگنے آیا تو بغیر وجہ پوچھے روپے دے دیے۔ بسنتی کافی اندھیرا ہو جانے کے بعد بھی پڑوس میں رہی تو بھی انھوں نے کچھ نہیں کہا۔ پر انھیں سب سے بڑا غم یہ تھا کہ ان کی بیوی نے بھی ان میں اتنی بڑی تبدیلی ہونے کا کوئی اثر نہیں لیا۔ وہ دل ہی دل میں کتنا بار ڈھو رہے ہیں، اس بات سے وہ بے خبر ہی رہیں۔ بلکہ انھیں شوہر کے گھر کے معاملات میں دخل نہ دینے کی وجہ سے ایک طرح سکون ہی تھا۔ کبھی کبھی کہہ بھی اٹھتیں، ٹھیک ہی ہے، آپ بیچ میں نہ پڑا کیجیے۔ بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ ہمارا جو فرض ہے وہ پورا کر رہے ہیں۔ پڑھا رہے ہیں، شادی کر دیں گے۔

گجادھر بابو نے چوٹ کھائی نظر سے بیوی کی طرف دیکھا۔ انھوں نے اندازہ لگایا کہ وہ بیوی اور بچوں کے لیے روزی کمانے کا ذریعہ بھر ہی تھے۔ جس شخص کے وجود سے ان کی بیوی کو مانگ میں سیندور بھرنے کا حق حاصل ہے، سماج میں اس کی عزت ہے، اس کے سامنے وہ دو وقت کی روٹی رکھ دینے ہی سے سارے فرض سے چھٹی پا لیتی ہے۔ وہ گھی اور چینی کے ڈبوں میں اس قدر گم ہے کہ وہی اب اس کی پوری دنیا بن گئے ہیں۔ گجادھر بابو اب اس کی زندگی کا محور نہیں رہ گئے۔ اب ان کا بیٹی کی شادی کا حوصلہ بھی ماند پڑ گیا۔

کسی بھی بات میں دخل نہ دینے کے عہد کے باوجود بھی ان کا وجود اس ماحول کا حصہ نہ بن سکا۔ ان کی موجودگی اس گھر میں ایسی بے جوڑ سی لگنے لگی تھی جیسے سجی ہوئی بیٹھک میں ان کی چارپائی ہو۔ ان کی ساری خوشی ایک گہری اداسی میں ڈوب گئی۔

اتنے سب ارادوں کے باوجود ایک دن بیچ میں دخل دے بیٹھے۔ بیوی اپنی عادت کے مطابق نوکر کا گلہ شکوہ کر رہی تھیں: کتنا کام چور ہے، سودے میں سے پیسے بھی کاٹتا ہے، کھانے پر بیٹھے تو کھاتا ہی چلا جاتا ہے۔ گجادھر بابو کو برابر یہ محسوس ہوتا کہ ان کے گھر کا خرچ ان کی حیثیت سے کہیں زیادہ ہے۔ بیوی کی بات سن کر بولے، نوکر کا خرچ بالکل بے کار ہے۔ چھوٹا موٹا کام ہوتا ہے، گھر میں تین مرد ہیں، کوئی نہ کوئی کر ہی دے گا۔ انھوں نے اسی دن نوکر کا حساب کر دیا۔ امر دفتر سے آیا تو نوکر کو پکارنے لگا۔ امر کی بیوی بولی، بابوجی نے نوکر چھڑا دیا ہے۔

کیوں؟

کہتے ہیں خرچ بہت ہے۔

بات سیدھی سی تھی پر جس لہجے میں بہو بولی گجادھر بابو کو کھٹک گیا۔ اس دن طبیعت کچھ بوجھل ہونے کی وجہ سے گجادھر بابو ٹہلنے نہیں گئے۔ کاہلی میں اٹھ کر بتی بھی نہیں جلائی تھی۔ اس بات سے بے خبر، نریندر ماں سے کہنے لگا، ماں، تم بابوجی سے کہتیں کیوں نہیں؟ بیٹھے بٹھائے نوکر چھڑا دیا۔ گر

Scanned with CamScanner

بابوجی یہ سمجھتے ہیں کہ میں سائیکل پر گیہوں رکھ کر آٹا پسوانے جاؤں گا تو یہ نہیں ہونے کا!

"ہاں ہاں!" یہ بسنتی کی آواز تھی۔ "میں کالج بھی جاؤں اور گھر لوٹ کر جھاڑو بھی لگاؤں، یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔"

"بوڑھے آدمی ہیں،" امر جھنجھنایا، "چپ چاپ پڑے رہیں۔ ہر چیز میں دخل کیوں دیتے ہیں؟"

بیوی نے بڑے طنز سے کہا، "اور کچھ نہیں تو تمہاری بیوی کو رسوئی میں بھیج دیا۔ وہ گئی تو پندرہ دن کا راشن پانچ دن میں بنا کے رکھ دیا۔" بہو کچھ کہے اس سے پہلے وہ رسوئی میں گھس گئیں۔ کچھ دیر بعد اپنی کوٹھری میں آئیں اور بجلی جلائی تو گجادھر بابو کو لیٹے دیکھ کر سٹپٹا گئیں۔ گجادھر بابو کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا وہ کچھ اندازہ نہ لگا پائیں۔ وہ چپ آنکھیں بند کیے لیٹے رہے۔

گجادھر بابو چٹھی ہاتھ میں لیے اندر آئے اور بیوی کو پکارا۔ وہ بھیگے ہاتھ لیے نکلیں اور آنچل سے ہاتھ پونچھتے ہوئے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں۔ گجادھر بابو نے بغیر کسی تمہید کے کہا، "مجھے سیٹھ رام جی مل کی چینی مل میں نوکری مل گئی ہے۔ خالی بیٹھے رہنے سے تو چار پیسے گھر میں آئیں، وہی اچھا ہے۔ انھوں نے تو پہلے ہی کہا تھا، میں نے ہی انکار کر دیا تھا۔" پھر کچھ رک کر، جیسے بجھی ہوئی آگ میں کوئی چنگاری چمک اٹھے، انھوں نے دھیمے لہجے میں کہا، "میں نے سوچا تھا کہ برسوں تم لوگوں سے الگ رہنے کے بعد ریٹائرمنٹ پا کر کنبے کے ساتھ رہوں گا۔ خیر۔ پرسوں جانا ہے۔ تم بھی چلو گی؟"

"میں؟" بیوی نے ہڑبڑا کر کہا۔ "میں چلی جاؤں گی تو یہاں کا کیا ہوگا؟ اتنی بڑی گرہستی، پھر سیانی لڑکی---"

بات بیچ میں کٹ گئی۔ گجادھر بابو نے تھکی ہوئی آواز میں کہا، "ٹھیک ہے، تم یہیں رہو۔ میں نے تو ایسے ہی کہا تھا۔" اور گہری خاموشی میں ڈوب گئے۔

نریندر نے بڑی مستعدی سے بستر باندھا اور رکشا بلا لیا۔ گجادھر بابو کا ٹین کا بکس اور پتلا سا بستر اس پر رکھ دیا۔ ناشتے کے لیے لڈو اور مٹھری کی ڈلیا ہاتھ میں لیے گجادھر بابو رکشا پر بیٹھ گئے۔ ایک نظر انھوں نے اپنے کنبے پر ڈالی، پھر دوسری طرف دیکھنے لگے، اور رکشا چل پڑا۔

ان کے جانے کے بعد سب اندر لوٹ آئے۔ بہو نے امر سے پوچھا، "سنیما لے چلیے گا نا؟" بسنتی نے اچھل کر کہا، "بھیا ہمیں بھی!"

گجادھر بابو کی بیوی سیدھے رسوئی میں چلی گئیں۔ بچی ہوئی چیزوں کو کٹوردان میں رکھ کر اپنی کوٹھری میں لائیں اور کنستروں کے پاس رکھ دیا۔ پھر باہر آ کر کہا، "ارے نریندر، بابوجی کی چارپائی باہر نکال دے۔ اس میں چلنے تک کی جگہ نہیں ہے۔"

**

Scanned with CamScanner

راجیندر یادو

---

ہندی سے ترجمہ: صدیق حسین

# جہاں لکشمی قید ہے

دراصل یہ کہانی وشنو کی پتنی لکشمی کے بارے میں نہیں، لکشمی نام کی ایک ایسی لڑکی کے بارے میں ہے جو اپنی قید سے چھٹکارا پانا چاہتی ہے۔ اِن دو ناموں میں ایسا مغالطہ ہونا فطری بات ہے، جیسا کہ کچھ لمحوں کے لیے گووند کو ہو گیا تھا۔

ایک دم گھبرا کر جب گووند کی آنکھ کھلی تو وہ پسینے سے تر تھا۔ اُس کا دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا کہ اسے لگا کہیں اچانک اُس کی دھڑکن بند نہ ہو جائے۔ اُس نے اندھیرے میں پانچ چھ بار پلکیں جھپکائیں۔ پہلی بار تو اُس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ وہ کہاں ہے، کیسا ہے۔ وہ سمت اور جگہ کا شعور ایک دم کھو گیا۔ جب پاس کے مکان کی گھڑی نے ایک گھنٹا بجایا تو اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ وہ گھڑی کہاں ہے، وہ خود کہاں ہے اور گھنٹا کہاں بج رہا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے اُسے دھیان آیا۔ اُس نے زور سے پیٹ کے گلے کا پسینہ پونچھا اور اُسے لگا کہ اُس کے دماغ میں پھر وہی کھٹ کھٹ گونج، ابھی سے جو ابھی گونج رہی تھی۔

پتا نہیں سپنے میں یا سچ مچ ہی، گووند کو ایسا لگا تھا جیسے کسی نے کواڑ پر تین چار بار کھٹ کھٹ کی ہو اور بہت گڑگڑا کر کہا ہو: مجھے نکالو، مجھے نکالو! اور وہ آواز کچھ ایسے پر اسرار ڈھنگ سے اندر سے آ کر اُس کے وجود کو کونپنے لگی کہ وہ ہڑبڑا کر جاگ اٹھا۔ وہ سچ مچ کسی کی آواز تھی یا محض اُس کا وہم؟

پھر اُسے دھیرے دھیرے یاد آیا کہ یہ آواز تو لکشمی کی تھی اور وہ لکشمی کے بارے میں سوچتا ہوا ایسا مغلوب ہو کر سویا تھا کہ وہ سپنے میں بھی چھائی رہی۔ لیکن حقیقت میں یہ آواز کیسی عجیب تھی، کیسی صاف تھی۔ اُس نے کئی بار سنا تھا کہ کسی فلاں عورت یا مرد نے سپنے میں آ کر کوئی کہتا تھا: مجھے نکالو، مجھے نکالو! پھر وہ

دھیرے دھیرے جگہ کا پتا بھی بتانے لگتا تھا، اور وہاں کھدوانے پر اُسے گڑے ہوئے یا ہانڈی میں بھرے سونے چاندی کے سکّے یا دولت ملی اور وہ دیکھتے دیکھتے مالامال ہو گیا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی غیر حقدار آدمی نے اس خزانے کو نکلوانا چاہا تو اس میں کوڑیاں اور کوئلے، یا پھر اس کے کوڑھ پھوٹ آیا یا گھر میں کوئی موت ہو گئی۔ کہیں اسی طرح دھرتی کے نیچے سے اُسے کوئی لکشمی تو نہیں پکار رہی ہے؟ وہ بڑی دیر تک سوچتا رہا۔ اُس کے دماغ میں پھر لکشمی کا قصہ مجسم ہونے لگا۔ وہ بے سُدھ سا پڑا رہا۔

دور کہیں دوسرے گھڑیال نے پھر وہی ایک گھنٹا بجایا۔

گووند سے اب نہیں رہا گیا۔ رضائی کو چاروں طرف سے بند رکھے، بہت سنبھال کر اس نے کہنی تک ہاتھ نکالا، لیٹے لیٹے الماری کے خانے سے کتابوں کاپیوں کی تہ سے آدھی جلی موم بتی نکالی، وہیں کہیں سے کھوج کر دیا سلائی نکالی اور آدھا اٹھ کر، تاکہ جاڑے میں دوسرا ہاتھ پورا نہ نکالنا پڑے، دو تین بار گھِس کر دیا سلائی جلائی، موم بتی روشن کی اور پگھلے موم کی بوند ٹپکا کر اسے دوات کے ڈھکن کے اوپر جما دیا۔ دھیرے دھیرے مدھم روشنی میں اُس نے دیکھ لیا کہ پورے کواڑ بند ہیں اور دروازے کے سامنے والی دیوار میں بنے چھوٹے روشن دان کے اوپر دوسری منزل سے جو ہلکی ہلکی روشنی آتی ہے، وہ بھی بجھ چکی ہے۔ سب کچھ کتنا شانت ہو چکا ہے۔ بجلی کا سوئچ، گرچہ اس کے تخت کے اوپر ہی لگا تھا، لیکن ایک تو جاڑے میں رضائی سمیت یا رضائی چھوڑ کر کھڑے ہونے کا آلکس، دوسرے لالہ روپا رام کا ڈر۔ صبح ہی کہے گا، گووند بابو، بڑی دیر تک پڑھائی ہو رہی ہے آج کل! جس کا سیدھا مطلب ہو گا کہ بڑی بجلی خرچ کرتے ہو!

پھر اس نے چپکے سے، جیسے کوئی اُسے دیکھ رہا ہو، تکیے کے نیچے سے رضائی کے اندر ہی اندر ہاتھ بڑھا کر وہ رسالہ نکال لیا اور گردن کے پاس سے ہاتھ نکال کر اس کے سینتالیسویں صفحے کو سویں بار کھول کر بہت دیر تک گھورتا رہا۔ ایک بجے کی پٹھان کوٹ ایکسپریس جب دہاڑتی ہوئی گزر گئی تو اچانک اُسے ہوش آیا۔ جو دو صفحے --- ۴۷ اور ۴۸ --- اُس کے سامنے کھلے ہوئے تھے، ان پر جگہ جگہ نیلی روشنائی سے کچھ سطروں کے نیچے لائنیں کھینچی گئی تھیں۔ یہی نہیں، اس صفحے کا کونا موڑ کر انہیں لائنوں کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی گئی تھی۔ اب تک گووند ان سطروں یا ان کے آس پاس کی سطروں کو بیس سے زیادہ بار گھور چکا تھا۔ اُس نے شک بھری نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک بار پھر اُن سطروں کو پڑھا۔

جتنی بار وہ انہیں پڑھتا، اس کا دل ایک نجانے آنند کے بوجھ سے دھڑک کر ڈوبنے لگتا اور دماغ اسی طرح جھنجھنانے لگتا جیسے اُس وقت جھنجھنایا تھا جب یہ رسالہ اُسے ملا تھا۔ اگرچہ اس دوران اس کی ذہنی کیفیت کئی مشکل مرحلوں سے گزر چکی تھی، پھر بھی وہ بہت دیر تک کالی روشنائی میں چھپے حروف کو ٹھہری ہوئی نگاہوں سے گھورتا رہا۔ دھیرے دھیرے اُسے ایسا لگا کہ حروف کی یہ سطر ایک ایسی کھڑکی کی جالی ہے جس کے پیچھے بکھرے بالوں والی ایک بے پروا لڑکی کا چہرہ جھانک رہا ہے۔ اور پھر اس کے دماغ میں بچپن میں سنی ہوئی کہانی اُبھرنے لگی۔ شکار کھیلتے میں ساتھیوں کا ساتھ چھوٹ جانے پر بھٹکتا ہوا راجکمار پسینے سے بھیگے ہوئے گھوڑے پر، بالکل ویرانے میں، سمندر کے کنارے بنے ایک بہت بڑے سنسان محل کے نیچے جا پہنچا۔

Scanned with CamScanner

وہاں اوپر کھڑکی میں اُسے ایک صورت سندر راجکماری بیٹھی دکھائی دی جسے ایک راکشس نے وہاں لا کر قید کر دیا تھا۔ کھڑکی میں بیٹھی راجکماری کی تصویر، چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کے ساتھ، گووند کی آنکھوں کے سامنے واضح اور مجسم ہو گئی۔ اور اُسے لگا جیسے وہی راجکماری چھپی ہوئی سطروں کی ان لکیروں کے پیچھے سے جھانک رہی ہے۔ اُس کے گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں سوکھ گئی ہیں، ہونٹ پپڑا گئے ہیں، چہرہ مرجھا گیا ہے اور ریشمی بال مکڑی کے جالے کی طرح لگتے ہیں، جیسے اُس کے پورے بدن سے ایک آواز نکلتی ہو: مجھے چھڑاؤ، مجھے چھڑاؤ!"

گووند کے دل میں اُس انجان راجکماری کو چھڑانے کے لیے کوئی جیسے رہ رہ کر کریدنے لگا۔ ایک آدھ بار تو اُسے بڑی زوردار طلب محسوس ہوئی کہ اپنے اندر رہ رہ کر کچھ کرنے کے جوش کو تخت اور کوٹھی کی دیوار کے بیچ کی دو فٹ چوڑی گلی میں گھوم گھوم کر دور کر دے۔

تو کیا سچ مچ کسی نے یہ سب اُسی کے لیے لکھا ہے؟ لیکن اُس نے تو کسی کو دیکھا تک نہیں۔ اگر وہ تصور میں کسی جوان لڑکی کا چہرہ لائے بھی تو وہ آخر کیسی ہو؟ کچھ اور بھی باتیں تھیں کہ وہ کسی کے روپ میں کسی سندر لڑکی کے چہرے کا تصور کرتے ڈرتا تھا۔ اُس کی ٹھیک شکل صورت اور عمر بھی تو نہیں معلوم تھی اُسے۔۔۔

گووند اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ سب اُسی کے لیے لکھا گیا ہے۔ یہ لائنیں کھینچ کر اُسی کو توجہ دلائی گئی ہے۔ پھر بھی وہ اِس غیر متوقع بات پر یقین نہیں کر پاتا تھا۔ وہ اپنے کو اِس لائق کبھی نہیں سمجھتا تھا کہ کوئی لڑکی اُسے اشارہ کرے۔ یوں شہروں کے بارے میں اُس نے بہت کچھ سن رکھا تھا، لیکن یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ گاؤں سے میٹرک پاس کر کے شہر آنے کے ایک ہی ہفتے میں ایک ایسی خوش نصیبی اُس کے سامنے آ جائے گی۔

وہ جب جب اِن سطروں کو پڑھتا، تب تب اُس کا سر اِس طرح چکرانے لگتا جیسے کسی دل سرد مکان کے پیچھے جھانک رہا ہو۔ جب اُس نے پہلے پہل یہ سطریں دیکھی تھیں تو اِس طرح اُچھل پڑا تھا جیسے ہاتھ میں انگارہ آ گیا ہو۔

بات یہ ہوئی کہ وہ بیٹھک والے ہال میں بیٹھوں کے تخت جیسے بنے چبوترے پر بڑی پرانی کاٹھ کی صندوقچی کے اوپر رجسٹر کھولے دن بھر کا حساب ملا رہا تھا۔ تبھی لالہ روپارام کا سب سے چھوٹا، نو دس سال کا بیٹا رام سروپ اُس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ یہ لڑکا ایک پچھلے پرانے چیسٹر کی اچکن جو یقیناً کسی بڑے بھائی کے چیسٹر کو کتر کر سلوائی گئی ہوگی، جیبوں میں دونوں ہاتھ ٹھونسے پاس کھڑا ہو کر اُسے دیکھنے لگا۔

گووند جب پہلے ہی دن آیا تھا اور حساب کر رہا تھا، تبھی یہ لڑکا بھی آ کھڑا ہوا تھا۔ اُس دن لالہ روپارام بھی تھے۔ شاید صرف یہ دکھانے کے لیے کہ وہ اِن کے سپوت میں بھی کافی دل چسپی رکھتا ہے، اُس نے اِس سے روٹین کے مطابق نام، عمر اور اسکول کلاس وغیرہ پوچھے تھے۔ نام رام سروپ، عمر نو سال، چونگی پر کے ہی اسکول میں چوتھی کلاس میں پڑھتا تھا۔ پھر تو صبح شام گووند کے چیسٹر کے سامنے ہی سے جاتے

Scanned with CamScanner

لالہ شکل دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی۔ چسٹر کے نیچے نیکر پہنے ہونے کے سبب اُس کی پتلی ٹانگیں کھلی رہتیں اور وہ پیروں میں سخت پرانے کرمچ کے جوتے پہنے رہتا جن کی پھٹی نکلی زبانوں کو دیکھ کر اسے ہمیشہ دُم کٹے کتے کی پونچھ کا خیال آجاتا تھا۔

کچھ دیر اس کا لکھا تاکتے رہ کر لڑکے نے چسٹر کے بٹنوں کے کساؤ اور قمیص کے بیچ میں رکھا سادہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا اور بولا: "منشی جی، لکشمی دیدی نے کہا ہے، ہمیں کچھ اور پڑھنے کو دیجیے۔"

"اچھا، کل دیں گے،" دل ہی دل میں ہنس کر اس نے کہا۔

یہاں آکر اسے جو منشی جی کا سا خطاب ملا، اُسے سن کر اسے ہنسی آتی ہوتی۔ منشی نام کے ساتھ جو ایک کان پر قلم لگائے، گول میلی ٹوپی اور پرانا کوٹ پہنے، بڑے ترٹے آدمی کی تصویر سامنے آتی ہے، اُسے بیس بائیس سال کا نوجوان خود سے سنبھال نہ پاتا۔

لالہ روپارام اُسی کے گاؤں کے ہیں۔ شاید اُس کے پتا نے ساتھ دو ہی مدت پڑھے بھی تھے۔ شہر آتے ہی اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر پڑھائی چلا سکنے کے لیے کوئی ٹیوشن یا چھوٹا موٹا پارٹ ٹائم کام حاصل کرنے کی غرض سے جب وہ لالہ روپارام سے ملا تو انھوں نے انتہائی گرم جوشی سے اس کے مرحوم باپ کو یاد کر کے کہا: "بھیا، تم تو اپنے ہی بچے ہو۔ ذرا ہماری چکی کا حساب کتاب گھنٹے آدھ گھنٹے دیکھ لیا کرو، اور مزے سے چکی کے پاس جو کوٹھری ہے اس میں پڑے رہو۔ پڑھنا پڑھو۔ آٹے کی تو یہاں کمی ہے ہی نہیں۔" اور جب وہ احسان مندی سے گدگد ان کی کوٹھری میں آگیا تو پہلی رات حساب لکھنے کا طریقہ سمجھاتے ہوئے لالہ روپارام، موتیابند والے چشمے کے موٹے شیشوں کے پیچھے سے مور پنکھ کے چندوے جیسی دکھتی آنکھوں اور موٹے ہونٹوں سے مسکراتے ہوئے، اس کی توقیر بڑھانے کو منشی جی کہہ بیٹھے تو وہ چونک گیا۔ لیکن اس نے تہیہ کر لیا کہ یہاں جم جانے کے بعد سختی سے اس لفظ کی مذمت کرے گا۔ رام سروپ سے منشی جی کا خطاب سن کر اس کی بھنویں تن گئیں، اسی لیے اس نے رکھائی سے جواب دیا تھا۔

"کل ضرور دیجیے گا،" رام سروپ نے تاکید کی۔

"ہاں بھائی، ضرور دوں گا،" اس نے دانت پیس کر کہنا چاہا، لیکن چپ ہی رہا۔ لکشمی کا نام وہ اکثر سنتا تھا۔ حالاں کہ اس کی کوٹھری سڑک کی طرف الگ سی پڑتی تھی، لیکن اس میں پیچھے کی طرف جو ایک چھوٹا سا جالی دار روشن دان تھا، وہ گھر کے اندر نیچے کی منزل کے صحن میں کھلتا تھا۔ لالہ روپارام کا کنبہ اوپر کی منزل میں رہتا تھا اور نیچے سامنے کی طرف چکی تھی۔ پیچھے کی طرف گیہوں کا اسٹور روم تھا۔ اس لکشمی نام کے واسطے اسے اس لیے بھی بہت تجسس اور دلچسپی تھی کہ جانے کوٹھری میں ہو یا باہر چکی کے ہال میں، ہر پانچویں منٹ اس کا نام مختلف طریقوں سے سنائی دے جاتا تھا۔ "لکشمی بیوی نے پوچھا ہے، روپے لکشمی بیوی کے پاس ہیں، چابی لکشمی بیوی کو دے دینا --- اور اس کے جواب میں جو ایک باریک، تیکھی سی پُراعتماد آواز سنائی دیتی تھی اسے وہ خوب پہچاننے لگا تھا۔ اُس نے اندازے سے سمجھ

Scanned with CamScanner

لیا تھا کہ یہی لکشمی کی آواز ہے۔ لیکن وہ خود کیسی ہے؟ اس کی ایک جھلک بھر دیکھ پانے کو اس کا دل کسی کسی بری طرح تڑپ سا اٹھتا۔ لیکن پہلے کچھ دن اسے اپنا اثر جمانا تھا، اس لیے وہ آنکھ اٹھا کر بھی اندر دیکھنے کی کوشش نہ کرتا۔ دل ہی دل میں اس نے سمجھ لیا کہ یہ لکشمی کافی اہم ہستی ہے۔ دقت یہ تھی کہ اندر کچھ دکھائی ہی تو نہیں دیتا تھا۔ سڑک کے کنارے تین چار دروازوں والی اس بلڈنگ کے ہال کے بعد ایک آٹھ دس فٹ لمبی گلی تھی، تب پھر اندر صحن تھا۔ پہلی منزل کافی اونچی اور مضبوط تھی اور صحن کے اوپر لوہے کا جال پڑا ہوا تھا۔ اس پر سے اوپر کی منزل کے لوگ جب گزرتے تھے تو لوہے کی جھنجھناہٹ سے، پہلے تو اس کا دھیان ہر بار ادھر چلا جاتا تھا۔ کبھی کبھی بچے اچھل اچھل کر اس پر کودنے لگتے تھے۔ یہاں سے جب تک کسی سامنے سے پوری گلی پار نہ کی جائے، کچھ بھی نظر آنا ناممکن تھا۔ چونکہ غسل خانہ اور نل وغیرہ اسی صحن میں تھے، اس لیے ادھر سے بچے اکثر کھیلتے اور جھگڑتے تھے، اس لیے صبح صحن میں جاتے ہوئے وہ سیدھے لڑکے کی طرف نگاہیں کیے ہوئے ہی اوپر کے حالات جاننے کی کوشش کرتا تھا۔ سر اٹھا کر اوپر دیکھ پانے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ ایک دن اس نے اپنی کوٹھری کا واحد دروازہ بند کر کے تخت پر چڑھ کر کھڑکی کے جالوں اور دھبوں سے بھرے جالی دار روشن دان سے جھانک کر بھی اوپر کے حالات جاننے کی کوشش کی تھی، لیکن یہ کمبخت جالی کچھ ایسے ڈھنگ سے لگی تھی کہ اس کے فوکس میں سامنے والا پورا چھجا اور ایک آدھ فٹ لوہے کا جال ہی آ پاتا تھا۔ وہاں کئی بار اسے لگا جیسے وہ چھوٹے چھوٹے تلوے گزرے۔ بہت کوشش کرنے پر بھی دیکھے۔۔۔ ہاں، یہ تو کسی لڑکی کے پیر ہیں، کیوں کہ ساتھ میں دھوتی کا کنارا بھی ہلکا سا۔۔۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور تخت سے اترتے ہوئے بڑے اداکارانہ انداز میں چھاتی پر ہاتھ مار کر کہہ دیا۔ ہائے لکشمی ظالم، ایک جھلک تو دکھا دیتی!

"منشی جی، تم تو دیکھو ہی سے ہو۔ لکھتے کیوں نہیں؟" رام سروپ نے جب دیکھا کہ گوبند سوداگر کا بیٹا سر دونوں ہاتھوں پر آہستہ آہستہ ہلاتے ہوئے، پلکیں جھپکاتے بیٹھا، حساب کی کاپی میں کچھ گھور رہا ہے، تو پتا نہیں کیسے یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ وہ جو کچھ سوچ رہا ہے اس کا تعلق سامنے رکھے حساب سے نہیں ہے۔

اس نے چونک کر لڑکے کی طرف دیکھا اور چوری پکڑی جانے پر جھینپ کر مسکرا دیا۔ تبھی اچانک ایک بات اس کے دماغ میں کوند گئی۔ یہ لکشمی رام سروپ کی بہن ہی تو ہے۔ ضرور اس کا چہرہ اس سے کافی ملتا جلتا ہو گا۔ اس بار اس نے دھیان سے رام سروپ کا چہرہ دیکھا کہ سندر ہے یا نہیں۔ پھر اپنی بے وقوفی پر مسکرا کر ایک انگڑائی لی۔ چاروں طرف ڈھیلے ہوتے ہوئے جسم کو پھر سے کس لیا اور غیر متوقع چہرے سے بولا: اچھا بس، کل دیکھیں گے۔ اس کی خواہش ہوئی کہ لکشمی کے بارے میں کچھ بات کرے، لیکن سامنے ہی چچا لیٹے اور دوسرے لوگ کام کر رہے تھے۔

اصل میں آج وہ تھک بھی گیا تھا۔ اس نے چونک کر لڑکے کو جواب دیا اور جلدی جلدی حساب کرنے لگا۔ دیا ... کی سفارشوں کے بعد اس کا نام کالج کے نوٹس بورڈ پر آ گیا تھا کہ وہ سے لیے گئے ٹیوشن

میں سے ہے۔ آتے وقت وہ کچھ کتابیں اور کاپیاں بھی خرید لایا تھا، سو آج چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اپنی کوٹھری میں جا بیٹھے اور کچھ آگے پیچھے کی باتیں ۔۔ دنیا بھر کی باتیں ۔۔ سوچتا ہوا سو جائے۔ سوچے، لکشمی کون ہے، کیسی ہے؟ وہ اس کے بارے میں کس سے پوچھے؟ کوئی اس کا ہم عمر اور بھروسے کا آدمی بھی تو نہیں ہے۔ کسی سے پوچھے اور لالہ روپارام کو پتا چل جائے تو؟ لیکن ابھی تیسرا ہی تو دن ہے۔ وہ دل ہی دل میں اپنے پاس رکھے ہوئے رسالوں اور کہانیوں کی کتابوں کی گنتی کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ اس بار اسے کون سی دینی ہے۔ آگے چل کر، جب کافی دن ہو جائیں گے، تو وہ چپ چاپ اس میں ایک ایسا چھوٹا سا خط رکھ دے گا جو کسی دوست کے نام لکھا گیا ہو گا یا اس کی زبان ایسی ہو گی کہ پکڑ میں نہ آ سکے۔ بھول سے چلا گیا، پکڑے جانے پر وہ آسانی سے کہہ سکے گا، اسے تو دھیان بھی نہیں تھا کہ وہ پرچا اس میں رکھا ہے! کیسی جواب ہیں۔ اپنے چالاک سے موقولی کے خیالوں پر وہ مسکرانے لگا۔

جس کے بارے میں وہ اتنا سب سوچتا ہے، یہ اسی لکشمی کے پاس سے آیا ہوا رسالہ ہے۔ اس نے اسے اپنے کومل ہاتھوں سے چھوا ہو گا۔ تکیے کے نیچے، سرہانے بھی یہ رہا ہو گا۔ لیٹ کر پڑھتے ہوئے ہو سکتا ہے سوچتے سوچتے چھاتی پر رکھ کر یہی سو گئی ہو۔۔۔ اور اس کا تن من گدگدا اٹھا۔ کیا لکشمی اس کے بارے میں بالکل ہی۔ سوچتی ہو گی؟ حساب لکھنے کی مصروفیت میں بھی اس نے گردن موڑ کر ایک ہاتھ سے رسالے کے ورق پلٹنے شروع کر دیے اور ایک مڑے ہوئے ورق پر اچانک اس کا ہاتھ ٹھٹھک گیا۔ یہ کس نے موڑا ہے؟ ایک منٹ میں ہزاروں باتیں اس کے دماغ میں چکر لگا گئیں۔ اس نے رسالہ اٹھا کر حساب کی کاپی پر رکھ لیا۔ مڑا ہوا ورق پورا کھلا تھا۔ چھپے ہوئے صفحے پر جگہ جگہ نیلی روشنائی کے نشان دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ یہ کس نے لگائے ہیں؟ اسے خوب اچھی طرح دھیان ہے، یہ پہلے نہیں تھے۔

"میں تمھیں جان سے بڑھ کر پیار کرتی ہوں۔۔۔" اس نے ایک نیلی لائن کے اوپر پڑھا

"ارے، یہ کیا چکر ہے؟" وہ ایک دم جیسے بوکھلا اٹھا۔ اس نے فوراً ہی سامنے بیٹھے مستری سلیم اور دلاور سنگھ کو دیکھا۔ وہ اپنے کام میں مصروف تھے۔ اس کی نگاہ اپنے آپ دوسری لائن پر پھسل گئی۔

"مجھے یہاں سے بھگا لے چلو۔۔۔"

"ارے!"

"میں پھانسی لگا کر مر جاؤں گی۔۔۔"

اور گو وہ اتنا گھبرا گیا کہ اس نے پھٹ سے رسالہ بند کر دیا۔ شک بھری نظروں سے ادھر ادھر دیکھا ۔۔ کسی نے تاڑ تو نہیں لیا۔ اس کے ماتھے پر پسینا ابھر آیا اور دل چکی کی موٹر کی طرح چلنے لگا۔ رسالے کے انھیں صفحوں کے بیچ میں انگلی رکھے رکھے اس نے اسے گھٹنے کے نیچے چھپا لیا۔ کہیں دور سے رنگین کور کی تصویر دیکھ کر یہ کم بخت چوکیدار ہی نہ مانگ بیٹھے۔ ان سطروں کو ایک بار پھر دیکھنے کی اس کے دل میں شدید خواہش ہو رہی تھی، لیکن جیسے ہمت نہ پڑتی تھی۔ کیا سچ مچ یہ نشان لکشمی ہی نے لگائے ہیں؟ انھیں کسی نے مذاق تو نہیں کیا؟ لیکن مذاق اس سے کون کرے گا، کیوں کرے گا؟ ایسا کوئی اس کا وقت ہی تو

نہیں ہے یہاں کہ تین ہی دن میں یہی حقیقت کر ڈالے۔

اُس نے پھر رسالہ نکال کر پورا اُلٹ پلٹ ڈالا۔ نہیں نشان ابھی ہے، بس۔ وہ ان تینوں سطروں کو پھر یک ساتھ پڑھ گیا اور اُسے ایسا لگا جیسے اُس کے دماغ میں ہوائی جہاز بھنا اٹھا ہو۔ گووند کا دماغ چکرا رہا تھا دل دھڑک رہا تھا، اور جو حساب وہ لکھ رہا تھا وہ تو جیسے ایک دم بھول گیا۔ اُس نے قلم کے پچھلے حصے سے کان کے اوپر کھجلایا، خوب آنکھیں گاڑ کر ان حرفوں کے ماخوں کو دیکھنے کی کوشش کی، لیکن اس کی نس نس میں سن سن کرتی کوئی چیز دوڑتی جا رہی تھی۔ اُسے لگا اس کا دل پھٹ جائے گا اور دماغ آتش بازی کے انار کی طرح پھٹ پڑے گا۔ اب وہ کس سے پوچھے، یہ سب نشان کس نے لگائے ہیں؟ کیا سچ مچ لکشمی نے؟

اس خوشی کی حقیقت پر یقین نہیں آتا۔ میں چاہے اُسے نہ دیکھ پایا ہوں، اُس نے تو ضرور مجھے دیکھا ہوگا۔ ارے یہ لڑکیاں بڑی تیز ہوتی ہیں۔ گووند کی خواہش ہوئی، اگر اُسے اس لمحے آئینہ مل جائے تو وہ لکشمی کی آنکھوں سے خود کو ایک بار دیکھے، کیسا لگتا ہے۔

لیکن یہ لکشمی ہے کون؟ بیوہ، کنواری، بیاہتا، مطلقہ، کیا؟ کتنی بڑی ہے؟ اس کی نس نس میں ایسی زبردست اینٹھن ہونے لگی کہ وہ ابھی اُٹھے اور دوڑ کر اندر کے آنگن کی سیڑھیوں سے دھڑا دھڑ چڑھتا ہوا اوپر جا پہنچے، لکشمی جہاں بھی، جس کمرے میں بھی بیٹھی ہو، اس کے دونوں کندھے جھنجھوڑ کر پوچھے: لکشمی، لکشمی، یہ سب تم نے لکھا ہے؟ تم نہیں جانتیں لکشمی، میں کتنا بدنصیب ہوں۔ میں قطعی اس خوش قسمتی کے لائق نہیں ہوں۔ اور سچ مچ اس غیر متوقع خوش قسمتی سے گووند کا دل اس طرح پسیج اٹھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ڈوری سے لٹکے بلب کو پلک جھپکائے بغیر دیکھتا ہوا وہ ماضی اور مستقبل کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔ پھر اس نے دھیرے سے اپنی کوروں میں بھرے آنسوؤں کو انگلیوں پر لے کر اس طرح جھٹک دیا جیسے دیوتا پر جل چڑھا رہا ہو۔ اُس کا ڈھیلا پڑا ہاتھ اب بھی رسالے کے ورق کو پکڑے ہوئے تھا۔

اُس نے ایک بار پھر اُن سطروں کو دیکھا۔ مان لو لکشمی اس کے ساتھ بھاگ چلے۔ کہاں جائیں گے وہ؟ کیسے رہیں گے؟ اس کی پڑھائی کا کیا ہوگا؟ بعد میں پکڑے گئے تو؟

لیکن آخر یہ لکشمی ہے کون؟

لکشمی کے بارے میں سوالوں کا ایک جھنڈ اس کے دماغ پر ٹوٹ پڑا، جیسے شکاری کتوں کا ہانکا کھول دیا گیا ہو۔ یا سر پر کوئی ہتھوڑے سے تیز تیز لگا رہا ہو، بڑی بے رحمی اور کٹھورپن سے۔ جیسے چھت پر سے اچانک گر پڑنے والے آدمی کے سامنے ساری دنیا ایک جھٹکے کے ساتھ لمحے میں چکر لگا جاتی ہے، اسی طرح اس کے سامنے سیکڑوں ہزاروں چیزیں ایک ساتھ چمک کر غائب ہو گئیں۔

اینٹوں کے اوپر، چوکور، تخت نما چبوترے پر چھوٹی سی پرانی صندوقچی کے آگے بیٹھا گووند حساب کر رہا تھا۔ ور حساب نہ ملنے کی وجہ سے جو کچھ بورے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے، وہ سب یوں ہی بکھرے رہے۔ اس نے کھلے ہوئے لیجر رجسٹر پر دونوں کہنیاں ٹکا دیں اور دونوں ہتھیلیوں سے آنکھیں بند

Scanned with CamScanner

کرتیں۔ کنپٹی کے پاس کی نسیں کھنچ رہی تھیں۔ ایسا تو کبھی دیکھا سنا نہیں، فلموں ناولوں میں بھی نہیں دیکھا پڑھا۔ سچ مچ ان نشانوں کا کیا مطلب ہے؟ کیا لکشمی جی نے یہ لائنیں کھینچی ہیں؟ ہو سکتا ہے کسی بچے نے کھینچ دی ہوں۔۔۔ اس امکان سے تھوڑا چونک کر گووند نے پھر ورق کھولا۔۔ نہیں، بچہ کیا صرف انہیں سطروں کے نیچے نشان لگاتا؟ اور لکیریں اتنی پختہ اور سیدھی ہیں کہ کسی بچے کی ہو ہی نہیں سکتیں۔ کسی نے اُسے بلاوجہ پریشان کرنے کو تو نشان نہیں لگا دیے؟ ہو سکتا ہے وہ لکشمی بہت چنچل یار ہو اور ڈرانے جھانسے کو اُسی نے یہ سب کیا ہو۔۔۔

گووند اس طرح آنکھیں بند کیے سوچ رہا تھا، لیکن اندر سے ڈر رہا تھا کہ مستری اور چوکیدار اُسے دیکھ کر کچھ سمجھ نہ جائیں۔ سب سے بڑا ڈر اُسے لالہ روپا رام کا تھا۔ ابھی روئی بھری، شکرپاروں والی سلائی کی، میلی سی، پوری باہنوں کی مرزئی پہنے اور اُس پر میلی چیکٹ بنگوں بڑی سی مٹی لپیٹے، دھیرے دھیرے ہانپتے ہوئے، بینت ٹیکتے، بڑی دقت سے سیڑھیاں اُتر کر وہ آ پہنچیں گے۔

اچانک بینت کی کھٹ کھٹ سے چونک کر اُس نے جو آنکھوں کے آگے سے ہاتھ ہٹایا تو دیکھا، سچ مچ لالہ روپا رام ہی چلے آ رہے ہیں۔ ارے کم بخت، یاد کرتے ہی آ پہنچا! بیٹھے ہوئے دیکھ تو نہیں لیا؟ اُس نے جھٹ رسالے کو گھٹنوں کے نیچے زور سے سرکا دیا اور سامنے پھیلے پرزوں پر آنکھیں جما کر مصروف ہو گیا۔ مستری اور چوکیدار کی کھسر پھسر بھی بند ہو گئی۔ گلی پار کر کے لالہ روپا رام اندر داخل ہوئے۔

موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے سے اُن کی آنکھیں بڑی ہو کر خوفناک دکھتی تھیں۔ آنکھوں اور پلکوں کا رنگ مل کر ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے پچکے ہوئے مور پنکھ کے چندوے لگے ہوں۔ سر پر روئی بھری کنٹوپ تھی۔ کانوں کو ڈھکنے والے، موٹر کے مڈگارڈ جیسے اس کے کونے سب اوپر کو اٹھے ہوئے تھے اور قدیم راکششوں کے سینگوں کا منظر پیش کر رہے تھے۔ چہرہ اُن کا جھریوں بھرا تھا اور چشمے کا ایک بازو کان کے اوپر سے ٹوٹ گیا تھا۔ اُسے انھوں نے ڈور لپیٹ کر مضبوط کر لیا تھا۔ دانت اُن کے نقلی تھے، اور شاید ڈھیلے بھی تھے کیوں کہ وہ انہیں ہمیشہ اس طرح سڑ سڑ چلا چلا کر پیچھے سرکائے رکھتے تھے جیسے چیونگم کھا رہے ہوں۔ گووند کو اُن کے اس سڑ سڑ چلانے اور منہ سے نکلتی طرح طرح کی آوازوں سے بڑی اُبکائی آتی تھی، اور جب وہ اُس سے بات کرتے تو وہ بڑے جتن کر کے اپنا دھیان اس طرف سے ہٹائے رکھتا۔ لالہ روپا رام کی گردن ہمیشہ اس طرح ہلتی رہتی جیسے کھلونے والے گڈے کی گردن کا اسپرنگ ڈھیلا ہو گیا ہو۔ گھٹنوں تک میلی کچیلی دھوتی اور ملٹری کے کباڑی بازار سے لائی گئی موزوں پر باندھنے کی پٹیاں، جو شاید انہیں جوڑوں کے درد سے بھی بچاتی تھیں۔ بن فیتوں کے، کیلیں نکالے، پھٹے پرانے بوٹ، جنہیں دیکھ کر ہمیشہ گووند کو لگتا کہ اس آدمی کا آخری وقت قریب آ گیا ہے۔

جب لالہ روپا رام پاس آ گئے تو اُس نے اُن کے اعزاز میں چہرے پر چکنائی والی مسکراہٹ لا کر اُن کی طرف دیکھتے ہوئے سواگت کیا۔ اینٹوں کے چبوترے پر لٹک جنگ دو سو سیاہی کے داغوں اور چھیدوں والی دری پر رام سروپ کے اُن سے سٹ کر کھڑے ہونے سے ایک موٹی سی سلوٹ پڑ گئی تھی، اُسے، ہاتھ سے

ٹھیک کر کے اُس نے کہا: "لالہ جی، یہاں بیٹھیے۔"

لالہ جی نے ہانپتے ہوئے بولے بغیر ہی اشارہ کر دیا کہ نہیں، وہ یہیں ٹھیک ہیں، اور وہ ٹین کی کرسی پر اُس کی طرف منھ کر کے بیٹھ گئے اور ہانپتے رہے۔ اصل میں انھیں سانس کی بیماری تھی اور وہ ہر وقت پیاسے کتّے کی طرح ہانپتے رہتے تھے۔

اُن کے یہاں آ بیٹھنے سے ایک بار تو گووند کانپ اٹھا۔ کہیں گربخت کو پتا تو نہیں لگ گیا، کہیں کچھ پوچھنے نہ آیا ہو۔ حالاں کہ لالہ روپا رام اِس وقت کھانا کھا کر ایک بار چکّر ضرور لگاتے تھے لیکن اُسے یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو بڈھا تاڑ گیا ہے۔ اُس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ لالہ روپا رام ویسے ہی ہانپ رہے تھے۔ گووند سر جھکائے چپ چاپ جوڑتا رہا۔ آخر صورتِ حال کو سنبھالنے کی غرض سے وہ بولا: "لالہ جی، آج میرا نام آ گیا کالج میں۔"

"چپ!" لالہ جی نے کھانسی کے بیچ میں کہا۔ وہ ایک ہاتھ سے ڈنڈے کو زمین پر ٹیکے ہوئے تھے، دوسرے ہاتھ میں کلائی تک گوکھی (مالا جپنے کی تھیلی) پہنی تھی جس کے اندر انگلیاں چلا چلا کر وہ مالا گھما رہے تھے اور اُن کا وہ ہاتھ ٹنڈا سا لگ رہا تھا۔

اُن کا جو جملہ پورا ہوتا ہی چاہتا تھا کہ ایک دھماکا ہو گیا۔

اُنھوں نے سانس کشی کر کے کچھ بولنے کو منھ کھولا ہی تھا کہ اندر آنگن کا ٹھر (لوہے کا جال) جھن سے آواز میں سمجھ آئی جیسے کوئی بہت بھاری چیز اوپر سے پھینک دی گئی ہو، اور پھر زور سے کسی ہوئی کچھی جیسی چیز آ گری، اُس کے پیچھے چمٹا، سنڑسی۔۔۔ اور پھر تو اُسے ایسا لگا جیسے کوئی بالٹی، کڑھائی، توا وغیرہ نکال نکال کر جان پر پھینک رہا ہے اور پانی اور چھوٹی موٹی چیزیں بچھ رہی ہیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ اندر کچھ ایسا ہنگامہ اور کہرام سنائی دیا جیسے آگ لگ گئی ہو۔

گووند جھٹکے کے ساتھ سیدھا ہو گیا۔ کہیں سچ مچ آگ وگ تو نہیں لگ گئی؟ اُس نے چونک کر سوالیہ نظروں سے لالہ جی کی طرف دیکھا اور حیرت سے گنگ رہ گیا۔ لالہ جی پریشان تو ضرور دکھائی دیتے تھے لیکن ایسی کوئی بات اُن کے چہرے پر نہیں تھی کہ کوئی بڑا حادثہ ہو گیا ہے اور انھیں دوڑ کر جانا چاہیے۔ مستری اور چوکیدار دونوں دبے دبے طنز کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھتے اور مسکراتے ہوئے لالہ جی کی طرف نگاہیں پھینک رہے تھے۔ کسی کو کوئی خاص فکر نہیں تھی۔ اندر ہنگامہ بڑھ رہا تھا، چیزیں پھینکی جا رہی تھیں اور برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ اور جھنجھناہٹ گونجتی جا رہی تھی۔ آخر یہ کیا ہو رہا ہے؟ تجسّس سے اُس کی پسلیاں تڑخنے کو آنے لگیں۔ وہ لالہ جی سے پوچھنے ہی والا تھا کہ یہ سب کیا ہے، تبھی بڑی کوشش سے ہاتھ کی لاٹھی پر سارا زور دے کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے، اور گھسٹتے ہوئے سے جدھر سے آئے تھے اُسی گلی میں چلے گئے۔ جاتے ہوئے پلٹ کر انھوں نے دھیرے سے کواڑ بند کر دیے۔ مستری اور چوکیدار نے سکون کا سانس لے کر بدن ڈھیلا کیا، ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھا، کھنکھارا اور پھر ایک بار کھل کر مسکرائے۔ لالہ جی کا پیچھا کرتی گووند کی نگاہ اب اُن دونوں کی طرف مڑ گئی اور اب اُس سے رہا نہیں گیا۔ وہ

کھڑا ہو گیا۔ اُس نے مرغے کے پروں کی طرح کمبل کو بانسوں پر پھڑپھڑا کر لپیٹا اور اُس رسالے کو دیکھتا ہوا چبوترے سے نیچے اُتر آیا۔ تھوڑی دیر یوں ہی اُدھیڑبن میں کھڑا رہا، پھر اُس گلی کے دروازے تک گیا کہ کچھ سنائی دے۔ شور و غل میں چار پانچ آوازیں کواڑ کی جھری میں سے گھٹی گھٹی سنائی دیں اور ان میں سب سے تیز آواز وہی تھی جسے وہ لکشمی کی آواز سمجھتا تھا۔ ہے بھگوان، کیا ہو گیا؟ کہیں سے کوئی گر پڑا، آگ لگ گئی، سانپ بچھو نے کاٹ لیا؟ لیکن جس طرح وہ لوگ بیٹھے دیکھ رہے تھے، اس سے تو ایسا لگتا تھا جیسے یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ کم بخت کواڑ کیوں بند کر گیا؟ اس وقت لوہے کا جال اس طرح گھما گھم بج رہا تھا جیسے کوئی اس پر تانڈو نرت کر رہا ہو۔ اُسی اونچی، چیختی مہین آواز میں وہ ناری کنٹھ جسے وہ لکشمی کی آواز سمجھتا تھا، اتنا تیز اور زور سے بول رہا تھا کہ لاکھ کوشش کرنے پر بھی وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔

"پریشان کیوں ہو رہے ہو بابوجی؟" چوکیدار کی آواز سن کر وہ ایک دم سیدھا کھڑا ہو گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا: "آج چنڈی آ رہی ہے!" اُس کی اس بات پر مستری ہنسا۔

گووند بُری طرح جھنجھلا اٹھا۔ کوئی اتنا بڑا حادثہ ہو رہا ہے اور یہ بدمعاش یوں مزے لوٹ رہے ہیں! پھر بھی بے حد فکرمند اور متجسس سا اُدھر مڑا۔

اس بڑے کمرے یا ہال میں ہر چیز پر آٹے کا مہین پاؤڈر چھایا ہوا تھا۔ ایک طرف آٹے والی چکی کالے پتھر کے ننھے ہاتھی کی طرح چپ چاپ کھڑی تھی اور اُس کا پسے آٹے کو سنبھالنے والا غلاف سونڈ کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ اُسی کی سیدھ میں دوسری دیوار کے نیچے موٹر لگی تھی جہاں سے ایک چوڑا پٹا چکی کو چلاتا تھا۔ اتنے حصے میں حفاظت کے لیے ایک ریلنگ لگا دی گئی تھی۔ سامنے کی دیوار میں چپکے، لمبے چوڑے ٹین کے چوکور تختے پر ایک کھوپڑی اور دو ہڈیوں کے نیچے "خطرہ" اور "ڈینجر" کے الفاظ لکھے تھے۔ اس چبوترے کی بغل میں چھت سے آتی زنجیر میں ایک بڑی لوہے کی ترازو کتنی کلی کی مدد میں ایک بانس وہیں لٹکی ہوئی تھی، جیوں کہ دوسرے پلڑے میں من سے لے کر چھٹانک تک کے باٹوں کا ڈھیر لگا تھا۔ لالہ روپ رام اکثر چوکیدار کو ڈانٹتے تھے کہ رات میں اُتار کر رکھ دیا کر لیکن کسی کسی دن آدھی رات تک چکی چلتی اور دکان دفتر والے صبح پانچ بجے سے پھر آنے لگتے؛ اس وقت برف جیسی ٹھنڈی ترازو کو چھونا دلاور سنگھ کو زیادہ پسند نہیں تھا۔ وہ اسے یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ لڑائی میں صبح ہی صبح ٹھنڈی بندوقیں لے کر کافی مارچ اور پریڈ کر لی، اب کیا زندگی بھر ٹھنڈا لوہا چھونا ہی اس کی قسمت میں بدا ہے؟ اس لیے وہ ترازو کو لٹکا ہی رہنے دیتا، حالاں کہ ٹھیک بیچ میں ہونے کی وجہ سے وہ جب بھی دروازہ کھولنے اٹھتا تو خود ہی اس سے ٹکراتا، بکتا اور رات کی تنہائی میں فوجی گالیوں کی مستقبلیہ تقریر کرتا۔ پرانا کیلنڈر، ایک طرف پسائی کے لیے بھرا اناج یا پسے آٹے کے بورے، کنستر اور پوٹلیاں، اور اوپر چڑھ کر اناج ڈالنے کا مضبوط سا اسٹول۔ اس وقت دونوں ٹانگیں، جن میں کیل دار فل بوٹ ڈٹے ہوئے تھے، زمین پر پھیلائے مزے میں کھاٹ کی پٹی پر جھکا بیٹھا پٹا پر مار، یعنی لڑائی سے سپاہی بننے کی یادگار، گریٹ کوٹ چاروں طرف لپیٹے شان سے بیڑی پھونک رہا تھا اور سامنے بیٹھے مستری سلیم سے آہستہ آہستہ باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

اس کے اور مستری سلیم کے بیچ میں ایک انگیٹھی جل رہی تھی۔ جب کبھی دھیان آجاتا تو پاس رکھے کوئلے لکڑی کچھ ڈال دیتا اور کبھی کبھی شدت بے دلی سے ہاتھ یا پاؤں اس سمت بڑھا کر گرمی لیتا۔ سلیم سر جھکائے، پانی کی بالٹی میں ٹیوب ڈبو ڈبو کر ان کے پنکچر دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس کے آس پاس دس بارہ کالے لال ٹیوب، ربر کی کترنیں، قینچی، رینچ، پانے، سلوشن، چمڑے کی پیٹی اور ایک طرف دیوار سے لگے دس بارہ سائیکل کے پہیوں کا ڈھیر تھا۔ اپنے اس سامان سے اس نے آدھے سے زیادہ گھر گھیر رکھا تھا۔

جب گووند اس کے پاس آیا تو وہ سر جھکائے جھکائے ہنستا ہوا ٹیوب کا پنکچر پکڑ کر کان میں لگی کاپی نما پنسل کو تھوک سے گیلا کر کرتے ہوئے (ادھر کہ ٹیوب بھیگا ہوا تھا اور سامنے بالٹی بھر پانی بھی رکھا تھا) نشان لگاتا ہوا جواب دے رہا تھا: "یہ کیا جمعدار صاحب سنے! لالہ کچھ ماموں ڈھیلا کرے تو اس کی لڑکی پر جن کا سایہ ہے، اس کا علاج تو ہم اپنے مولوی مدار الدین صاحب سے منٹوں میں کر دیں۔"

گووند کا ماتھا ٹھنکا۔ لالہ کی لڑکی پر کیا کوئی دیوی آتی ہے؟ اسے اپنے گاؤں کی ایک برہمنی بیوہ تارا کا ایک دم دھیان آیا۔ اس پر بھی جب دیوی آتی تھی تو وہ گھر بھر کے برتن اٹھا اٹھا کر پھینکتی تھی، سارا دن بیٹھے بیٹھے گاتی تھی، منہ سے جھاگ آنے لگتے تھے، گردن مروڑنے لگتی تھی، آنکھیں اور زبان باہر نکلنے لگتی تھی۔ کون لڑکی ہے لالہ کی؟ بکشی تو نہیں؟ بھگوان کرے بکشی نہ ہو! اس کا دل وسوسوں سے ڈوبنے سا لگا۔ اس نے سب سمجھ لیا تھا۔ وہ دور سے رونے کی ہلکی سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ شاید کسی کو دورہ دورہ سا پڑ گیا ہے، جبھی یہ لوگ اتنے بے فکر ہیں۔

گووند کو سنا کر چوکیدار بولا: "ناہوں! تم بھی یار کسی دن ہمارے بڈھے کا ہارٹ فیل کرواؤگے۔ اور بیٹا، اس جن کا علاج تمہارے مولوی کے پاس نہیں ہے، سمجھے؟ وہ تو ہوا ہی دوسری ہے۔ آؤ بابوجی، بیٹھو۔"

چوکیدار نے بیٹھے بیٹھے اسٹول کی طرف اشارہ کیا۔ اصل میں یہ گووند کو بابوجی تو ضرور کہتا تھا لیکن اس کی کوئی خاص عزت نہیں کرتا تھا۔ ایک تو گووند قصبے سے آیا تھا، دوسرے شہر میں چوکیداری کرتے کرتے مونچھیں سفید ہو گئی تھیں۔ دوسرے وہ فوج میں رہا تھا اور قاہرہ تک گھوم آیا تھا۔ علم، تجربہ، تہذیب، ہر کسی میں وہ خود کو گووند سے زیادہ ہی سمجھتا تھا، لیکن گووند کو اس وقت ان سب کا دھیان نہیں تھا۔ اس نے اسٹول سے ٹیک کر ذرا سہارا لیتے ہوئے فکرمند لہجے میں پوچھا: "کیوں بھئی، یہ شور گل کیا تھا؟ کیا ہو رہا تھا؟"

مستری نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور چوکیدار کی مسکراتی نظروں سے اس کی آنکھیں ملیں۔ اس نے بڑی گھنی مونچھوں پر ہتھیلی پھیرتے ہوئے کہا: "کچھ نہیں بابوجی، اوپر کسی بچے نے کوئی چیز گرا دی ہو گی۔"

مستری نے کہا، "جمعدار صاحب، جھوٹ کیوں بولتے ہو؟ صاف صاف کیوں نہیں بتا دیتے؟ اب

اِن سے کیا چھپا رہے گا؟"

"تو خود کیوں نہیں بتا دیتا؟" چوکیدار نے کہا، اور جیب سے بیڑی کا بنڈل نکال لیا۔ کاغذ کو نوچ کر آٹے کی لوئی بنانے کی طرح اُسے ڈھیلا کیا، پھر ایک بیڑی نکال کر مستری کی طرف پھینکی۔ دوسری کو دونوں طرف سے پھونکا اور جلانے کے لیے دہکتے کوئلے کی تلاش میں انگیٹھی میں نگاہیں گھماتے ہوئے ذرا مصروفیت کے ساتھ بات جاری رکھی: "تجھے کیا معلوم نہیں ہے؟"

اِن دونوں کی چہل سے گووند کی جھنجھلاہٹ بڑھ رہی تھی۔ اُسے لگا، ضرور کچھ دال میں کالا ہے جسے یہ لوگ ٹال رہے ہیں۔ مستری زبان نکالے پنکچر کی جگہ کو ریگ مال سے گھس رہا تھا۔ وہ جب بھی کوئی کام یکسوئی سے کرتا تھا تو اپنی زبان نکال کر اوپر کے ہونٹ کی طرف موڑ لیتا۔ اُس کی چندیا کے بیچ میں اُبھرتے گنج کو دیکھ کر گووند نے سوچ کر گنجاپن تو رئیسی کی نشانی ہے، مگر یہ کم بخت تو آدھی رات میں یہاں پنکچر جوڑ رہا ہے۔ اُس نے اُسی طرح گردن جھکائے جھکائے کہا: "اب میں بابوجی کو قصہ بتاؤں یا ان ٹیوبوں سے سر پھوڑوں؟ سالے سڑ کر ملوا تو ہو گئے ہیں پر بدلے گا نہیں۔ جو ہوتا ہے سب کو اکٹھا کر اس انگیٹھی میں رکھ دوں۔ سو کا صبح دیکھا جائے گا!"

"یہ اتنے ٹیوب میں کا ہے کے؟" ذرا اپنائیت جتانے کو گووند نے پوچھا۔ "حالت تو سچ مچ اِن کی بڑی خراب ہو رہی ہے۔"

"آپ کو نہیں معلوم؟" اِس بار مستری نے کام چھوڑ کر غور سے گووند کو دیکھا۔ "یہ آپ کے لالہ کے جو دو درجن رکشا چلتے ہیں، اُن کا کوڑا ہے۔ یہ تو ہوتا نہیں کہ اتنے رکشا ہیں، روز ٹوٹ پھوٹ مرمت ہوتی ہی رہتی ہے، ہمیشہ کے لیے لگا لے ایک مستری، دن بھر کی چھٹی ہوئی۔ سو تو ہو گا نہیں۔ ٹیوب تمام میرے سر ہیں اور باقی ٹوٹ پھوٹ مستری علی احمد ٹھیک کرتے ہیں۔" پھر اُس نے یوں ہی پوچھا: "آپ بابوجی، نئے آئے ہیں؟"

"ہاں، دو تین دن ہی تو ہوئے ہیں۔ میں یہاں پڑھنے آیا ہوں،" گووند نے کہا۔ اُس کے پیٹ میں کھلبلی مچ رہی تھی، لیکن وہ سیدھے سیدھے پوچھنے کا بہانہ کھوج رہا تھا۔

"تبھی تو!" مستری بولا۔ "تبھی تو آپ یہ سب پوچھ رہے ہیں۔ رات کو اِس کا حساب رکھتے ہیں نا؟ ہاں، تھوڑے دنوں میں اپنے فرزند کو بھی آپ سے پڑھوائے گا۔" "اپنے فرزند" کے لفظوں میں جو طنز اُس نے کیا تھا، اُس سے خود ہی مزہ لے کر مسکراتے ہوئے اس نے چوکیدار کی دی ہوئی بیڑی سلگائی۔

"اسے انہیں یہ سب کیا بتاتا ہے۔ وہ تو اس کے گاؤں ہی سے آئے ہیں۔ انہیں سب معلوم ہے،" چوکیدار بولا۔

"نہیں، سچ مجھے کچھ نہیں معلوم،" گووند نے ذرا یقین دہانی کے لہجے میں کہا۔ "ان لالہ کے تو پت ہی یہاں چلے آئے تھے نا، سو ہم لوگوں کو کچھ بھی نہیں معلوم۔ بتائیے نا، کیا بات ہے؟" وہ ذرا احترام اور خوشامد کے لہجے میں بولا۔

Scanned with CamScanner

"شاید اس کے تجسس اور بے قراری سے متاثر ہو کر مستری بولا: "جی کچھ نہیں، لالہ کی بڑی لڑکی ہو ہے بار اسے مرگی کا دورہ پڑتا ہے۔ کوئی کہتا ہے اُسے ہسٹیریا ہے، پر ہمارا تو خیال یہ ہے کہ بابو جی، وہ وہ وہ کچھ نہیں، اس پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔۔۔ اس بچاری کو تو کچھ ہوش رہتا نہیں۔"

"بیوہ ہے؟" جلدی سے بات کاٹ کر گووند دھک دھک کرتے دل سے پوچھ بیٹھا۔ "ہائے، کنواری ہی ہو!"

اس بار پھر دونوں کی نگاہوں کا آپس میں ٹکراؤ ہوا اور مستری اس سے چھپاتا رہا۔ بیڑی کے لمبے کش سے دھوئیں کو دبا کر کے چوکیدار بڑی سنجیدگی سے بولا: "ابھی اس نے اس کی شادی ہی کہاں کی ہے؟"

"نام کیا ہے؟" گووند سے نہ رہا گیا۔

"لکشمی۔"

"لکشمی؟" اس کے منہ سے نکل گیا اور جیسے یک دم اس کی ساری طاقت کسی نے کھینچ لی ہو۔ تجسس اور اشتعال سے تنا ہوا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔

چوکیدار نے اس بار ساری سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو، "اچھا، تم بھی جانتے ہو؟"

گووند کے دل میں خلش سی ہوئی، "اس کی عمر کیا ہے؟"

لیکن چوکیدار نے پوچھا، "تو کیا بچ بابو جی، آپ اس کے گھر کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے؟"

"نہیں تو، ابھی آپ نے بتایا تو، میں اس کے بارے میں کچھ بھی قطعی نہیں جانتا۔" ایک طرح کی خود سپردگی کے انداز سے گووند بولا۔

"لیکن لکشمی کا قصہ تو سارے شہر میں مشہور ہے،" چوکیدار بولا۔ "آپ شاید ابھی نئے آئے ہیں۔" پھر مستری کی طرف دیکھ کر بولا: "کیوں مستری صاحب، تو بابو جی کو قصہ سنا ہی دوں؟"

"ارے تو! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ اس میں چھپانا کیا! یہاں رہیں گے تو کبھی نہ کبھی جان ہی جائیں گے۔"

"اچھا تو پھر سنئے بابو جی، قصہ بھی کیا کہوں کہ۔۔۔" چوکیدار نے آمد میں آ کر کہنا شروع کیا۔ "آپ شاید جانتے ہیں، یہ ہمارا لالہ شہر کا مشہور کنجوس اور مشہور رئیس ہے۔۔۔"

"واقعی، جو کنجوسی ہم کا ہو، ویسی تو ہم نے کبھی دیکھی،" مستری بولا۔

"نہیں مستری صاحب، پورا قصہ سنا ہو تو بیچ میں مت ٹوکو،" چوکیدار اس مداخلت پر ناراض ہو گیا۔

"اچھا اچھا، سناؤ!" مستری بچوں کی طرح مسکرایا۔

"کہانی یہ نکلی ہے، شادی بیاہ کے دنوں میں اس پر دورے پڑتے تھے۔ ویسے بھی وہ ڈھائی سو گز تو گھر سے بستی ہے ور۔ نوکروں اور گاہکوں کو کچھ کھلانا پلانا لڑائی کے زمانے میں سے منڈی کے کچھ نیچے ملی ہی جانے ہے۔ آپ جانو، منڈی کا ٹھیا تو جس کے پاس آیا سو ساہو۔ آپ ان دنوں دیکھتے لکشمی

طوروں کے بنے۔ بورے یوں ٹھسے رہتے تھے جیسے مورچے کے لیے بالو بھر بھر کر رکھ دیے ہوں۔ اس میں اس نے خوب روپیا پیٹا۔ ملٹری کو گیہوں بیچ دی اونے پونے سے اور ردی والی خرید کر گودام پورا کیا۔ اس میں کھریا ملا دیا۔ پسائی کے الٹے سیدھے پیسے تو مارے ہی، بلیک، چار سو بیسی، چوری، کیا کیا اس نے نہیں کیا؟ اس کے علاوہ ایک ست بڑھی صابن کی فیکٹری اور کافی بڑا جوتوں کا کارخانہ بھی اس کا ہے۔ اسے اس کے بیٹے سنبھالتے ہیں۔ پچیس تیس رکشے اور پانچ موٹر ٹرک چلتے ہیں۔ دس بارہ سے زیادہ اس کے مکان ہیں جن کا کرایہ آتا ہے۔ روپے سود پر دیتا ہے۔ شاید گاؤں میں بھی کافی زمین اس نے لے رکھی ہے۔ ایک کام ہے سالے کا؟ بتاتا تو نہیں ہے، باقی اس کی اصل آمدنی تو کوئی بھی نہیں جانتا۔ کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہے۔ بھگوان ہی جانے! رات دن کسی نہ کسی تکڑم میں لگا ہی رہتا ہے۔ کروڑوں کا اسامی ہے۔ اور سب سے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ یہ سب صرف اسی پچیس چھبیس سال میں جمع کی ہوئی رقم ہے۔

چوکیدار دلاور سنگھ ملٹری میں رہ آنے کی وجہ سے خوب باتونی تھا اور مورچے کے اپنے افسروں کے قصے اور اپنی بہادری کے کارنامے خوب نمک مرچ لگا کر اتنی بار سنا چکا تھا کہ اسے کہانی سنانے کا عادی ہو گیا تھا۔ ہر بات کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ اس کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات بدلتے رہتے تھے۔

اس کی باتیں غور اور دلچسپی سے سنتے ہوئے بھی گووند کے دل سے ایک بات ٹکرائی: لکشمی کو دورے پڑتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے جو یہ نشان لگا رکھے ہیں یہ بھی دورے ہی کی حالت میں لگائے ہوں اور ان کا کوئی خاص گہرا مطلب نہ ہو؟ اس بات سے اسے کچھ بڑی مایوسی ہوئی، پھر بھی اس نے اوپر سے حیرت ظاہر کرتے ہوئے پوچھا: "صرف پچیس چھبیس سال؟"

نئی بیڑی جلاتے ہوئے چوکیدار نے زور زور سے سر ہلایا۔ گووند نے سوچا: اور لکشمی کی عمر کیا ہوگی؟

اور کنجوسی کی حد تو آپ نے دیکھ ہی لی ہوگی۔ بڈھا ہو گیا ہے، سانس کا روگ ہو رہا ہے، سارا بدن کانپتا ہے، لیکن ایک پیسے کا بھی فائدہ دیکھے گا تو دس میل دھوپ میں ہانپتا ہوا پیدل جائے گا۔ کیا مجال جو سواری کر لے! گرمی آئی تو پورا بدن ننگا، کمر میں دھوتی آدھی پہنے آدھی لپیٹے۔ جاڑا آیا تو وہی ڈریس۔ اس میں پچھلے دس سال سے تو میں دیکھ رہا ہوں۔ کبھی کسی مکان کی مرمت نہ کرانا، سفیدی صفائی نہ کرانا، اور ہمیشہ یہی دھیان رکھنا کہ کون کتنی بجلی خرچ کر رہا ہے، کہاں بے کار بتی یا پنکھا چل رہا ہے۔ لڑکا ہے سو اسے مفت کے چنگی سکول میں ڈال دیا ہے، لڑکی گھر پر بٹھا رکھی ہے۔ ایک ایک پیسے کے لیے کمیشنوں رکشا والوں ٹرک والوں سے لڑنا، بحثیں کرنا، اور چکی والوں کا ناک میں دم کیے رکھنا، انہیں دن رات یہ سکھانا کہ کس چالاکی سے آٹا بچایا جا سکتا ہے۔ بیسیوں روپے کا آٹا روز ہوٹل والوں کو بکتا ہے سو الگ۔ جس دن سے چکی کھلی ہے، گھر کے لیے تو آٹا بازار سے آیا ہی نہیں۔ آپ یقین کیجیے، کم سے کم بارہ سو روپے ماہوار کی آمدنی ہو گی اس کی، لیکن صورت دیکھیے، مکھیاں بھنکتی رہتی ہیں۔ کسی آنے جانے والے کے لیے ایک کرسی تک نہیں، پان سپاری کی بات تو الگ رہی۔ کون کہہ دے گا کہ یہ پیسے والا ہے؟ یہ عمر ہونے آئی، صبح سے شام تک بس پیسے کے پیچھے مارا مارا۔ دنیا کے کسی اور کام سے مطلب ہی نہیں۔ سب سوسائٹی

Scanned with CamScanner

ہو، مرتبان ہو، چٹنی ہو، کچھ ہو، لیکن لالہ روپا رام اپنی ہی دھن میں مست۔ نوکروں کو کم سے کم دینا پڑے، اس لیے خود ہی ان کے کام کو دیکھتا ہے۔ مجھ سے تو کچھ اس لیے نہیں کہتا کہ مجھ پر تھوڑا اعتبار ہے۔ دوسرے میری ضرورت سب سے بڑی ہے۔ لیکن ہاتھی بھر ہو کر روتا ہے اس کے نام کو۔ ورنہ یہ کہ سب جانتے ہیں یہ تنگی ہے۔ کوئی اس کی بات کو دھیان سے سنتا نہیں۔ بعد میں سب اس کا نقصان کرتے ہیں۔ کس پاس سے کسی سنتے ور گالیاں دیتے ہیں۔۔۔

بچے کتنے ہیں؟ چوکیدار کو اس کاروکی باتوں میں سکت دیکھ کر گووند نے سوال کیا۔

اسی بات پر آتا ہوں، چوکیدار خلوص سے بولا۔ سچ بابوجی، میں یہ دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ اس عمر تک تو اس نے یہ دولت جمع کی ہے، اب اس کا یہ کیا کرے گا کیا؟ لوگ جمع کرتے ہیں کہ بیٹھ کر آرام سے کھائیں۔ لیکن یہ کوشش تو جمع ہی کرنے میں لگا رہتا ہے۔ اسے جمع کرنے کی ایسی بات ہو گئی ہے، بنے تی ہے کہ دولت اس لیے جمع کی جاتی ہے، اس بات کو بچارا بالکل ہی بھول گیا ہے۔ یہ بڑے فکر نہ ور فلسفیانہ۔ گووند نے منہ سے آنے والی رکہ کو دیکھتے ہوئے کہا: اس عمر تک تو اسے جوڑنے کی ایسی ہوس ہے، اب یہ اس کا بھوگ کب کرے گا؟ سچ سچ بابوجی، جب کبھی میں سوچتا ہوں تو بچارے پر بڑی دیا آتی ہے۔ دیکھو تن کی تابیت تک یہ بچارا بھاگ دوڑ کر، کوڑی کوڑی کی فکر چھوڑ کر جمع کیے جا رہا ہے۔ ایک پائی اس میں سے کھا نہیں سکتا۔ جیسے کسی دوسرے کا ہو۔ جب یہ پیچھے کل یہ مر جاتا ہے تو یہ سب کس کے لیے جمع کیا ہے؟ بچارے کے ساتھ کیسی مجبوری ہے۔ مر کر جی کر، کوڑی کوڑی کی طرح جمع کیے جا رہا ہے۔ نہ خود کھا سکتا ہے، نہ دیکھ سکتا ہے کہ دوسرا کچھ کھا لے۔ جیسے دھن کے اوپر بیٹھا سانپ۔ خود سے کھا نہیں سکتا، کسی سے تو چھیننے دے گا ہی کیا؟ اس کی رکھوالی کرنا اور جوڑنا۔۔۔ اور لالہ روپا رام کے لیے ہمدردی سے مغلوب ہو کر چوکیدار نے ایک گہری سانس لی۔ پھر دوسرے ہی لمحے دانت نکالتا ہوا بولا: اور کبھی کبھی کیا ہوتا ہے، جی میں آتا ہے کہ اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھوں اور مرے کے کی طرح گود دوں۔ اپنے پیٹ میں جو یہ دھن بھر رکھا ہے، اس کی ایک ایک پائی نکلوا لوں۔ بچارہ خود نہ کھائے، لیکن اپنے بچوں کو بھی کھلا پلا نہیں سکتا۔ اس دھن کا کیا ہوگا؟

ان کے بچے کتنے ہیں؟ اس بار گووند بے تاب ہو گیا۔ اصل میں وہ چاہتا تھا کہ اس تقریر کو چھوڑ کر وہ جلد سے جلد اصل موضوع پر آ جائے، منشی کے بارے میں جاننا ہے۔

تفصیل میں جا کے اپنی کمزوری پر چوکیدار مسکرایا اور بولا: اس کے بچے ہیں چار۔ بیوی مر گئی۔ کئی سال ہوئے۔ کوئی خیال نہیں رہتا۔ اب کوئی عورت نہیں ہے۔ بس ایک مری سی بڑھیا پال لی ہے جو گھر رشتے سالی کی بڑی بہن لگتی ہیں۔ وہی ساری دیکھ بھال کرتی ہے۔ اور تو کسی کو میں نے ساتھ دیکھا نہیں۔ ہوں تین لڑکے اور ایک لڑکی۔۔۔

بڑے دو لڑکے تو ساتھ نہیں رہتے، اس بار مستفسر ہی بولا۔

ہاں، دو لوگ الگ رہتے ہیں۔ دلی میں ایک آدھ چکر لگا جاتے ہیں۔ ایک جوتے کا کارخانہ دیکھتا

ہے۔ دوسرا حساب کی فیکٹری سنبھالتا ہے۔ اس سالے کو اس پر بھی بھروسا نہیں ہے۔ پورے کاغذ پتر، حساب کتاب اپنے پاس ہی رکھتا ہے۔ شام کو پابندی سے وہاں جاتا ہے وصول کرنے۔ لیکن لڑکے ہی بڑے تیز ہیں۔ ذرا شوقین طبیعت پائی ہے۔ اس کے مرتے ہی دیکھنا بھیا مستری، وہ اس کی ساری کنجوسی نکال ڈالیں گے۔ پھر یاد کر کے بولا، "اور کیا کہا تم نے؟ اس تو رہنے کی بات۔ سو بھیا، جب تک اکیلے تھے تب تک تو کوئی بات ہی نہیں تھی لیکن اب تو ان کی بیویاں آ گئی ہیں۔ ایک کے بچہ بھی آ گیا ہے گھر میں، سو اسے گودی میں اٹھائے پھرتا ہے۔ اس کے گھر میں ایک چھوٹی جگہ ہے۔ ان کے ساتھ سب کا نباہ نہیں ہو سکتا۔"

ایک دم گووند کے ذہن میں آیا۔۔۔ لکشمی۔ اور وہ اوپر سے نیچے تک کانپ اٹھا۔ کون؟ لکشمی؟

ہاں ہاں، اسی کی بدولت تو یہ سارا کھیل ہے۔ وہی تو اس خزانے کی چابی ہے۔ وہ نہ ہوتی تو یہ سب تام جھام آتا کہاں سے؟ اس نے تو اس کے دن ہی پلٹ دیے۔ نہیں تو تھا کیا اس کے پاس؟ اس چوکیدار نے یہ بات ایسے کہی جیسے سچ مچ کسی راز کی بات ہو۔

کیسے بھائی، کیسے؟ گووند پوچھ بیٹھا۔ اس کا دماغ چکرا گیا۔ یہ کیا معمہ ہے؟ ایک پل کو اس کے دماغ میں آیا، کہیں یہ روپیہ کمانے کے لیے تو لکشمی کا استعمال نہیں کرتا؟ رام کرشن! اچھا ن!

اس کی بے قراری پر چوکیدار پھر مسکرایا اور بولا: "باپ تو اس کا ایسا کچھ تھا بھی نہیں۔ بس وہ تھوڑی گرہستی چھوڑ کر مر گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دو چار ہزار روپیہ دونوں بھائیوں کے پلے پڑا ہوگا۔ شادیاں دونوں کی ہو چکی تھیں۔ کچھ کاروبار کھولنے کے خیال سے یہ سیٹھ جی اپنے روپے ڈوبے جوئے کرنے گئے تو سارے کھو آئے۔ بڑے بھیا روپچند رام نے ایک پن چکی کھول لی۔ پہلے تو اس کی بھی حالت ڈانواں ڈول رہی تھی، لیکن سنتے ہیں کہ جب سے اس کی لڑکی گوری پیدا ہوئی، اس کی حالت سنبھلتی ہی چلی گئی۔ یہ اس کے یہاں کام کرتا تھا۔ میاں بیوی وہیں پڑے رہتے۔ ایسا کچھ اس لڑکی کا پاؤں آیا کہ لالہ روپچند رام سچ مچ سیٹھ ہو گئے۔ ان لوگوں کے بڑے بوڑھوں کا کہنا تھا کہ لڑکی ان کے خاندان میں بھاگوان ہوتی ہے۔ اب تو یہ بھلا کبھی اس اوجھا کے پاس جا، کبھی اس پیر کے پاس جا، کبھی اس کی منتا کبھی اس کی منت۔ دن رات بس یہی کہ "ہے بھگوان، میرے لڑکی ہو۔" اور پتا نہیں کیسے، بھگوان نے سن لی اور لڑکی ہو گئی۔ آپ یقین نہیں کریں گے، پھر تو سچ مچ ہی روپارام کے نقشے بدلنے لگے۔ پتا نہیں کہاں سے مال آیا جیسے چھپر پھاڑ کر۔ لالہ روپارام کے ستارے پھر گئے۔۔۔ سے یقین ہونے لگا کہ یہ سب اسی کی کرپا ہے اور حقیقت میں یہ کوئی دیوی ہے۔ اس نے اس کا نام لکشمی رکھا۔ اور صاحب، کہنا پڑے گا کہ وہ سچ مچ لکشمی ہی بن کر آئی۔ تھوڑے ہی دنوں میں لکشمی سورج لال اینڈ سنز بن گئی۔ اب تو اس کا یہ حال ہے کہ مٹی بھی چھو دے تو سونا بن جائے اور کنکر کو اٹھا لے تو ہیرا دکھے۔ پھر آئی دوسری لڑکی اور اس کے نیچے چھپے ہو گئے۔ کیسے کیسے ہو گئے۔ جیسے ایک کے بعد ایک مکان خریدے جانے لگے۔ سامان لانے لے جانے والے ٹرک آنے لگے۔ ادھر روپچند رام بھی چل رہا تھا، اور دونوں بھائی فخر سے کہتے تھے: ہمارے یہاں لڑکیاں لکشمی ہی بن کر آتی ہیں۔ لیکن پھر

Scanned with CamScanner

[illegible]

کش لگا کر ختم کیا اور بولا

[illegible]

کودتی ہے، بُری بُری گالیاں دیتی ہے، بے مطلب روتی ہنستی ہے، چیزیں اٹھا اٹھا کر اِدھر اُدھر پھینکتی ہے، جو چیز سامنے ہو اُسے توڑ پھوڑ دیتی ہے، جو ہاتھ آتا ہے اُس سے مارپیٹ شروع کر دیتی ہے اور سارے کپڑے اُتار کر پھینک دیتی ہے، بالکل ننگی ہو جاتی ہے اور رانیں اور چھاتی پیٹ پیٹ کر باپ سے کہتی ہے: ہے، تو نے مجھے کس لیے رکھا ہے، مجھے کھا، مجھے کھا، مجھے بھوگ! وہ پٹتا ہے، گالیاں کھاتا ہے اور سب کچھ برداشت کرتا ہے، لیکن پھر بھی بیٹی کو ڈھیل نہیں ہونے دیتا۔ چپ چاپ سر پہ ہاتھ رکھے بیٹھا سنتا رہتا ہے۔ کیا زندگی ہے بچاری کی! باپ ہے سو اُسے بھوگ نہیں سکتا، وہ چھوڑ تو سکتا ہی نہیں۔ میری تو عمر نہیں رہی، ورنہ کبھی کبھی من ہوتا ہے کہ لے جاؤں بھگا کر، ہو گا سو دیکھا جائے گا!" اور ایک گہرے رنج سے مسکراتا ہوا چوکیدار دیر تک گووند کو دیکھتا رہا۔ پھر دھیرے سے ہونٹ چبا کر بولا: "اُس کی تو بوٹی بوٹی گرم لوہے سے داغی جائے اور پھر باندھ کر کنوئیں سے گرا دیا جائے۔"

گووند کا بھی دل بھاری ہو اُٹھا تھا۔ اُس نے دیکھا، بڈھے چوکیدار کی آنکھوں میں سامنے کی انگیٹھی کی دھندلی آگ کی پرچھائیں جھلملا رہی ہے۔

آدھی رات کو اپنی کوٹھری میں لیٹے، لکشمی کے بارے میں سوچتے ہوئے، موم بتی کی روشنی میں اُس کی ساری باتوں کی ایک ایک تصویر اُس کی آنکھوں کے سامنے مجسم ہو گئی اور پھر اُس نے اندھیرے کی چاردیواری سے گھری، گرم گرم آنسو بہاتی موم بتی کی روشنی میں نشان زد کی ہوئی سطریں پڑھیں:

"میں تمہیں جان سے بڑھ کر پیار کرتی ہوں---"

"مجھے یہاں سے بھگا لے چلو---"

"میں پھانسی لگا کر مر جاؤں گی!"

گووند کے دل میں اپنے آپ ایک سوال اُٹھا: کیا میں پہلا آدمی ہوں جو اس پکار کو سن کر ایسا بے قرار ہو اُٹھا ہے، یا اوروں نے بھی اس آواز کو سنا ہے اور سن کر اَن سُنا کر دیا ہے؟ اور کیا سچ مچ کی جوان لڑکی کی آواز کو سن کر اَن سُنا کیا جا سکتا ہے؟

* *

# کاشی ناتھ سنگھ

ہندی سے ترجمہ: عبدالعلیم سومرو

## صدی کا سب سے بڑا آدمی

لڑائیاں ڈھیر ساری لڑی گئیں سورماؤں کی اس دھرتی پر، اور دھرتی پر ہی کیوں، پانی پر بھی اور آسمان میں بھی، یہاں تک کہ گھر گھر میں۔ چاہے وہ راجپوتوں کا زمانہ رہا ہو، چاہے مغلوں کا، چاہے انگریزوں کا۔ لیکن گلی میں لڑائی صرف ایک لڑی گئی ہے، اور وہ بھی اسی نگر میں۔ یہ اسی لڑائی کی داستان ہے۔

دیس کو آزاد ہوئے مشکل سے چار پانچ سال ہوئے تھے۔ انھیں دنوں اس گلی میں کوئی خاندانی رئیس رہتے تھے، جن کا نام ر سے شروع ہوتا اور چندیل پر جا کر ختم ہوتا تھا۔ اتنے لمبے نام سے انھیں کوئی نہیں جانتا تھا لوگ جانتے تھے ان کے تخلص شوق سے۔ انھیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ اردو کے جتنے بھی بڑے بڑے شاعر ہوئے ہیں، ان میں زیادہ تر کے تخلص مختصر رہے ہیں، مثلاً میر، سودا، ذوق، جوش وغیرہ وغیرہ۔ اسی کی دیکھا دیکھی جب انھوں نے شاعری شروع کی تھی تو اپنا نام شوق رکھا تھا۔ اور یہ نام کہیں چلا ہو یا نہ چلا ہو، کوٹھے پر خوب چلا۔

لیکن جب عمر کے ساتھ ساتھ یہ شوق چھوٹا تو ان پر ایسا شوق چڑھا جس سے ان کی شہرت دیس کے کونے کونے تک پھیلی۔ تو دیکھو وہی اس گلی کی طرف چلا جا رہا ہے جہاں شوق صاحب کا غریب خانہ ہے۔

شوق صاحب چار منزلوں والی اسی کوٹھی میں تیسری منزل کی اس کھڑکی کے پاس بیٹھے رہتے تھے جو گلی کی طرف کھلتی تھی۔ ان کے پاس سبھی کچھ تھا، لیکن سب ان کے نزدیک ٹکے کے مول تھا۔ ہاتھی تھا لیکن چڑھتے نہیں تھے، گھوڑے تھے لیکن دوڑتے نہیں تھے۔ نوکر چاکر بھی تھے لیکن سویا کرتے۔ یہ سب

کچھ اس لیے تھا کہ رئیس کے پاس ہونا چاہیے۔ یہ سب کوٹھی کے پچھواڑے والے باغیچے میں، جہاں نوکروں چاکروں کے لیے دڑبے بنے ہوئے تھے، پڑے پڑے چشکڑا یا جھنسایا کرتے تھے۔ کہیں دور دیہات میں ان کے سیکڑوں فارم بھی تھے جن میں بھی پیداوار ہوتی تھی، لیکن شوق صاحب کا ان سب سے نہیں، بس پان، کتھے، سپاری اور چونے سے مطلب تھا۔

شوق صاحب جس کھڑکی کے پاس بیٹھتے تھے اس کی بغل میں چاندی کی پنیوں میں لپٹی پان کی گلوریوں سے بھی ایک طشتری بھری رہتی، جس میں مشک سے مشکی خوشبودار زردے کی ڈبیاں پڑی رہتیں۔ وہ موڈ کے مطابق گلوری اور تمباکو منہ میں ڈالتے، دیر تک طبیعت سے گھلاتے اور تاک تاک کر کھڑکی سے باہر گلی میں تھوک مارتے۔

جب بھی ان کی پیک کھڑکی سے باہر آتی، کسی نہ کسی کے سر اور کپڑوں پر پڑتی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ منہ کا ایسا سٹیک نشانے باز اس نگر میں کبھی نہیں ہوا، کوئی نہیں ہوا۔ کہنے والے تو کہتے ہیں کہ کسی کسی لوگ ان کے نہ چوکنے والے نشانے کا امتحان لینے کے لیے نیچے سے انگلی یا انگوٹھی چھپاتے تھے، اور جب وہ ٹنٹناتی ہوئی سڑک پر گرتی تو پیک میں بھیگی ہوئی تھی۔

تو جس آدمی کے کپڑے، کرتا اور دھوتی لال ہوتے، اس پر ہونے والا ردعمل شوق صاحب بڑے شوق سے دیکھتے۔ کیا وہ بائیں دائیں تاک کر چپ چاپ نکل جانا چاہتا ہے؟ کیا وہ کھڑکی کی طرف سر اٹھاتا ہے، جھنجھناتا اور انھیں کوستا ہے؟ اور آخر میں کپڑے جھاڑ کر چل دیتا ہے؟ ایسے شریف اور بزدل قسم کے آدمیوں سے انھیں گھن آتی اور وہ بچی کچی پیک کی مستی پیکدان میں تھوک دیتے۔

انھیں ایسے بہادروں کی تلاش رہتی جو کپڑے خراب ہوتے ہی ماں بہن کی دھواں دھار گالیاں بکنا شروع کر دیں، اچھلیں کودیں، آسمان سر پر اٹھا لیں، رو گا کر محلے والوں اور راہ چلتوں کو اپنے ارد گرد جمع کر لیں۔ پھر بلکیں، بلبلائیں، اور رحم کی بھیک مانگتے ہوئے، انصاف کا واسطہ دیتے ہوئے کہیں کہ اب وہ کیا پہنیں گے، ان کا کیا ہوگا۔

عین اس وقت جب وہ چھاتی پیٹ پیٹ کر اوپر والے کو گالیاں دے رہا ہوتا، اسی کوٹھی سے دو نوکر نکلتے اور ادب کے ساتھ اسے اوپر لے جاتے۔ اسے چندن کے صابن سے مل مل کر نہلایا جاتا، نیا کرتا اور نئی دھوتی پہنائی جاتی، عطر سے بدن آراستہ کیا جاتا، پیچھے سے اچکن پہنا دیا جاتا، اور آخر میں اسے رکشے یا گھوڑے پر، جو اس کے لیے سجا ہوتا، بٹھا کر گلی کے موڑ تک وداع کیا جاتا۔

ایسے مسالوں کو پا کر شوق صاحب پھولے نہ سماتے۔

دھیرے دھیرے ان کا نام گاؤں اور نگر کے باہر دور دور تک پہنچنے لگا۔ لوگ ہر جگہ چرچا کرتے کہ غریب نواز کی ایک کوٹھری دھوتیوں سے بھری ہوئی ہے اور دوسری اچکنوں اور تن زیب کے کرتوں سے۔ برآمدے میں ہر وقت درزی سلائی کا کام کرتے رہتے ہیں۔ ان خبروں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ طرح طرح کی گالیاں سیکھتے، رونے کلپنے کی عادت ڈالتے، اور پھر گلی کے چکر لگانا شروع کر دیتے۔ پتا نہیں کب

Scanned with CamScanner

سرکار کالی بن جاتے اور ٹھوک بیٹھیں۔

سدا اپنے ویر شنکر نے دونوں کی جو سیوا ٹہل شروع ہوئی اس کا کوئی انت نہیں تھا۔

لیکن صاحب، [illegible] کیجیے تو شوق صاحب کی۔ بینک کی [illegible] کی نظر [illegible] کے دلی تھی۔ آپ دو چار دن [illegible] دیا، [illegible] تک [illegible] گلی میں ٹہلیے وہ آپ پر [illegible] لیں گے [illegible] نہیں [illegible] لیں گے۔ وہ آدمی [illegible] کی جان سے [illegible] جیسے [illegible] قابلیت [illegible] شخص میں ہے۔ [illegible] گالیاں دینے دیتے رہ سکتا ہے۔ [illegible] نہیں، [illegible] [illegible] [illegible] دیکھ [illegible] ہوئے، بچے سے [illegible] کوشش کرے، وہ [illegible] کسی شخص یا شے یا [illegible] پر تھوک دیتا ہے۔ کبھی کسی [illegible] [illegible] [illegible] نہیں [illegible] [illegible] [illegible] نہیں آتیں؟ کہیں [illegible] کا [illegible] ہے۔

[illegible] تک [illegible] وقت کی [illegible] ہو رہے تھے [illegible] کی گلی میں [illegible] اور بینک کی امید میں کھڑکی کے نیچے [illegible] شوق صاحب [illegible] دے دیتے۔ [illegible] لیکن کیا کروں، [illegible] قول [illegible] صاحب، [illegible] تو دے لوگے۔ [illegible] عادت تو ڈالی نہیں، [illegible] کی بات پر تھوکتا ہے۔

[illegible] شوق صاحب [illegible] بینک نے [illegible] ہیں۔

[illegible] کھڑکی سے [illegible] اٹھائے ہوئے کھوئے کھوئے رہتے، اور ایک دوسرے سے [illegible] لگا رہتے [illegible] محبت [illegible] ہے۔ ان کے شان دار اور [illegible] کتنی [illegible]! [illegible] سرکار کسی [illegible] دیتے بچے [illegible] کوئی [illegible] کھڑکی کے سوا کہیں [illegible] کہیں ڈھونڈتے [illegible] حرام خور، حرکت!

[illegible] شوق صاحب کی [illegible] شباب [illegible] تھی، وہ دن آ گیا جسے کبھی نہیں آنا چاہیے تھا اور [illegible] سوچا تک [illegible] تھا۔ ایک [illegible] سا، سنکیا نوجوان، جو [illegible] گلی میں آتا تھا اور [illegible] کو دیکھا کرتا تھا، ایک دن گھناونی حرکت کر بیٹھا۔ [illegible] نے ایک [illegible] شخص [illegible] بینک [illegible] تھی، [illegible] دوڑ کر دھاڑ

دیا۔ وہ آدمی لڑھکتا ہوا دور جا گرا اور ایک موری کے پانی پر چھپاکا کر کے رہ گیا۔

اس وقت جیرا نے اُسے صرف بے عزت کر کے چھوڑ دیا۔

لیکن اس نوجوان نے جب وہی حرکت اگلے دن بھی کی، اور کسی دوسرے آدمی کے ساتھ، تو جیرا کا غصہ بڑھ گیا۔ وہ برداشت نہ کر سکی۔ اس نے اسے دس پانچ ہاتھ مارے اور کہا کہ "صبر سے کام لے، تیرے لوگ پیسوں سے لگے ہوئے ہیں مگر اب تک باری نہیں آئی، اور تو آ آ کر ناحق ہتھیا لینا چاہتا ہے!

اس نے جیسے ہی کچھ بولنے کی کوشش کی، جیرا دوبارہ اس پر ٹوٹ پڑی۔

"چھوڑ دو اسے!" کھڑکی میں سے شوق صاحب نے للکار کر کہا۔ "اس حرام زادے کو کرتا دھوتی لے جانے دو۔ چل بے، سامنے آ!"

جب سامنے آیا تو شوق صاحب نے اس کا پورا جائزہ لیا۔ اس کی قد کاٹھی کا، ہاتھ پیروں کا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ عمر کا اندازہ نہیں لگ پا رہا تھا کیوں کہ مونچھیں تو پوری طرح آ گئی تھیں لیکن داڑھی کے بال صرف ٹھوڑی پر ہی تھے۔ چپٹی اور گانٹھ جیسی ناک کے باوجود وہ پرکشش تھا۔ ذرا سی کھٹکنے والی بات بس یہ تھی کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی تھیں، ان میں کسی طرح کی بھوک یا لالچ نہیں تھی۔

اگر اس کے کپڑے گندے ہوتے تو شوق صاحب نے اسے بھگا دیا ہوتا، کیوں کہ چیتھڑے اور مٹ میلے کپڑوں پر تھوکنے سے انھیں گھن آتی تھی، اور لوگ یہ چاہتے بھی تھے۔

"ہاں، تو آ سامنے!" انھوں نے آسن بدلا۔

اور پھر انھوں نے اسے پیٹنا شروع کیا۔ جیرا نے بھی دیکھا کہ شوق صاحب اُسے بچ بچا کر مار رہے ہیں۔ اُدھر تھوک ہی نہیں رہے ہیں جدھر وہ اُچھل کر کھڑا ہو رہا ہے۔ اگر وہ اسے کپڑے دینا چاہتے تو کب سے کب کا تھوکنا شروع کر دیا ہوتا، لیکن وہ بھی بچے کو پڑھا رہے ہیں۔ "ہاں، چل بے!"

شوق صاحب کو مزہ آ گیا۔ ایک مدت لمبے انتظار کے بعد انھیں کوئی مرد کا بچہ ملا تھا جس نے بڑی چستی اور پھرتی سے ان کی نشانے بازی کو چنوتی دی تھی۔ شام کے وقت جب نوجوان نے اپنے کپڑے ٹھیک کیے، ماتھے کا پسینہ پونچھا اور ہانپتے ہوئے کھڑکی کی طرف اپنا سر اٹھایا، تو اس کے چہرے مہرے کا جائزہ لیتے ہوئے شوق صاحب نے اعلان کیا، "دیکھ، مرد کی زبان ایک! اس کھڑکی سے میں تھوکوں گا اور نہ سرکے گا تو! چاہے رات ہو جائے چاہے دن، نہ کوئی کھائے گا نہ پیے گا نہ آرام کرے گا۔ اگر سب سے سو بار بچا لے گیا اور ایک بھی چھینٹ تیرے بدن پر نہیں گری تو کپڑوں کے سوا میرے گھوڑوں میں جو تجھے پسند آئے لے جا! اسے تانگے میں جوت چاہے بیچ کھا، جیسی تیری مرضی!"

جیرا نے ہے ہے کار کیا اور کہا کہ سرکار اس بدماغ لونڈے پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہو رہے ہیں۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیے،" نوجوان نے پاؤں بدل کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"اچھا، تو یہ مجال!" شوق صاحب نے نشانہ سادھا۔

Scanned with CamScanner

پہلی بار، گلی میں، دروازے، کھڑکی، چھت پر، راہ چلتے، پیڑ پر بیٹھے سارے عالم نے پہلی بار اس سوال جواب سے محسوس کیا کہ یہ کوئی کھیل تماشا نہیں، کچھ دوسری ہی بات ہے، کیوں کہ یہ لونڈا نہ گالیاں دے رہا ہے نہ رو رہا ہے، صرف اپنا بچاؤ کر رہا ہے، جسے سرکار سچ مچ، ایمان داری سے، سچے دل سے اس پر تھوکنا چاہتے ہیں۔ پھر بھی انہیں یہ تکلیف رہی کہ اس مسخرے کو کیڑے لگتے، اور اب تو تھوڑا سا ہی، اسے گرفتار ہونا چاہیے اور دوسروں کو موقع دینا چاہیے۔ اتنے لوگ اپنا کام دھندا چھوڑ کر، کتنی دیر سے، اتنے دن سے کھڑے ہیں، کچھ تو سوچنا چاہیے۔

نوجوان قاعدے سے پیک کے دائرے ہی میں تھا، اس کے باہر نہیں، اور جارحیت بھی یہی تھی۔ طے ہو چکا تھا کہ تھوکے جانے کے وقت باہر سے کوئی بھی اشارہ نہیں کرے گا، اور اس کا بھی سختی سے پالن ہو رہا تھا۔ شوق صاحب اس کے غافل ہونے یا ہچکی لینے یا چھینکنے کا انتظار کرتے اور موقع میں بلا بول دیتے۔ نوجوان کا چوکنا پن غیر معمولی تھا۔ وہ دائیں بائیں گھومتے گھومتے اچھل کر آگے یا پیچھے کھڑا ہو جاتا۔ کسی کسی تو بے مطلب گھنٹے بھر پیک کا انتظار کرنا پڑتا، لیکن موقعے کے وقت اچانک جھک کر یا اچھل کر اپنے چوکنے پن کا ثبوت دے دیتا۔

یہ سب کچھ جتنا اکتا دینے والا اور بور تھا، اتنا ہی تماشا بھرا بھی، لیکن واہ رے شوق صاحب! وہ اوپر بنی کھڑکی کے پاس بیٹھے بیٹھے کھا بھی سکتے تھے، سو بھی سکتے تھے۔ نیچے سے کون دیکھتا ہے! اور دیکھنا بھی چاہے تو کیسے دکھائی پڑے گا۔ لیکن نہیں، اصول تو اصول، راجا ہو یا رنک! وہ سست پڑنے لگے اور ادھر صبح ہونے لگی۔

چھوکرے! انھوں نے سورج نکلتے دوسرا اعلان کیا، حالاں کہ آواز تھوڑی مدھم اور کمزور تھی، میں تیری محنت اور دلیری سے خوش ہوں۔ چاہتا تو ابھی تک کر تو اسی خوشی پے گھر جا، بیوی بچوں سے، ماں باپ سے مل۔ میں تھوڑا دکھ اس کے ساتھ خوش ہوں، لیکن لگتا ہے تجھے منظور نہیں! اچھا جا، اگر آج بھی بچ گیا تو لکھا ماتھے تیرا! فیل سالی کر، اپنی اور اپنی دس پشتوں کی قسمت بنا!

نوجوان اکڑا رہا تھا، جیسے ہوش میں نہ ہو۔ اس نے اپنی لے کا بولی زبان میں کہا، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

پھر سالے، کس لیے مر رہا ہے؟ بھیڑ گالیاں دیتی ہوئی اسے پیٹنے کے لیے لپکی، لیکن پہلے ہی سے اس کے سر پر شوق صاحب کے نوکروں چاکروں کی تنی ہوئی لاٹھیاں دیکھیں تو شانت ہو کر پیچھے کھڑی ہو گئی۔

خبردار! شوق صاحب نے اوپر سے ڈپٹ کر سب کو ہٹایا اور کھڑکی سے، ہونٹوں کو بندوق کی نالی بنا کر، سنسناتی ہوئی پیک ماری۔

نوجوان اچھلا، کھڑا ہوتے ہوتے گرا، مگر بچ گیا۔

شوق صاحب جھلا اٹھے۔ ان کا چہرہ تمتما اٹھا، نتھنے پھڑکنے لگے۔ ان کا گورا چٹا رنگ تانبے جیسا ہو

Scanned with CamScanner

گیا۔ ہمیشہ مسکراتے رہنے والے دیالو سرکار کا یہ بھیانک روپ کسی نے دیکھا نہیں تھا۔ اس کے بعد ہی انھوں نے فیصلہ ہونے تک مسلسل جنگ کا اعلان کر دیا۔

اور پھر گھنٹوں جو لڑائی چلی، اس کا اب تک کوئی ثانی نہیں ہے۔ اس کا بیان وہی کر سکتا ہے جس کی زبان میں بجلی کی چمک، بادلوں کی گرج اور موسلادھار بارش کو جذب کرنے کی طاقت ہو۔ دیکھتے دیکھتے کھڑکی سے نظر آنے والی ساری سڑک اور دیواریں جل تھل ہونی شروع ہو گئیں۔ اس دوران نوجوان اچھلتا رہا، کودتا رہا، ناچتا رہا، گرتا پڑتا رہا۔ اس کے کپڑے تار تار ہوئے، کہنی اور گھٹنے پھوٹے، سینے پر کھرونچ آئی، مونڈھوں اور کندھوں پر سوجن آ گئی، چھاتی دھونکنی کی طرح چلتی رہی، پسلیاں باہر جھانکنے لگیں، لیکن اس کے بدن پر ایک بھی چھینٹا نہ پڑا۔

اب شوق صاحب کے لیے ہمدردی کیجیے یا بی بی جی، بیرے نے بھی اس کے ساتھ مروت نہیں دکھائی۔ الٹے وہ اس کا مذاق اڑاتی رہی، اس پر طنز کرتی رہی، بیچ بیچ میں کنکر اور کنکڑیوں کے ٹکڑے تک پھینکتی رہی، لیکن اسے ڈگا نہ سکی۔

"چھوکرے، میرے سے کوئی چال تو نہیں چل رہا ہے؟" آخر میں تھک کر کھڑکی کے پٹے سے اپنے گال ٹکاتے ہوئے شوق صاحب نے پوچھا۔

پسینے سے تربتر نوجوان نے سر اٹھایا۔ "کیسی چال؟"

"گھناؤنی چال، یعنی کہ جادو ٹونا!"

نوجوان لمبی لمبی سانسیں لیتا ہوا تکتا رہا۔

"پھر مجھے کیوں لگتا ہے کہ تیری گردن لمبی ہو کر کھڑکی کے سامنے آ رہی ہے، تیری آنکھیں میری آنکھوں میں گھسی آ رہی ہیں، میری پیک اوپر ہی اوپر اڑی جا رہی ہے؟ تو جہاں کھڑا ہے وہاں نظر نہیں آ رہا ہے؟"

"آپ وہ پہلے صاحب، جو اپنی ماں سے محبت کرے!" نوجوان ہانپتے ہوئے بولا۔

"شاباش!" پان کی گلوری طشتری سے اٹھاتے ہوئے شوق صاحب نے خوش ہو کر کہا۔ "شاباش بہادر، تو تیار ہو جا!"

دوپہر کے بعد بیرے نے غور کیا کہ شوق صاحب اور چھوکرا، دونوں کھائے پیے ہوئے بغیر سست پڑ چکے ہیں۔ چھوکرے سے نہ ٹھیک سے کھڑا ہوا جاتا ہے، نہ اچھلا جاتا ہے، نہ چلا جاتا ہے۔ اسی طرح شوق صاحب کے تھوکنے میں نہ پہلے جیسی دھار ہے نہ طاقت نہ سیدھا پن۔ کبھی کبھی تو وہ کھڑکی سے گردن باہر کرتے اور پیک ان کے کھلے منھ سے باہر ٹھوڑی سے ہوتی ہوئی بوند بوند کر کے ٹپکنے لگتی۔ ایسی بھی نوبت آئی جب منھ کھلا رہتا اور کچھ بھی نہ گرتا۔ شام تک تو ایسا ہو گیا کہ نہ کھڑکی سے پیک گری اور نہ نوجوان کھڑا رہ سکا۔ وہ بائیں طرف جھکا جھکا کچھ دیر جھولتا رہا، پھر لڑھکا اور پیٹ کے بل ڈھیر ہو گیا۔ پھر کسی طرح بڑھی

Scanned with CamScanner

مشقت کے بعد چپ ہو گیا۔ [illegible] سے [illegible] دھیرے دھیرے پلکیں بند ہو [illegible] ادھر ادھر کچھ دیکھنے کی کوشش کی۔ [illegible] کی آنکھوں نے [illegible] ڈھونڈ لی اور وہیں ٹک گئیں۔

[illegible] سب کا جینا [illegible] ایک کی [illegible] تو [illegible] بات تو [illegible] نہیں رہ گئی ہے۔

لوگ [illegible] بیٹھے ہوئے تھے، لیکن [illegible] خاموش [illegible] ٹھیک ویسی ہی [illegible] دھوپ اور [illegible] تک [illegible] شام کی [illegible] کا [illegible] سے [illegible] بیٹھ [illegible] کسی [illegible] صاحب [illegible]۔

[illegible] آنکھوں میں [illegible] ایک [illegible] جیسے جیسے اندھیرا گھنا ہوتا گیا [illegible] تاروں [illegible]۔

[illegible] کی [illegible] تھا [illegible] تک [illegible] کی [illegible]!

[illegible] کا [illegible] کوئی [illegible] طرف [illegible] پھیل رہی تھی۔

[illegible] نہیں تھا۔ بھوک میں تھوڑی دیر کے لیے [illegible] کا فائدہ اٹھا لیا۔ [illegible] کسی نے اندھیرے میں [illegible] کچھ لوگوں [illegible] شوق صاحب [illegible] تھے، لیکن [illegible] کی وفات کسی سے زیادہ [illegible] کی [illegible]؟

[illegible] شوق صاحب سے [illegible] کی [illegible] کیا [illegible]؟ [illegible] کیا [illegible] لیکن [illegible] کا کوئی [illegible] تھے۔ [illegible] تیار [illegible] تھے۔ [illegible] گھوڑے [illegible] کسی [illegible] کی گردن [illegible] کے ساتھ [illegible] گیا [illegible] ہے۔

[illegible] آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ آنسو گالوں پر ڈھلک آئے تھے [illegible] سامنے آ کر کہیں نہیں [illegible]۔

اس اعلان کا بڑا دردناک اثر ہوا۔ اسے سنتے ہی بھیڑ کے دکنی چھور پر، جہاں پگڑی کا پیڑ تھا جس کی ڈالیں چھوٹے بڑے، ادھ ننگے جسموں اور سروں سے لدی ہوئی تھیں، کوئی بولا، "ہائے کرتا!" دوسرے کسی کونے سے ایک اور آواز آئی، "ہائے دھوتی!" دھیرے دھیرے ہر کونے سے آوازیں آنی شروع ہوئیں اور یہ کیرتن سا سنائی پڑنے لگا: "ہائے کرتا، ہائے دھوتی، ہائے چاول، ہائے روٹی!"

کچھ جو چپ چاپ کھڑے تھے ڈر کا نہیں رہے تھے، شک کی نگاہوں سے آگے پیچھے تاک رہے تھے اور سب کی سلامی کو دیکھتے ہوئے آگے آنے سے پہلے ایک دوسرے کو تاک رہے تھے۔

"حضور!" آخر کار ایک بوڑھا آگے بڑھا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر چلایا، "یہ قصور میرا ہے!"

شوق صاحب نے بھی آنکھیں پونچھیں۔ "کون ہے تو؟"

"اس ابھاگے کا باپ،" بوڑھا بولا۔

"کیا کرتا ہے تو؟"

"تھا تو ملوا حضور، لیکن جب سے زمین ودری گئی، اس نگر میں رکشا کھینچ رہا ہوں۔"

"اور تیرا بیٹا، وہ کیا کرتا ہے؟"

"کچھ نہیں سرکار! آوارہ اور نکما ہے۔ رات رات بھر دوستوں میں گپیں لڑاتا ہے۔ گھر سے غائب رہتا ہے، اور بھی جانے کیا کیا کرتا ہے۔"

"انقلابی تو نہیں ہے؟"

"پتا نہیں حضور!"

شوق صاحب اسے چپ چاپ گھورتے رہے۔ طوفان سے ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ "مگر ایسا کیوں کیا تو نے؟"

"حضور، وہ میرا خون ہے اور میں اسے جانتا ہوں۔ وہ نہیں مرتا، مر کر نہیں مرتا، لیکن آپ، سرکار۔۔۔" وہ ہکلانے لگا، "اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو ہم کہیں کے نہ رہتے۔"

"لیکن تو نے دنیا کو جو بتایا کہ سرکار تیرے بیٹے کے مقابلے میں کمزور اور بزدل ہیں، اس کے لیے کیا کہتا ہے؟"

بوڑھا سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے یہ نہ سوچا تھا کہ اس کا مطلب ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے مدد کے لیے ادھر ادھر دیکھا۔ لوگ ہر طرف پیچھے سے گردن اچکا اچکا کر دیکھ رہے تھے اور اسے سننے کی کوشش کر رہے تھے۔

"سرکار، بزدل وہ ہے جو میدان چھوڑ دے، آپ نہیں!"

"یہ بات نہیں ہے بڈھے!" شوق صاحب کچھ دیر سوچتے رہے، "صاف صاف بول، تو نے کس کی جان بچائی؟ میری یا اپنے بیٹے کی؟"

"اپنے بیٹے کی حضور!"

Scanned with CamScanner

وہ کیسے؟

"اگر آپ نہ ہوتے تو یہ لوگ، جو چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور کیرتن کر رہے ہیں اسے زندہ نہ چھوڑتے۔"

"سو کب؟ کب نہیں چھوڑتے؟"

پہلے بھی، اور اب بھی۔

اب بھی؟ بھلا کیوں؟

اس لیے کہ جب تک آپ ہیں تو ہم ہیں، آپ نہیں تو ہم نہیں۔

شوق صاحب ہنسے اور زور زور سے ہنستے رہے۔ ان کا بھاری بدن جب شانت ہوا تو بولے، "بڈھے، [illegible] میں تیرے سے خوش بھی ہوں اور ناراض بھی۔ خوش اس لیے کہ تو نے میری جان بچائی [illegible] اور ناراض اس لیے کہ تو نے [illegible] سب کو ذلیل کیا [illegible] اس صورت [illegible] تو بول، تیری منشا کیا ہے؟ کیا چاہتا ہے تو؟"

سرکار! بڈھے نے سر جھکا لیا۔

وہ جب [illegible] شوق صاحب [illegible] سرکار کے [illegible] سب [illegible] کافی دیر تک بڈھا [illegible] شوق صاحب [illegible] اعلان کیا، وہ نوجوان جہاں کہیں بھی ہو، آسمان میں ہو تو آسمان میں سے، پاتال میں ہو تو پاتال میں سے، دھرتی پر ہو تو دھرتی پر سے، پکڑ [illegible] رہے گا وہ بخشش کا حق دار ہوگا۔ جاؤ!"

[illegible] سے پھیلنے لگی۔ لوگ دوڑنے گھومنے لگے۔ شوق صاحب نے اپنے اعلان میں [illegible] کا سلسلہ [illegible] بھی چلایا [illegible] کر دیا تھا۔

دیکھتے دیکھتے گلی سونی ہو گئی۔

بڈھے [illegible] شوق صاحب بولے، "تو نے اپنے بیٹے [illegible] قیمتی چیز ہے وہ [illegible]؟"

سرکار! بڈھے نے [illegible] پر ایسا [illegible] دیا۔

[illegible] اب یہ کام تیرا بیٹا کرے تو کیا رہے؟ اسی گدی پر بیٹھ کر اسی کھڑکی کے پاس!

[illegible] کا سر جھکا ہوا تھا اور دیر تک [illegible]۔ وہ بے یقینی سے [illegible] کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ [illegible] دونوں ہاتھ جوڑے اور آنکھیں بند کر لیں۔ پھر ان کی [illegible] کو چھو لیا

Scanned with CamScanner

ہائے میرے پروردگار! ایسا نہ کریں، نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ مارے خوشی کے مر جاؤں گا!

جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے بے یقینی سے بے دل ہو کر کہا، سرکار، آپ نے جو ابھی ابھی کہا اسے بھول تو نہ جائیں گے؟

"بڈھے! شوق جو کہتا ہے اسے کبھی نہیں بھولتا۔

بڈھے کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا، لیکن اس کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ بیٹا آنے میں دیر کر رہا تھا۔ جب تک اسے لے کر ساتھی لوٹے تھے نہ گھوڑے نہ گاڑی۔ اسے معلوم نہیں تھا ورنہ دوڑ کر گیا ہوتا اور پکڑ لیا ہوتا۔

سرکار! اس نے التجا کی۔ اگر اجازت دیں تو میں خود دیکھوں؟

نہیں، تو یہاں سے نہیں ہل سکتا! شوق صاحب نے درشت لہجے میں کہا۔

بڈھا سر جھکا کر سوچنے لگا کہ اس کا بیٹا جو بڑا ہی بے کہا اور ضدی ہے، کہاں کہاں جا سکتا ہے۔ ٹھیک اسی وقت نہ جانے کہاں سے اس کے من میں ایک شک پیدا ہوا۔

نہیں حضور! وہ بچ جائے، دوسروں پر تھوکنا اسے کیسے سوجھے گا؟ اس نے شوق صاحب سے عرض کیا۔

کیوں؟

اس کے بھائی بند یہ کیسے برداشت کریں گے؟'

جیسے سب کرتے ہیں۔

بڈھا ہنسا۔ آپ کی بات اور ہے سرکار!"

ہاں، یہ بات تو ہے۔ شوق صاحب گمبھیر ہو گئے اور سوچنے لگے۔ انھوں نے کئی بار چٹکیاں بجائیں، کئی بار مونچھیں مسلیں، ہاتھ کی انگلیاں چٹخائیں، ایک دانت ٹھکایا اور آخر میں راحت کی سانس لی۔ میں نے فیصلہ کر لیا بڈھے! اگر وہ تھوکے اور سب سے پہلے مجھی سے شروع کرے تو کیسا رہے؟

بڈھا چکرایا۔ کیا مطلب سرکار؟

مطلب یہ کہ کسی اور پر تھوکنے سے پہلے اپنے باپ پر تھوکے، تو دوسروں کو کیا اعتراض؟

بڈھے کا جی دھک سے رہ گیا۔ وہ گھبرا اٹھا۔ غضب ہو جائے گا سرکار! وہ جان دے دے گا لیکن یہ نہیں کرے گا۔

وہ کیا کرے گا کیا نہیں کرے گا، یہ مجھ پر چھوڑ! شوق صاحب نے اسے ڈانٹ کر فوراً چپ کرا دیا۔

شوق صاحب اب کچھ بھی سننے کو تیار نہیں لگ رہے تھے۔ وہ پرسکون ہو گئے تھے اور بڑی تیزی سے ان کا موڈ بدل رہا تھا۔ وہ کچھ گنگنا رہے تھے اور ران پر تال دے رہے تھے۔ جانے کتنے دنوں کے بعد کام دھام سے فرصت ملی تھی انھیں۔ انھوں نے جمائی لی اور منہ کے آگے چٹکیاں بجائیں۔

Scanned with CamScanner

کیا کریں کہ دن کٹے؟ یہ بات ان کے اندر گھٹنے لگی تھی۔ انھوں نے باہر دیکھا۔ نہ کوئی تھا، گرمی کا تھا۔ گھپ سا تھا۔ یہاں سے لال سڑک پر جہاں سیوا سناٹا تھا اور ان سے وقت نہیں کٹ سکتا تھا۔ انھوں نے پہلے سر کھجلایا اور تب تک کھجلاتے رہے جب تک ہاتھ درد نہیں کرنے لگا۔ پھر پیٹھ کھجلائی، پھر ہاتھوں کی انگلیاں چٹخائیں، پھر دوست کو دیکھتے رہے اور لیٹے رہے۔ آخر میں شیشہ اٹھا کر جب چہرہ دیکھ رہے تھے تو لونڈے کے دن یاد آنے لگے۔ خاص طور سے بیلا بائی یاد آئی--- ہائے ہائے! کیا گلا پایا تھا، کیا ترنم تھا اور کیا لوچ تھا---

"کیسا زمانہ تھا حضور! یہ آپ پر بھی ظلم ہوگا اور مجھ پر بھی۔ ہم کیسے منہ دکھائیں گے؟"

بڈھے نے دوبارہ کہا، اس نے پھر دہرا دی۔

شوق صاحب متفق تھے، انھیں غصہ آ گیا۔

"ابے ڈرپوک بڈھے! تیرا بیٹا جو تیرے چھیں سے آوارہ ہو نکلا ہے، تجھے وہ سب کچھ سیکھ رہا ہے جس کے لیے ہم باپ جیسا کرتا ہے، سمجھا؟" یہ کہہ کر انھوں نے نیچے جھانکا اور تھوڑی دیر چپ رہے۔ پھر بولے، "دیکھ! دماغ مت چاٹ۔ زندگی کے مزے لے۔ جب بڈھے آدمی کی صحبت کی ہے تو عیش کر۔ بول، سیاست کا؟ کہ نمبر دو؟ ویسے ہو گھبیتا کا ہے۔ آ، ہا! کوئی نہیں جوان میں کوئی ہو رہا"۔ شوق صاحب نے آنکھیں بند کیں اور اندر کسی کو آواز دی، "ارے کون ہے ادھر؟ بیلا بائی کو بھیج تو!"

بڈھے نے اپنے کانوں میں انگلیاں گھسیڑ لیں۔ اس کا ماتھا چکرانے لگا۔ اگر چوبداروں نے اسے سہارا نہ دیا ہوتا تو وہ مر پڑا ہوتا۔ اس کے دماغ میں آتا تو آ رہا تھا کہ سرکار ٹھیک ہی کر رہے ہیں۔ وہ پکا آدم، جانے کب تک جیوے۔ کے دن کی زندگانی ہے اس کی! لوگ بال بچوں ہی کے لیے جیتے ہیں۔ وہ بیٹا بیٹے کو راج مل رہا ہے۔ اور وہ بھی اپنے آپ۔ دیا ہے حضور، مالک اور سرکار کیا کرے گی اور لونڈے کے لیے آ رہا رہے گی۔ لیکن من کہہ رہا تھا کہ بیٹے جینے سے تو مر جانا اچھا۔ وہ بھی کیا باپ جس پر بیٹا تھوکے!

چاہے جو کہے کہاں سے، شاید اس کی نظر آ رہا ہے، آواز آئی کہ لاکھ ڈھونڈھو، وہ نہیں ملے گا!

اسے گدگدی سی محسوس ہوئی اور اس نے اوپر تاکا۔

گراموفون کا ریکارڈ بجنے لگا تھا۔ وہ کھڑکی پر بیٹھے بیٹھے شوق صاحب جھوم رہے تھے۔

"سرکار، اگر وہ آ گئے تو؟" بڈھے نے خوشی میں چیخ کر پوچھا۔

شوق صاحب کا دھیان ٹوٹا۔ انھوں نے ناک بھوں سکیڑی۔ انھیں یہ کھٹ راگ بڑی بے تکی لگی، پھر بھی انھوں نے ضبط سے کام لیا۔ "ابے الو کے پٹھے! اسے کیا ہو رہا ہے؟ وہ دنیا جا رہا ہے!"

"لیکن وہ مل گئے تو؟" بڈھے کی رو میں چیخ دیا۔

Scanned with CamScanner

شوق صاحب نے بیلابائی کو، یا جو بھی رہی تھیں انہیں، تھوڑی دیر کے لیے چپ کرو دیا اور غصے سے بڈھے کو دیکھا۔ بڈھا سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا منہ اٹھائے بجھاتی آنکھوں سے ان کی طرف تاک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے اور کانپ رہے تھے۔ بغل بغل چوب دار اس کی بانہہ پکڑے ہوئے اسے دھتکار رہے تھے۔

غصے میں تو بہت تھے شوق صاحب، لیکن نہیں، رحم آ گیا۔ ادھر جیتنا ہے ہی، ان کے دل کو نرمی اور سخاوت سے بھر دیا تھا۔ وہ خود میں مسکرائے۔ سانڈوں اور لونڈوں کے ناچ کے رسیا بڈھے! تجھے اس کا مزہ کیا معلوم! سبھی شنکر خوتی کی طرح بیچ بیچ میں کاٹ رہا ہے۔ اچھا، اب ساری باتوں کا لب لباب یہ ہے، ورنہ مانے مانے بند کر۔ رعایت نہیں چلے گی یہاں۔ اگر تو نے تھوکنے والے کو بیٹا جان کر گالیاں دینے میں، رونے میں، گڑگڑانے میں کوتاہی کی، چوک کی، تو یاد رکھ! ایک بار نہیں، دو بار نہیں، تین بار نہیں، وہ تب تک تھوکتا جائے گا جب تک ہمیں سنتوش نہ ہو۔ بس! ہاں، تو تیار ہو جا۔ اب شروع کر!

گراموفون کی آواز پھر کھڑکی سے باہر آئی اور دھوپ میں بل کھانے لگی۔ شوق صاحب تال ہی نہیں دے رہے تھے، ساتھ ساتھ سر بھی ملا رہے تھے۔

بڈھے نے اونچی آواز میں پھر کچھ کہا، لیکن خود نہیں سن سکا کہ کیا کہہ رہا ہے۔

وہ پالتھی مار کر وہیں سڑک پر بیٹھ گیا۔

شوق صاحب انتظار کر رہے تھے آنے کا۔

بڈھا انتظار کر رہا تھا نہ آنے کا۔

یہ پہلا دن تھا۔ چار دن اور باقی تھے۔

شوق صاحب کے نام پر بسے اس نگر کے اس چوراہے پر، جسے لوگ شوق کی جگہ چوک کہتے ہیں، سال میں ایک بار یہ دنگل ہوتا ہے جس میں برہا گانے والی دونوں پارٹیاں آپس میں سوال جواب کرتی ہیں۔ حالانکہ ہر کوئی جانتا ہے کہ پچھلے دور کیا ہوا تھا، پھر بھی برسوں کی آخری رات ہوتی ہے بھور میں، جس کے فیصلے کا دار و مدار ان سوالوں کے جواب پر ہوتا ہے کہ نوجوان لایا نہیں، گدی پر بیٹھنے کے لیے کہا گیا تو بیٹھا یا نہیں، بچے باپ پر تھوکا یا نہیں، تھوکا تو باپ سے کچھ کہا یا نہیں۔۔۔

اس میں شک نہیں کہ جواب تو پہلے سے بچے دبے جاتے ہیں، مگر سننے والوں کا جی نہیں بھرتا۔

**

# موہن راکیش

ہندی سے ترجمہ ولی رام ولبھ

## ملبے کا مالک

پورے ساڑھے سات سال بعد وہ لوگ لاہور سے امرتسر آئے تھے۔ ہاکی کا میچ دیکھنے کا تو بہانہ ہی تھا، انھیں زیادہ چاؤ ان گھروں اور بازاروں کو پھر سے دیکھنے کا تھا جو ساڑھے سات سال پہلے ان کے لیے پرائے ہو گئے تھے۔ ہر سڑک پر مسلمانوں کی کوئی نہ کوئی ٹولی گھومتی نظر آ جاتی تھی۔ ان کی آنکھیں اس احساس کے ساتھ وہاں کی ہر چیز کو دیکھ رہی تھیں جیسے وہ شہر سادھارن شہر نہیں بلکہ ایک اچھا خاصا کشش کا مرکز ہو۔

تنگ بازاروں میں سے گزرتے ہوئے وہ ایک دوسرے کو پرانی چیزوں کی یاد دلا رہے تھے۔ دیکھو فتح دینا، مصری بازار میں اب مصری کی دکانیں پہلے سے کتنی کم رہ گئی ہیں!--- اس نکڑ پر سکھی بھٹیارن کی بھٹی تھی جہاں اب یہ پان والا بیٹھا ہے--- یہ نمک منڈی دیکھ لو، خان صاحب! یہاں کی ایک ایک لالائن وہ نمکین ہوتی ہے کہ بس---

بہت دنوں کے بعد بازاروں میں طرہ دار پگڑیاں اور لال ترکی ٹوپیاں نظر آ رہی تھیں۔ لاہور سے آئے ہوئے مسلمانوں میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جنھیں بٹوارے کے وقت مجبور ہو کر امرتسر چھوڑ کر جانا پڑا تھا۔ ساڑھے سات سال میں آئی بہت سی تبدیلیوں کو دیکھ کر کہیں ان کی آنکھوں میں حیرانی بھر جاتی اور کہیں افسوس گھر آتا۔ واللہ، کٹڑہ جیمل سنگھ اتنا چوڑا کیسے ہو گیا؟ کیا اس طرف کے سب مکان جل گئے؟ یہاں حکیم آصف علی کی دکان تھی نا؟ اب یہاں ایک موچی نے قبضہ کر رکھا ہے---

اور کہیں کہیں ایسی بھی باتیں سنائی دے جاتیں: ولی، یہ مسجد جوں کی توں کھڑی ہے؟ ان لوگوں نے اس کا گردوارہ نہیں بنایا؟

Scanned with CamScanner

جس راستے سے پاکستانیوں کی ٹولی گزرتی، شہر کے لوگ مشتاق ہو کر اس کی طرف دیکھتے رہتے۔ کچھ لوگ اب بھی مسلمانوں کو آتے دیکھ کر خوف زدہ سے ہو کر راستے سے ہٹ جاتے، جب کہ دوسرے لوگ بڑھ کر ان سے بغل گیر ہونے لگتے۔ زیادہ تر وہ آنے والوں سے ایسے ایسے سوال پوچھتے کہ آج کل لاہور کا کیا حال ہے؟ انار کلی میں اب پہلے جتنی رونق ہوتی ہے یا نہیں؟ سنا ہے شاہ عالمی گیٹ کا بازار پورا نیا بنا ہے؟ کرشن نگر میں تو خاص تبدیلی نہیں آئی؟ وہاں کا رشوت پورہ کیا واقعی رشوت کے پیسے سے بنا ہے؟ کہتے ہیں پاکستان میں اب برقع بالکل اُڑ گیا ہے، یہ ٹھیک ہے؟ ان سوالوں میں اتنا اپنا پن جھلکتا تھا کہ لگتا تھا لاہور ایک شہر نہیں ہزاروں لوگوں کا سگا سمبندھی ہے جس کے حالات جاننے کے لیے وہ بے چین ہیں۔ لاہور سے آئے ہوئے لوگ اس دن شہر بھر کے مہمان تھے جن سے مل کر اور باتیں کر کے لوگوں کو خواہ مخواہ خوشی کا احساس ہوتا تھا۔

بازار بانساں امرتسر کا ایک عام سا بازار ہے، جو بٹوارے سے پہلے غریب مسلمانوں کی بستی تھی۔ وہاں زیادہ تر بانسوں اور شہتیروں کی دکانیں تھیں جو سب کی سب ایک ہی آگ میں جل گئی تھیں۔ بازار بانساں کی وہ آگ امرتسر کی سب سے بھیانک آگ تھی جس سے کچھ دیر کے لیے تو سارے شہر کے جل جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ بازار بانساں کے آس پاس کے کئی محلوں کو تو اس آگ نے اپیٹ میں لے ہی لیا تھا۔ خیر، کسی طرح وہ آگ قابو میں آ تو گئی پر اس میں مسلمانوں کے ایک ایک گھر کے ساتھ ہندوؤں کے بھی چار چار چھ چھ گھر جل کر راکھ ہو گئے۔ اب ساڑھے سات سال میں ان میں کئی عمارتیں پھر سے کھڑی ہو گئی تھیں مگر جگہ جگہ ملبے کے ڈھیر اب بھی موجود تھے۔ نئی عمارتوں کے بیچ بیچ میں ملبے کے ڈھیر عجیب ہی ماحول پیش کرتے تھے۔

بازار بانساں میں اس دن بھی چہل پہل تھی کیوں کہ بازار کے زیادہ تر باشندے تو اپنے مکانوں کے ساتھ ہی شہید ہو گئے تھے اور جو بچ کر چلے گئے تھے ان میں سے شاید کسی میں بھی لوٹ کر آنے کی ہمت باقی نہیں رہی تھی۔ صرف ایک دبلا پتلا بوڑھا مسلمان ہی اس بازار میں آیا اور وہاں کی نئی اور جلی ہوئی عمارتوں کو دیکھ کر جیسے بھول بھلیاں میں پڑ گیا۔ بائیں ہاتھ کو جانے والی گلی کے پاس پہنچ کر اس کے قدم اندر مڑنے کو ہوئے، مگر پھر وہ ہچکچا کر وہاں باہر ہی کھڑا رہ گیا، جیسے اسے وشواس نہ ہو کہ یہ وہی گلی ہے یا نہیں جس میں وہ جانا چاہتا ہے۔ گلی میں ایک طرف کچھ بچے کیڑی کاڑا کھیل رہے تھے اور کچھ دور پر دو عورتیں اونچی آواز میں چیختی ہوئی ایک دوسرے کو گالیاں دے رہی تھیں۔

سب کچھ بدل گیا ہے مگر بولیاں نہیں بدلیں، بوڑھے مسلمان نے دھیمے لہجے میں اپنے سے کہا اور چھڑی کا سہارا لیے کھڑا رہا۔ اس کے گھٹنے پاجامے سے باہر نکل رہے تھے اور گھٹنوں کے تھوڑا ہی اوپر اس کی شیروانی میں تین چار پیوند لگے تھے۔ گلی سے ایک بچہ روتا ہوا باہر کو آ رہا تھا۔ اس نے اسے پچکار کر کہا، ادھر آ بیٹے، آ ادھر! دیکھ، تجھے چیجی دیں گے۔ آ! اور وہ اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اسے دینے کے لیے کوئی چیز ڈھونڈنے لگا۔ بچہ لمحہ بھر کے لیے چپ کر گیا لیکن پھر اس نے ہونٹ بسور لیے اور رونے لگا۔

Scanned with CamScanner

ایک سولہ سترہ برس کی لڑکی دوڑتی ہوئی آئی اور بچے کی بانہہ پکڑ کر اسے گھسیٹتی ہوئی گلی میں لے چلی۔ بچہ روتے ہوئے اپنی بانہہ چھڑانے کے لیے مچلنے لگا۔ لڑکی نے اسے بانہوں میں اٹھا کر چھاتی کے ساتھ چمٹا لیا اور اس کا منہ چومتے ہوئے بولی، چپ کر میرے ویر! روئے گا تو تجھے وہ مسلمان پکڑ کر لے جائے گا۔ میں واری جاؤں، چپ کر!

بوڑھے مسلمان نے بچے کو دینے کے لیے جو پیسا نکالا تھا وہ واپس جیب میں رکھ لیا۔ سر سے ٹوپی اتار کر اس نے وہاں کھجایا اور ٹوپی بغل میں دبا لی۔ اس کا گلا خشک ہو رہا تھا اور گھٹنے ذرا ذرا کانپ رہے تھے۔ اس نے گلی کے باہر کی ایک دکان کے تختے کا سہارا لے لیا اور ٹوپی پھر سے سر پر ڈال لی۔ گلی کے سامنے، جہاں پہلے اونچے اونچے شہتیر رکھے رہتے تھے، وہاں اب ایک تین منزلہ مکان کھڑا تھا۔ سامنے بجلی کے تار پر دو موٹی موٹی چیلیں بالکل ساکت بیٹھی تھیں۔ بجلی کے کھمبے کے پاس تھوڑی دھوپ تھی۔ وہ کئی پل دھوپ میں اڑتے ہوئے ذروں کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کے منہ سے نکلا، یا مالک!

ایک نوجوان بالٹی کا کڑا گھماتا ہوا گلی کی طرف آیا۔ بوڑھے کو کھڑا دیکھ کر اس نے رک کر پوچھا، کہیے میاں جی، یہاں کس طرح کھڑے ہیں؟

بوڑھے مسلمان کی چھاتی اور بانہوں میں ہلکی سی کپکپی ہوئی اور اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر نوجوان کو دھیان سے دیکھتے ہوئے کہا، بیٹے، تم منوری ہی نہیں ہو؟

نوجوان نے بالٹی کا کڑا بند کر کے مٹھی میں لے لیا اور حیرت کے ساتھ پوچھا، آپ کو میرا نام کیسے پتا ہے؟

میں نے تمہیں پہلے تو چھوٹا سا دیکھا تھا۔ یہ کہہ کر بوڑھے نے مسکرانے کی کوشش کی۔

آپ آج پاکستان سے آئے ہیں؟ منوری نے پوچھا۔

ہاں۔ مگر پہلے ہم اسی گلی میں رہتے تھے، بوڑھے نے کہا۔ میرا لڑکا چراغ دین تم لوگوں کا درزی تھا۔ تقسیم سے چھ مہینے پہلے ہم لوگوں نے یہاں نیا مکان بنوایا تھا۔

او، غنی میاں! منوری نے پہچان کر کہا۔

ہاں بیٹے، میں تم لوگوں کا غنی میاں ہوں۔ چراغ اور اس کے بیوی بچے تو نہیں مل سکتے، مگر میں نے سوچا کہ ایک بار مکان کی صورت ہی دیکھ لوں۔ اور اس نے ٹوپی اتار کر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آنسوؤں کو بہنے سے روک لیا۔

آپ تو شاید کافی پہلے ہی یہاں سے چلے گئے تھے، منوری نے لہجے میں ہمدردی لا کر کہا۔

ہاں بیٹے، یہ میری بدنصیبی تھی کہ میں پہلے اکیلا نکل کر چلا گیا۔ یہاں رہتا تو اس کے ساتھ میں بھی---

وہ کہتے کہتے اسے احساس ہوا کہ اسے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے۔ اس نے بات منہ میں روک لی، مگر آنکھ میں آئے ہوئے آنسوؤں کو بہہ جانے دیا۔

چھوڑو غنی میاں، اب ان باتوں کو سوچنے میں کیا رکھا ہے! منوری نے غنی کی بانہہ پکڑ کر کہا۔

Scanned with CamScanner

"چلو، تمہیں تمہارا گھر دکھا دوں۔"

گلی میں خبر اس روپ میں پھیلی تھی کہ گلی کے باہر ایک مسلمان کھڑا ہے جو رام داسی کے لڑکے کو اٹھانے جا رہا تھا۔ اس کی بہن اسے پکڑ کر گھسیٹ لائی، نہیں تو مسلمان اسے لے گیا ہوتا۔ یہ خبر پاتے ہی جو عورتیں گلی میں پیڑھے بچھا کر بیٹھی تھیں، وہ اپنے اپنے پیڑھے اٹھا کر گھروں کے اندر چلی گئیں۔ گلی میں کھیلتے ہوئے بچوں کو بھی ان عورتوں نے پکار پکار کر گھروں میں بلا لیا۔ منوری جب غنی کو لے کر گلی میں آیا تو گلی میں ایک پھیری والا رہ گیا تھا یا کنویں کے ساتھ لگے پیپل کے نیچے رکھا پہلوان بکھر کر سویا پڑا تھا۔ گھروں کی کھڑکیوں میں سے اور کواڑوں کے پیچھے سے البتہ کئی چہرے جھانک رہے تھے۔ غنی کو گلی میں آتے دیکھ کر ان میں ہلکی ہلکی چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ داڑھی کے سب بال سفید ہو جانے کے باوجود لوگوں نے چراغ دین کے باپ عبدالغنی کو پہچان لیا تھا۔

"وہ تھا تمہارا مکان،" منوری نے دور ایک ملبے کی طرف اشارہ کیا۔ غنی پل بھر کے لیے ٹھٹھک کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس طرف دیکھتا رہا۔ چراغ اور اس کے بیوی بچوں کی موت کو تو وہ کافی عرصہ پہلے تسلیم کر چکا تھا، مگر اپنے نئے مکان کو اس روپ میں دیکھ کر اسے جو جھرجھری ہوئی اس کے لیے وہ تیار نہ تھا۔ اس کی زبان پہلے سے زیادہ خشک ہو گئی اور گھٹنے بھی اور زیادہ کانپنے لگے۔

"وہ ملبہ؟" اس نے بے یقینی کے سے لہجے میں کہا۔

منوری نے اس کے چہرے کا بدلا ہوا رنگ دیکھا۔ اس کی بانہہ کو اور سہارا دے کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا، "تمہارا مکان انہی دنوں جل گیا تھا۔"

غنی چھڑی کا سہارا لیتا ہوا کسی طرح ملبے کے پاس پہنچ گیا۔ ملبے میں اب مٹی ہی مٹی تھی جس میں جہاں تہاں ٹوٹی اور جلی ہوئی اینٹیں پھنسی تھیں۔ لوہے اور لکڑی کا سامان اس میں سے نہ جانے کب کا نکال لیا گیا تھا۔ صرف جلے ہوئے دروازے کی چوکھٹ نہ جانے کیسے بچ رہ گئی تھی جو ملبے میں سے باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ پیچھے کی طرف دو جلی ہوئی الماریاں تھیں جن کی کالک پر اب سفیدی کی ہلکی ہلکی تہہ ابھر آئی تھی۔ ملبے کو پاس سے دیکھ کر غنی نے کہا، "یہ باقی رہ گیا ہے؟ یہ؟" اور جیسے اس کے گھٹنے جواب دے گئے اور وہ جلی ہوئی چوکھٹ کو پکڑ کر بیٹھ گیا۔ لمحہ بھر بعد اس کا سر بھی چوکھٹ سے جا لگا اور اس کے منہ سے بلکنے کی سی آواز نکلی، "ہائے اوئے، اوئے چراغ دین!"

جلے ہوئے کواڑ کی چوکھٹ ساڑھے سات سال ملبے میں سے سر نکالے کھڑی تو رہی تھی مگر اس کی لکڑی بری طرح بھربھرا گئی تھی۔ غنی کے سر کے چھونے سے اس کے کئی ریشے جھڑ کر گر گئے۔ کچھ ریشے غنی کی ٹوپی اور بالوں پر آ گرے۔ لکڑی کے ریشوں کے ساتھ ایک کیچوا بھی نیچے گرا اور غنی کے پیر سے چھ آٹھ انچ دور نالی کے ساتھ لگی اینٹوں کی پٹڑی پر سرسرانے لگا۔ وہ چھپنے کے لیے سوراخ ڈھونڈتا ہوا ذرا سا سر اٹھاتا، مگر ایک دو بار سر پٹک کر اور مایوس ہو کر دوسری طرف کو مڑ جاتا۔

کھڑکیوں میں سے جھانکنے والے چہروں کی تعداد اب پہلے سے کہیں بڑھ گئی تھی۔ ان میں چہ

Scanned with CamScanner

چمیگوئیاں چل رہی تھیں کہ آج کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ چراغ دین کا باپ غنی آ گیا ہے، اس لیے ساڑھے سات سال پہلے کی ساری بات آج کھل جائے گی۔ لوگوں کو لگ رہا تھا جیسے وہ ملبہ ہی غنی کو ساری کہانی سنا دے گا کہ شام کے وقت چراغ اوپر کے کمرے میں کھانا کھا رہا تھا جب رکھے پہلوان نے اسے نیچے بلایا کہ ایک منٹ آ کر ایک ضروری بات سن جائے۔ پہلوان اُن دنوں گلی کا بادشاہ تھا۔ ہندوؤں پر ہی اس کا کافی دبدبہ تھا، چراغ تو خیر مسلمان تھا۔ چراغ ہاتھ سے نوالہ رکھ کر نیچے اُتر آیا۔ اس کی بیوی زبیدہ اور دونوں لڑکیاں کشور اور سلطانہ کھڑکیوں میں سے نیچے جھانکنے لگیں۔ چراغ نے ڈیوڑھی سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ پہلوان نے اسے قمیص کے کالر سے پکڑ کر کھینچ لیا اور گلی میں گرا کر اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ چراغ اس کا چھُرے والا ہاتھ پکڑ کر چلایا، "نہ، رکھے پہلوان، مجھے مت مار! ہائے! کوئی مجھے بچاؤ! زبیدہ، مجھے بچا!" اور اوپر زبیدہ، کشور اور سلطانہ بدحواس ہو کر چلانے لگیں۔ زبیدہ چیختی ہوئی نیچے ڈیوڑھی کی طرف بھاگی۔ رکھے کے ایک شاگرد نے چراغ کی جدوجہد کرتی ہوئی بانہیں پکڑ لیں اور رکھا اس کی جانگھوں کو گھٹنے سے دبائے ہوئے بولا، "چیختا کیوں ہے، بہن کے۔۔۔ تجھے پاکستان دے رہا ہوں لے!" اور زبیدہ کے نیچے پہنچنے سے پہلے ہی چراغ کو پاکستان دے دیا۔

آس پاس کے گھروں کی کھڑکیاں بند ہو گئیں۔ جو لوگ اس منظر کے گواہ تھے انھوں نے اپنے دروازے بند کر کے اپنے کو اس واقعے کی جواب دہی سے آزاد کر لیا۔ بند کواڑوں میں بھی انھیں دیر تک زبیدہ، کشور اور سلطانہ کے چیخنے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ رکھے پہلوان اور اس کے ساتھیوں نے انھیں بھی اُسی رات پاکستان دے کر وداع کر دیا، مگر دوسرے طویل راستے سے۔ ان کی لاشیں چراغ کے گھر میں نہیں بلکہ بعد میں نہر کے پانی میں پائی گئیں۔

دو دن تک چراغ کے گھر کی چھان بین ہوتی رہی تھی۔ جب اُس کا سارا سامان لوٹا جا چکا تو نہ جانے کس نے اس گھر کو آگ لگا دی۔ رکھے پہلوان نے قسم کھائی تھی کہ وہ آگ لگانے والے کو زندہ زمین میں گاڑ دے گا، کیوں کہ اس نے اس مکان پر نظر رکھ کر ہی چراغ کو مارنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس نے اس مکان کو شدھ کرنے کے لیے ہون سامگری بھی خرید رکھی تھی۔ مگر آگ لگانے والے کا پتا ہی نہیں چل پایا، اسے زندہ گاڑنے کی نوبت تو بعد میں آتی۔ اب ساڑھے سات سال سے رکھا پہلوان اس ملبے کو اپنی جاگیر سمجھتا آ رہا تھا، جہاں وہ نہ کسی کو گائے بھینس باندھنے دیتا تھا اور نہ خوانچہ لگانے دیتا تھا۔ اس ملبے سے اس کی اجازت کے بغیر کوئی اینٹ بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔

لوگ امید کر رہے تھے کہ یہ ساری کہانی ضرور کسی نہ کسی طرح غنی کے کانوں تک پہنچ جائے گی، جیسے ملبے کو دیکھ کر اسے اپنے آپ ہی پورے واقعے کا پتا چل جائے گا۔ اور غنی ملبے کی مٹی ناخونوں سے کھود کھود کر اپنے اوپر ڈال رہا تھا اور دروازے کی چوکھٹ کو باہوں میں لیے رو رہا تھا۔ "بول چراغ دینا، بول! تو کہاں چلا گیا اوئے! او کشور! او سلطانہ! ہائے میرے بچے اوئے! غنی کو کہاں چھوڑ گئے اوئے!"

اور بھُر بھُرے سے لکڑی کے ریشے جھڑتے جا رہے تھے۔

Scanned with CamScanner

پیپل کے نیچے سوئے ہوئے رنگے پہلوان کو نہ جانے کسی نے جگا دیا یا وہ خود ہی جاگ گیا۔ یہ جان کر کہ پاکستان سے عبدالغنی آیا ہے اور اپنے مکان کے ملبے پر بیٹھا ہے، اس کے گلے میں تھوڑا جھاگ اٹھ آیا جس سے اسے کھانسی ہو آئی اور اس نے کنویں کے فرش پر تھوک دیا۔ ملبے کی طرف دیکھ کر اس کی چھاتی سے دھونکنی کی سی آواز نکلی اور اس کا نچلا ہونٹ تھوڑا باہر کو پھیل گیا۔

"غنی اپنے ملبے پر بیٹھا ہے،" اس کے شاگرد لچھے پہلوان نے اس کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ملبہ اُس کا کیسے ہے؟ ملبہ ہمارا ہے!" پہلوان نے جھاگ کی وجہ سے بھاری ہوئی آواز میں کہا۔

"مگر وہ وہاں پر بیٹھا ہے،" لچھے نے آنکھوں میں پُراسرار اشارہ لاتے ہوئے کہا۔

"بیٹھا رہنے دے۔ تو چلم لا!" اس کی ٹانگیں تھوڑی پھیل گئیں اور اس نے اپنی ننگی جانگھوں پر ہاتھ پھیرا۔

"منوری نے اگر اُسے کچھ بتا دیا تو...؟" لچھے نے چلم بھرنے کے لیے اٹھتے ہوئے اُسی پُراسرار نظر سے دیکھ کر کہا۔

"منوری کی شامت آئی ہے؟"

لچھا چلا گیا۔

کنویں پر پیپل کی پرانی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ رنگا ان پتیوں کو اٹھا اٹھا کر ہاتھوں میں مسلتا رہا۔ جب لچھے نے چلم کے نیچے کپڑا لگا کر اس کے ہاتھ میں دیا تو اس نے کش کھینچتے ہوئے پوچھا، "اور تو کسی سے غنی کی بات نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔"

"لو،" اس نے کھانستے ہوئے چلم لچھے کے ہاتھ میں دے دی۔ لچھے نے دیکھا کہ منوری ملبے کی طرف سے غنی کی بانہہ پکڑے ہوئے آ رہا ہے۔ وہ اکڑوں ہو کر چلم کے لمبے لمبے کش کھینچنے لگا۔ اس کی آنکھیں آدھا لمحہ رنگے کے چہرے پر جمتیں اور آدھا لمحہ غنی کی طرف لگی رہتیں۔

منوری غنی کی بانہہ پکڑے ہوئے اس سے ایک قدم آگے چل رہا تھا، جیسے اس کی کوشش ہو کہ غنی کنویں کے پاس سے بنا رنگے پہلوان کو دیکھے ہی نکل جائے۔ مگر رنگا جس طرح بکھر کر بیٹھا تھا، اس سے غنی نے اُسے دور ہی سے دیکھ لیا۔ کنویں کے پاس پہنچتے پہنچتے اس کی دونوں باہیں پھیل گئیں اور اس نے کہا، "رنگے پہلوان!"

رنگے نے گردن اٹھا کر اور آنکھیں ذرا چھوٹی کر کے اُسے دیکھا۔ اس کے گلے میں ہلکی سی گھرگھراہٹ ہوئی، پر وہ بولا کچھ نہیں۔

"رنگے پہلوان! مجھے پہچانا نہیں؟" غنی نے باہیں نیچے کر کے کہا۔ "میں غنی ہوں، عبدالغنی۔ چراغ دین کا باپ!"

پہلوان نے شک بھری نظر سے اس کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا۔ عبدالغنی کی آنکھوں میں اُسے

Scanned with CamScanner

دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ [illegible] سے چکنے [illegible] کے چہرے کی [illegible] چمکیں گئی تھیں۔ [illegible] کا پچلا ہونٹ پھڑکا، پھر اس کی چھاتی سے [illegible] نکلی، [illegible]!

[illegible] جیسے [illegible] ہو رہیں۔ [illegible] دیکھ کر اسی طرف [illegible] گئیں۔ وہ [illegible] کا [illegible] کے [illegible] پر بیٹھ گیا۔

[illegible] بیٹھیاں [illegible] کہ جب وہ دونوں [illegible] ہیں تو بات ضرور [illegible] کی۔ پھر ہو سکتے ہیں [illegible] کالی [illegible] کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جب [illegible] نہیں [illegible] کا [illegible] ہے۔ وہ دو [illegible] کا [illegible] سمجھ نہیں [illegible] دیکھ [illegible] ہے۔ [illegible] نہیں [illegible] ہے۔ [illegible] کی طرح [illegible] گھومتا ہے۔ [illegible] سے [illegible] ہو۔۔۔

[illegible] کھڑکی [illegible] سے [illegible] پوچھے گئے، تو [illegible] کی چھوڑ [illegible] ہیں۔

[illegible] سے [illegible] کے [illegible] ہیں [illegible] سے [illegible] کردے [illegible] گیا۔

[illegible] سو روکتا ہوا بڑے اصرار کے ساتھ بولا۔ "تم لوگ اس [illegible] تھی۔ [illegible] نہیں چپ [illegible] گئی؟"

[illegible] کچھ [illegible] کون ہے۔ [illegible] ہونٹ [illegible] سے [illegible] تھے۔ [illegible] پیچھے [illegible] ہو [illegible] کا [illegible] تھی۔

[illegible] کے [illegible] پوچھا۔ [illegible] کی [illegible] تھا [illegible] کا [illegible] کھینچ [illegible] دیا۔

[illegible] ہاتھوں سے [illegible] کرتے ہوئے بولا۔ "میں [illegible] بات تھی۔۔۔ [illegible] چھوڑ [illegible] جیسے [illegible] یہاں ایک [illegible] ہے، کوئی [illegible] تو [illegible] سکتا ہے۔ [illegible] کی [illegible] سے [illegible] کے [illegible] ہی [illegible]"

Scanned with CamScanner

رکھے نے سیدھا ہونے کی کوشش کی، کیوں کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی درد کر رہی تھی۔ اُسے اپنی کمر اور جانگھوں کے جوڑ پر سخت دباؤ محسوس ہو رہا تھا۔ پیٹ کی انتڑیوں کے پاس جیسے کوئی چیز اس کی سانس کو جکڑ رہی تھی۔ اس کا سارا جسم پسینے سے بھیگ گیا تھا اور پیروں کے تلووں میں چنچناہٹ ہو رہی تھی۔ بیچ بیچ میں نیلی پھلجھڑیاں سی اوپر سے اُترتیں اور اس کی آنکھوں کے سامنے تیرتی ہوئی نکل جاتیں۔ اُسے اپنی زبان اور ہونٹوں کے بیچ کا فاصلہ کچھ زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے انگوچھے سے ہونٹوں کے کونوں کو صاف کیا اور اس کے منہ سے نکلا، ”ہے پربھو سچیا، تو ہی ہے، تو ہی ہے، تو ہی ہے!“

غنی نے محسوس کیا کہ پہلوان کے ہونٹ سوکھ رہے ہیں اور اس کی آنکھوں کے ارد گرد دائرے گہرے ہو گئے ہیں، تو وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا، ”جی ہلکا نہ کر رکھیا! جو ہونی تھی سو ہو گئی۔ اُسے کوئی لوٹا تھوڑی سکتا ہے! خدا نیک کی نیکی رکھے اور بد کی بدی معاف کرے۔ میرے لیے چراغ نہیں تو تم لوگ تو ہو۔ مجھے آ کر اس بات کی بڑی تسلی ہوئی کہ اس زمانے کی کوئی تو یادگار ہے۔ میں نے تم کو دیکھ لیا تو چراغ کو دیکھ لیا۔ خدا تم لوگوں کو صحت مند رکھے۔ جیتے رہو اور خوشیاں دیکھو!“ اور غنی چھڑی پر دباؤ دے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ چلتے ہوئے اس نے یہ کہا، ”رکھے پہلوان، یاد رکھنا۔“

رکھے کے گلے میں سے ہامی بھرنے کی مدھم سی آواز نکلی۔ انگوچھا بیچ میں لیے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ غنی گلی کے ماحول کو حسرت بھری نظر سے دیکھتا ہوا دھیرے دھیرے گلی سے باہر چلا گیا۔

اوپر کھڑکیوں میں تھوڑی دیر چہ میگوئیاں چلتی رہیں کہ منوری نے گلی سے باہر نکل کر ضرور غنی کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ غنی کے سامنے رکھے کا تالو کس طرح خشک ہو گیا تھا! اب کس منہ سے لوگوں کو ملبے پر گائے باندھنے سے روکے گا؟ بے چاری زبیدہ! کتنی اچھی تھی، کبھی کسی سے منہ سے نہیں بولی۔ رکھے مردود کا گھر نہ گھاٹ، اسے کس ماں بہن کا لحاظ تھا!

اور تھوڑی ہی دیر میں عورتیں گھروں سے گلی میں اتر آئیں۔ بچے گلی میں گلی ڈنڈا کھیلنے لگے اور دو بارہ تیرہ برس کی لڑکیاں کسی بات پر گتھم گتھا ہو گئیں۔

رکھا گہری شام تک کنوئیں پر بیٹھا کھنکھارتا اور چلم پھونکتا رہا۔ کئی لوگوں نے یہاں سے گزرتے ہوئے اُس سے پوچھا، ”رکھے شاہ، سنا ہے آج غنی پاکستان سے آیا تھا؟“

”ہاں، آیا تھا۔“ رکھے نے ہر بار ایک ہی جواب دیا۔

”پھر؟“

”پھر کچھ نہیں۔ چلا گیا۔“

رات ہونے پر پہلوان روز کی طرح گلی کے باہر بائیں ہاتھ کی دکان کے تختے پر آ بیٹھا۔ روز اکثر وہ راستے سے گزرنے والے جان پہچان کے لوگوں کو آواز دے کر بُلا لیتا اور انہیں سٹے کے گُر اور صحت کے نسخے بتایا کرتا تھا۔ مگر اُس دن وہ لچھے کو اپنی وشنو دیوی کی اُس یاترا کی روداد سناتا رہا جو اُس نے پندرہ سال پہلے کی تھی۔ لچھے کو وداع کر کے وہ گلی میں آیا تو ملبے کے پاس لوکو پنڈت کی بھینس کو کھڑا دیکھ کر روز کی

عادت کے مطابق اسے دھکے دے دے کر جگانے لگا: تت، تت، تت...

عیسیٰ کو تھکا کر وہ سستانے کے لیے مٹھ کی چوکھٹ پر بیٹھ گیا۔ گلی اس سے بالکل سنسان تھی۔ کھنڈر کی تنگی ہونے سے وہاں شام ہی سے اندھیرا ہو جاتا تھا۔ مٹھ کے نیچے نالی کا پانی ہلکی آواز کرتا ہوا بہہ رہا تھا۔ رات کی خاموشی کے ساتھ ہی ہوا کسی طرح کی ہلکی ہلکی آوازیں ملبے کی مٹی میں سے نکل رہی تھیں: چیو چیو چیو... چک چک چک... چرر چرر... ری ری، ری ری... چرر... ایک کوا، جو نہ جانے کہاں سے اڑ کر لکڑی کی چوکھٹ پر آ بیٹھا۔ اس نے لکڑی کے ریشے ادھر ادھر بکھیر دیے۔ کوے نے وہاں بیٹھے بیٹھے مٹھ کے ایک کونے میں لیٹا ہوا کتا کو دیکھا اور زور زور سے بھونکنے لگا: ووو وو! کوا کچھ دیر سہما ہوا سا چوکھٹ پر بیٹھا رہا، پھر پنکھ پھڑپھڑاتا ہوا اڑ کر کنویں کے پیپل پر چلا گیا۔ کوے کے اڑ جانے پر کتا اور نیچے اتر آیا اور پہلوان کی طرف منہ کر کے بھونکنے لگا۔ پہلوان اسے ہٹانے کے لیے بھاری آواز میں بولا، 'دُر دُر دُر... دُر رے!'

مگر کتا اور پاس آ کر بھونکنے لگا: وووووووو!

'ہٹ ہٹ، دُر دُر دُر رے!'

'وووووووو!'

پہلوان نے ایک ڈھیلا اٹھا کر کتے کی طرف پھینکا۔ کتا تھوڑا پیچھے ہٹ گیا، پر اس کا بھونکنا بند نہیں ہوا۔ پہلوان مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھا رہا۔ کتا وہاں سے سر جھکائے ہوا اور دھیرے دھیرے جا کر ملبے کی ڈھیری پر بیٹھ گیا۔ پہلوان کے وہاں سے ہٹتے ہی کتا گلی میں نکل آیا اور کنویں کی طرف منہ کر کے بھونکنے لگا۔ کافی دیر بھونک کر جب گلی میں سے کوئی جواب نہیں ملا تو وہ ایک بار کان جھٹک کر مٹھ پر لوٹ آیا اور وہاں کونے میں بیٹھ کر غرانے لگا۔

**

# بھیشم ساہنی

ہندی سے ترجمہ: عبدالعظیم سوہرو

## وانگ چُو

تبھی دور سے وانگ چُو آتا دکھائی دیا۔

ندی کے کنارے، لال منڈھی کی سڑک پر دھیرے دھیرے ڈولتا سا چلا آ رہا تھا۔ دھوسر (زرد) رنگ کا چوغہ پہنے تھا اور دور سے لگتا تھا کہ بودھ بھکشوؤں ہی کی طرح اُس کا بھی سر گھٹا ہوا ہے۔ پیچھے شنکر آچاریہ کی اونچی پہاڑی تھی اور اوپر صاف نیلا آسمان۔ سڑک کی دونوں جانب اونچے اونچے سفیدے کے پیڑوں کی قطاریں۔ ایک لمحہ کے لیے مجھے لگا جیسے وانگ چُو تاریخ کے صفحات میں سے نکل کر آ گیا ہے۔ پرانے زمانے میں اسی طرح دیس بدیس سے آنے والے چیور دھاری بھکشو پہاڑوں اور گھاٹیوں کو پار کر کے بھارت میں آیا کرتے ہوں گے۔ ماضی کے ایسے ہی رومانی دھندلکے میں مجھے وانگ چُو بھی چلتا ہوا نظر آیا۔ جب سے سری نگر میں آیا تھا، بودھ وہاروں (مندروں) کے کھنڈروں اور سنگرہالیوں (عجائب خانوں) میں گھوم رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ لال منڈھی کے سنگرہالے سے نکل کر آ رہا تھا جہاں بودھ زمانے کے کئی آثار رکھے ہوئے ہیں۔ اس کی کیفیت کو دیکھتے ہوئے لگتا تھا کہ وہ سچ مچ حال سے کٹ کر ماضی کے ہی کسی زمانے میں چل پھر رہا تھا۔

'بدھستو سے ملاقات ہو گئی؟' پاس آنے پر میں نے چٹکی لی۔

وہ مسکرا دیا، ہلکی ٹیڑھی سی مسکان جسے میری خالہ زاد بہن ڈیڑھ دانت کی مسکان کہا کرتی تھی، کیوں کہ مسکراتے وقت وانگ چُو کا اوپر کا ہونٹ صرف ایک جانب سے تھوڑا سا اوپر کو اٹھتا تھا۔

'سنگرہالے کے باہر بہت سی مورتیاں رکھی ہیں۔ میں وہی دیکھتا رہا،' اس نے دھیمے سے کہا۔ پھر اچانک جذباتی ہو کر بولا، 'ایک مورتی کے صرف پیر ہی بچے ہیں۔'

Scanned with CamScanner

اس نے سوچا آپ نے کچھ کہے گا، مگر وہ صدمے سے اتنا مغلوب ہو گیا تھا کہ اس کا گلا رندھ گیا اور اس کے لیے بولنا ناممکن ہو گیا۔

ہم ایک ساتھ گھر کی طرف لوٹنے لگے۔

سارے راستے ابا اسی طرح پیچھے دکھ سے چلے جاتے تھے۔ [illegible] کانپتی ہوئی آواز میں کہا، وہ پہلا [illegible] دیا۔ اس کے اندر ہلکی سی کپکپاہٹ دھڑکتے دل کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔

شام [illegible] ہمیں سنائی جاتی تھیں [illegible] تم تو جانتے ہی ہو پہلے سٹوپ کے نیچے [illegible] کھانے پڑتے تھے۔ وہ باتیں تو جھ میں بھلی ہونے لگی تھیں۔

[illegible] بستر پر دیکھ [illegible] مہاپران کے پیر یاد آتے تھے اور وہ جدھر چلی ہوئی تھا۔ کچھ بات ہمیں پتا تھا [illegible] اس وقت وانگ چو کو پکاسے (بدہ بھی کرے) گئے اور اس وقت وہ خوشی سے کھل اٹھے۔

تم نے بہت دیر کر دی۔ سب لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ میں چناروں کے نیچے سے تمہیں دیکھ آیا، میں نے کہا۔

میں سنگھ رام سے ملنے جا رہا تھا۔

وہ تو ٹھیک ہے، [illegible] تک ہمیں سنا کہ وہ پہنچ جانا چاہیے ورنہ جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

اس نے چھوٹے چھوٹے جھٹکوں کے ساتھ دو تین بار سر ہلایا اور قدم بڑھا دیے۔

وانگ چو [illegible] میں ستوپ کے گرد گھوم رہا تھا۔ وہ مہاپران کے جسم، استھان لمبینی کی یاترا ننگے پاؤں کر چکا تھا [illegible] ہوئے۔ اس سمت میں مہاپران کے قدم اٹھے تھے، وانگ چو کو وہ اس کی سمت میں کھوٹ آیا تھا۔ سارناتھ میں، جہاں مہاپران نے پہلا پروچن (وعظ) کیا تھا اور دو [illegible] سے ساڑھی تک سے [illegible] کی طرف دیکھتے رہ گئے تھے، وانگ چو ایک پیپل کے پیڑ کے نیچے گھٹنوں کے بل بیٹھا رہا تھا، یہاں تک کہ اس کے کہنے کے مطابق اس کے ذہن میں لفظ صاف [illegible] جیسے وہ مہاپران کا پہلا پروچن سن رہا ہے۔ وہ جینتی کے اس تصور میں [illegible] [illegible] گنگا کی دھارا کو وہ سینکڑوں صدیوں کے دھندلکے میں سے مقدس [illegible] دیکھتا۔ جب سے وہ شمالی گڑھ میں آیا تھا، برف سے ڈھکے پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرف دیکھتے ہوئے [illegible] وہ استالماب کو جاتا ہے یا [illegible] بودھ [illegible] تبت میں پہنچے تھے۔ وہ [illegible] ہوتی مشتر کہ ماتا تھا کیوں کہ ان پر بھی پگڈنڈیوں کے راستے بودھ بھکشو تبت کی طرف گئے تھے۔

[illegible] ہی پہلے بودھ پروفیسر تان شان کے ساتھ بھارت آیا تھا۔ کچھ دنوں تک تو وہ انھیں کے ساتھ رہا [illegible] پھر پروفیسر شان چین لوٹ گئے اور وہ یہیں لگا رہا اور

Scanned with CamScanner

کسی بودھ سوسائٹی سے وظیفہ حاصل کر کے سارناتھ میں آ کر بیٹھ گیا۔ جذباتی، شاعرانہ مزاج کا شخص، جو قدیم زمانوں کے سحر انگیز ماحول میں سانس لیتے رہنا چاہتا تھا۔ وہ یہاں حقائق کی کھوج کرنے نہیں آیا تھا۔ وہ تو بودھستو کی مورتیوں کو دیکھ کر مسرت حاصل کرنے آیا تھا۔ جیسے عمر سے سنگ تراشوں نے پتھر کاٹ دیا تھا، لیکن اس نے کبھی نہیں بتایا کہ بودھ دھرم کی کون سی 'تعلیم' اسے سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے۔ نہ وہ کسی حقیقت کو دریافت کر کے مسرت سے کھل اٹھتا، نہ اسے کوئی شک پریشان کرتا۔ وہ عقیدت زیادہ اور حق جُو کم تھا۔

مجھے یاد نہیں کہ اس نے ہمارے ساتھ کبھی کھل کر بات کی ہو یا کسی موضوع پر بحث مباحثہ کی ہو۔ ان دنوں میرے اور میرے دوستوں کے بیچ گھنٹوں بحثیں چلا کرتیں، کبھی ملک کی سیاست کے بارے میں، کبھی مذہب کے بارے میں، لیکن وانگ چُو ان میں کبھی حصہ نہیں لیتا تھا۔ وہ سارا وقت دھیمے دھیمے مسکراتا رہتا اور کمرے کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھا رہتا۔ ان دنوں ملک میں ولولوں کا سیلاب سا اٹھ رہا تھا۔ آزادی کی تحریک زوروں پر تھی اور ہمارے درمیان اسی کا ذکر رہتا۔ کانگریس کون سی پالیسی اپنائے گی، تحریک کون سا رخ لے گی۔ عملی طور پر تو ہم لوگ کچھ کرتے کراتے نہیں تھے، لیکن جذبات کی سطح پر اس سے بہت زیادہ وابستہ تھے۔ اس پر وانگ چُو کی بے نیازی کبھی ہمیں کھلتی تو کبھی اچنبھے میں ڈال دیتی۔ وہ ہمارے ہی ملک کے معاملات میں نہیں، اپنے ملک کے معاملات میں بھی کوئی خاص دل چسپی نہیں لیتا تھا۔ اس کے اپنے ملک کے بارے میں بھی پوچھو تو مسکراتا سر ہلاتا رہتا تھا۔

کچھ دنوں سے سری نگر کی ہوا بھی بدلی ہوئی تھی۔ کچھ مہینے پہلے یہاں گولی چلی تھی۔ کشمیر کے لوگ مہاراجا کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اور اب کچھ دنوں سے شہر میں ایک نیا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ نہرو جی سری نگر آنے والے تھے اور ان کا استقبال کرنے کے لیے شہر کو دلہن کی طرح سجایا جا رہا تھا۔ آج دوپہر کو نہرو جی سری نگر پہنچ رہے تھے۔ ندی کے کنارے کشتیوں کے جلوس کی شکل میں انہیں لانے کا پروگرام تھا اور اسی وجہ سے میں وانگ چُو کو کھوجتا ہوا اس طرف آ نکلا تھا۔

ہم گھر کی طرف بڑھے جا رہے تھے کہ اچانک وانگ چُو ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا میرا جانا بہت ضروری ہے؟ جیسا تم کہو۔۔۔"

مجھے دھکا سا لگا۔ ایسے وقت میں جب لاکھوں لوگ نہرو جی کے استقبال کے لیے اکٹھے ہو رہے تھے، وانگ چُو کا یہ کہنا کہ اگر وہ ساتھ میں نہ جائے تو کیسا رہے، مجھے سچ مچ بُرا لگا۔ لیکن پھر خود ہی کچھ سوچ کر اس نے اپنی تجویز کو دہرایا نہیں اور ہم گھر کی طرف ساتھ ساتھ جانے لگے۔

کچھ دیر بعد ہم لوگ حبہ کدل کے پل کے قریب لاکھوں کی بھیڑ میں کھڑے تھے۔ میں، وانگ چُو اور میرے دو تین دوست۔ چاروں طرف جہاں تک نظر جاتی لوگ ہی لوگ تھے۔ مکانوں کی چھتوں پر، ندی کے ڈھلواں کناروں پر۔ میں بار بار کنکھیوں سے وانگ چُو کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس کا کیا ردعمل ہے، کہ ہمارے دل میں اٹھنے والے ولولوں کا اس پر کیا اثر ہوا ہے۔ یوں بھی یہ میری عادت سی بن گئی

Scanned with CamScanner

ہے کہ جب بھی کوئی ودیسی ساتھ میں ہوتا ہے، میں اُس کے چہرے کا تاثر پڑھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں کہ ہمارے بہت سے وطن، ہمارے رستے تھے اُن کے بارے میں اُس کا کیا ردِعمل ہوتا ہے۔ وانگ چو اُن کی مندری آنکھوں سے سامنے کا منظر دیکھے جا رہا تھا۔ جس وقت ہم وہی کی یاد سامنے آئی تو جیسے مکانوں کی چھتیں بھی مل نہیں۔ ... کی شکل کی سفید کشتی میں ہم وہی مقامی لیڈروں کے ساتھ کھڑے، ہاتھ ہلا ہلا کر لوگوں سے ملتیوں کا جواب دے رہے تھے۔ ہم میں جھول کی پھول تک گئے۔ میں نے پلٹ کر وانگ چو کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے کی طرح بے حس سا سامنے کا منظر دیکھ رہا تھا۔

"آپ پہلے ہم وہی آئے ہیں؟" ہم سے ایک ساتھی نے وانگ چو سے پوچھا۔

وانگ چو نے بڑی ٹیڑھی سی آنکھیں اٹھا کر اُن کے چہرے کی طرف دیکھا، پھر اپنی ڈبڈبا دوست کی مسکان کے ساتھ کہا، "اچھا، بہت اچھا۔"

وانگ چو معمولی سی سادی ... ہو جاتا تھا۔ اگر تیز ہو نہیں تو اُس کے چہرے پہ کچھ نہیں پڑھتا تھا۔

ہم وہی کی کشتی دور جا چکی تھی لیکن کشتیوں کا جلوس اب بھی چلتا جا رہا تھا جب وانگ چو اچانک مجھ سے بولا: میں تھوڑی دیر کے لیے سنگرا لے جانا چاہتا ہوں۔ اِدھر سے رستہ جاتا ہے، میں خود ہی چلا جاؤں گا۔ اور وہ دور کچھ کئے بغیر ایک بار دھیمی آنکھوں سے سنگرا اور کشتے سے ہاتھ ملا کر رہ گیا۔

ہم سب حیران رہ گئے۔ اسے جلوس سے دلچسپی نہیں رہی ہوگی جو تیز منڈی سنگرا لے کی طرف اکیلا چل دیا۔

"یہ کون ہوتا ہے؟ کہاں سے لائے ہو؟ یہ کیا چیز ہے؟ کہاں سے پکڑ رکھا ہے؟" میرے ایک دوست نے کہا۔

"ہندوستان آیا ہے ... ہماری باتوں میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے،" میں نے صفائی دیتے ہوئے کہا۔

"واہ، ملک میں اتنا کچھ ہو رہا ہو اور اسے دلچسپی ہی نہ ہو!"

وانگ چو جب تک دور جا چکا تھا اور میرا بیں سے نکل کر پیڑوں کی قطار کے نیچے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

"یہ کیسے لوگ ہیں؟" دوسرے دوست بولے۔ "یہ بولتا ہے نہ چہکتا ہے۔ کچھ پتا ہی نہیں چلتا ہنس رہا ہے یا رو رہا ہے۔ ہر وقت ایک کونے میں دبک کر بیٹھا رہتا ہے۔"

"نہیں نہیں، یہ سمجھ دار آدمی ہے۔ پچھلے پانچ سال سے یہاں پر رہ رہا ہے۔ بڑا پڑھا لکھا آدمی ہے۔ بودھ دھرم کے بارے میں بہت کچھ بتاتا ہے،" میں نے پھر اُس کی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

میرے ہی طرح میں اُن بات کی بڑی حیرت تھی کہ وہ بودھ گرنتھ پڑھتا ہے اور اُنہیں پڑھنے کے لیے اتنی دور سے آیا ہے۔

ہمیں پڑھیں جانے دیں بڑھائی او وہی، جلوس کو چھوڑ کر میوزیم کی طرف چل دیا!

Scanned with CamScanner

"سیدھی سی بات ہے یار!" میں نے جوڑا۔ "اسے یہاں بھارت کا جال کھینچ کر نہیں لایا، بھارت کا ماضی لایا ہے۔ ہیون سانگ بھی تو یہاں بودھ کتابیں پڑھنے ہی آیا تھا۔ یہ بھی عالم آدمی ہے۔ بودھ مت ہی سے اس کو دلچسپی ہے۔"

گھر لوٹتے ہوئے ہم لوگ سارا راستا وانگ چو ہی کی باتیں کرتے رہے۔ اجے کی رائے تھی کہ اگر وہ پانچ سال بھارت میں کاٹ گیا ہے تو اب زندگی بھر یہیں پر رہے گا۔

"اب آ گیا ہے تو لوٹ کر نہیں جائے گا۔ بھارت میں ایک بار پردیسی آ جائے تو لوٹنے کا نام نہیں لیتا۔"

"بھارت دیش وہ دلدل ہے جس میں ایک بار باہر کے آدمی کا پاؤں پڑ جائے تو وہ دھنستا ہی چلا جاتا ہے، نکلنا چاہے بھی تو نہیں نکل سکتا۔" دلیپ نے مذاق میں کہا، "معلوم نہیں کون سے کنول پھول توڑنے کے لیے اس دلدل میں گھسا ہے!"

"ہمارا دیس ہم ہندوستانیوں کو پسند نہیں، باہر کے لوگوں کو تو بہت پسند ہے۔" میں نے کہا۔

"پسند کیوں نہ ہوگا۔ یہاں تھوڑے میں گزر ہو جاتی ہے، سارا وقت دھوپ کھلی رہتی ہے، پھر باہر کے آدمی کو لوگ پریشان نہیں کرتے، جہاں بیٹھا ہے وہیں بیٹھا رہنے دیتے ہیں۔ اس پر انہیں تم جیسے احمق بھی مل جاتے ہیں جو اُن کے گن گاتے اور آؤ بھگت کرتے رہتے ہیں! تمھارا وانگ چو بھی یہیں پر مرے گا۔"

ہمارے یہاں اُن دنوں میری چھوٹی خالہ زاد بہن ٹھہری ہوئی تھی، وہی جو وانگ چو کی مسکان کو ڈیڑھ دانت کی مسکان کہا کرتی تھی۔ چلبلی سی لڑکی، بات بات پر ٹھٹھول کرتی رہتی تھی۔ میں نے دو ایک بار وانگ چو کو انکھیوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پایا تھا، لیکن کوئی خاص دھیان نہیں دیا کیونکہ وہ سب کو انکھیوں ہی سے دیکھتا تھا۔ پر اُس شام نیلم میرے پاس آئی اور بولی، "آپ کے دوست نے مجھے تحفہ دیا ہے۔ بڑا ہی پیارا!"

میرے کان کھڑے ہوئے۔ "کیا دیا ہے؟"

"جھومروں کی جوڑی!"

اور اس نے دونوں مٹھیاں کھول دیں جن میں چاندی کے کشمیری بیل کے دو سفید جھومر چمک رہے تھے، اور پھر دونوں جھومر اپنے کانوں کے پاس لے جا کر بولی، "کیسے لگتے ہیں؟"

میں ہکا بکا سا نیلم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اس کے اپنے کان کیسے بھورے بھورے ہیں!" نیلم نے ہنس کر کہا۔

"کس کے؟"

"میرے اس پریمی کے!"

Scanned with CamScanner

تمہیں اس کے بھورے کان پسند ہیں؟

"جب اسے شرم آتا ہے تو کان لال ہو جاتے ہیں، گہرے لال!" اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"لڑکیاں کیسے اس آدمی سے پریم کر سکتی ہیں جو انہیں پسند نہ ہو! کہیں نیلم کے بارے میں تو نہیں بتا رہی ہے؟"

بات اس طرح سے زیادہ پریشان نہیں ہوا تھا۔ نیلم نویں میں پڑھتی تھی اور ونگ چو سولہ سال کا تھا۔ ... سے ... میں ... کی طرف سے واپس جانے والا تھا۔ اس پریم کی کونپل اپنے آپ ہی جل جائے گی۔

نیلم پہ صرور تو تم سے ... سے ... ہیں، مگر ... کی دوستی ... میں ... سے ... تکلیف دہ ہو گی۔ ... کی کچھ نہیں

وہ چینی، ... ہی جیسے اکیلا ہی ہوا ہیں ... ہی ... کا ایک ... سے مجھے ہیں دیا ہے۔ میرے پاس پہنچنے سے پہلے تھا، میں نے اسے دے دیا۔ جب لوٹے گا تو اسے پریم پتر لکھنے میں آسانی ہو گی!

وہ کیا کہتا تھا؟

کہتا کیا تھا، سارا وقت اس کے ہاتھ کانپتے رہے اور چہرہ ... سی ہو ... کہتا تھا مجھے خط لکھنا، میرے خطوں کا جواب دینا اور ... کے کاغذ پر، صورت کا ... !

میں نے غور سے نیلم کی طرف دیکھا، پر اس کی آنکھوں میں مجھے ہنسی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ ... کی بات جیسا ... جاتی ہیں۔ مجھے لگا نیلم ... سے دھوکا دے رہی ہے۔ اس کے لیے یہ کھیل تھا لیکن ونگ چو ... اس کا دوسرا ہی مطلب لگائے گا۔

اس کے بعد مجھے لگا وہ ونگ چو ہم سے کترا رہا ہے۔ ایک رات ... کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑا ... تارے ... کی قطار کی طرف دیکھ رہا تھا ... میں کچھ دوری پر پیڑوں کے نیچے مجھے ونگ چو نظر آیا ... پیڑوں کے نیچے ٹہل رہا تھا مگر آج وہ اکیلا نہیں تھا۔ ... کے ... خوب خوب چلی جا رہی تھی۔

مجھے نیلم ... یہاں ... کی ... ہوتی ہیں! ... ہوئے ونگ چو کی ... سے ... جا رہی تھی۔

دوسرے روز کھانے کی میز پر نیلم ... کے ساتھ ... کرنے لگی۔ ... میں سے ایک ... سا ... ۔

آپ کے لیے ... آم کے بارے ... ہے۔ آپ جانتے ہیں ... کتنے ہیں؟ ... وہ ... اکھوا ... چوسی، ... !

اس نے نیلم کی طرف کھوئی کھوئی آنکھوں سے دیکھا اور بولا ... ! ہم سب کھلکھلا کر ہنس

Scanned with CamScanner

پڑھے۔

بانگ نہیں، پھانگ!

بانگ! پھر ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑا۔

نیلم نے ڈبہ کھولا۔ اس میں سے آم کے اچار کا ٹکڑا نکال کر اسے دکھاتے ہوئے بولی، "اسے پھانگ۔ پھانگ اسے کہتے ہیں!" اور اسے وانگ چو کی ناک کے پاس لے جا کر بولی، "اسے سونگھنے پر منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ آیا منہ میں پانی۔ اب کہو پھانگ!"

نیلم، کیا فضول باتیں کر رہی ہو! بیٹھو آرام سے! میں نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

نیلم بیٹھ گئی مگر اس کی حرکتیں بند نہیں ہوئیں۔ بڑی اپنائیت سے وانگ چو سے کہنے لگی، "بنارس جا کر ہمیں بھول نہیں جائیے گا۔ ہمیں خط ضرور لکھیے گا۔ اور اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو تکلف نہ کیجیے گا۔"

وانگ چو لفظوں کا مطلب تو سمجھ لیتا تھا لیکن ان کے پیچھے طنز کی لہر کو نہیں پکڑ پاتا تھا۔ وہ سخت مشکل میں محسوس ہوتا تھا۔

"بھیڑ کی کھال کی ضرورت ہو یا کوئی نمدہ، یا اخروٹ..."

"نیلم!"

"نہیں بھیا، بھیڑ کی کھال پر بیٹھ کر گرنتھ پڑھیں گے۔"

وانگ چو کے کان لال ہو گئے۔ شاید پہلی بار اسے احساس ہوا کہ نیلم تمسخر کر رہی ہے۔ اس کے کان سچ مچ بھورے رنگ کے تھے جن کا نیلم مذاق اڑایا کرتی تھی۔

"نیلم جی، آپ لوگوں نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔ میں بہت شکر گزار ہوں۔"

ہم سب چپ ہو گئے۔ نیلم بھی جھینپ سی گئی۔ وانگ چو نے ضرور اس کے مذاق کو سمجھ لیا ہوگا۔ اس کے دل کو ضرور ٹھیس لگی ہوگی۔ پر میرے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ ایک طرح سے اچھا ہی ہے کہ نیلم کے بارے میں اس کے جذبات بدل گئے ہیں، ورنہ اسی کو سب سے زیادہ پریشانی ہوگی۔

شاید وانگ چو بھی صورت حال کو جانتے سمجھتے ہوئے بھی ایک فطری کشش کے زیر اثر آ گیا تھا۔ جذباتی انسان کا اپنے پر کوئی قابو نہیں ہوتا۔ وہ ٹھوکریں کھا کر ہی بات کو سمجھ پاتا ہے۔

ہفتے کے آخری دنوں میں وہ روز کوئی نہ کوئی تحفہ لے کر آنے لگا۔ ایک بار میرے لیے بھی ایک چوغہ لے آیا اور بچوں کی طرح ضد کرنے لگا کہ میں اور وہ اپنا اپنا چوغہ پہن کر ایک ساتھ گھومنے جائیں۔ سنگھ بالے ہیں وہ سب بھی جانتا تھا۔ دو ایک بار نیلم کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا اور لوٹنے پر ساری شام نیلم بدھسٹو کا مذاق اڑاتی رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں نیلم کے اس برتاؤ کا خیر مقدم کرتا رہا، کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وانگ چو کا کوئی جذبہ ہمارے گھر میں جڑ جما پائے۔ ہفتہ گزر گیا اور وانگ چو سارناتھ واپس لوٹ گیا۔

Scanned with CamScanner

وکٹ جو سے پہچانے نے بعد اس نے بہت میرا خط وغیرہ کی، جیسا عام طور پر ہمارے بچوں کے دن نکلنے سے ہوتا ہے۔ کسی کا خط آجاتا، کسی کسی آنے جانے والے سے ان کی خبر مل جاتی۔ وہ ان دنوں میں سے تھے جو برسوں تک رسمی تعارف کی دہلیز پر ہی ڈگمگاتے رہتے ہیں، تب دہلیز لانگھ کر اندر آتے ہیں اور بے تکلف ہوتے ہیں۔ مجھے اس کا علم نہ تھا کہ ان کے بعد کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کچھ عرصے تک مجھے [illegible] وکٹ جو کے بیچ کی بات آگے بڑھی یا نہیں، لیکن [illegible] وکٹ جو کی زندگی برخاست نہیں ہو پایا۔

سال بیتے گئے۔ ہمارے ملک میں ان دنوں بہت واقعات پیش آ رہے تھے۔ آئے دن ہنگامہ ہوتا، ملک میں قحط پڑا، ہندوستان چھوڑو کی تحریک چلی، سڑکوں پر گولیاں چلیں، بعد میں ہندوستان کی آزادی ہوئی، ملک میں خون ریزی ہوئی، یہ ملک کا بٹوارا ہوا، اور اس تمام وقت وکٹ جو سارا ماحول میں رہ رہے تھے۔ کسی کا خط آ گیا تو معلوم ہوتا تھا۔ کسی لکھتے کہ تنہائی کے فلسفے کا مطالعہ کر رہا ہے، کسی پتا چلتا کہ کوئی کتاب لکھنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔

اس کے بعد میری ملاقات وکٹ جو سے دلی میں ہوئی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب جیسی وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے دور میں [illegible] آئے ہوئے تھے۔ وکٹ جو اچانک سڑک پر مجھے مل گیا اور میں نے اسے کہا [illegible]۔ مجھے پتا لگا کہ چینی وزیر اعظم کی آمد پر وہ سارا ماحول لے کر دلی چلا آیا ہے۔ پر جب اس سے مجھے [illegible] وہ اپنے وظیفے کے سلسلے میں آیا ہے اور یہاں [illegible] اسے چو این لائی کے دورے کی خبر ملی تھی۔ مجھے اس کے رویے پر تعجب ہوا۔ اس کا سماں ویسے کا ویسا تھا۔ پہلے کی طرح ہولے ہولے بولتا، دھیمی سی مسکان مسکراتا رہا۔ وہی کم گوئی، وہی بیزاری اور خاموشی۔ اس دوران اس نے کوئی کتاب یا مضمون وغیرہ بھی نہیں لکھے تھے۔ میرے پوچھنے پر اس نے اس کام میں کوئی خاص دلچسپی بھی ظاہر نہیں کی۔ تنہائی کے فلسفے کی باتیں کرتے ہوئے بھی وہ بہت پرجوش نہیں تھا۔ وہ ایک کتابوں کے بارے میں بتاتا رہا، ان میں سے وہ کچھ نوٹس لیتا رہا تھا۔ اپنے کسی مضمون کا بھی ذکر نہیں کیا جس پر وہ ان دنوں کام کر رہا ہو۔ [illegible] اس کے ساتھ اس کی خط و کتابت چلتی رہی تھی، اس نے بتایا۔ جاہل کر بیٹھے اب کی بیوی کا [illegible] ان دنوں ان کی بیتی تھی۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ہمارے بنیادی تصورات بدلتے چلے جاتے ہیں اور ان کی شدت میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ چینی تہذیب و ثقافت کا بھی اس نے تذکرہ کیا، اس کی شدت اور حیثیت میں بھی ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ پہلے جیسا جذباتی ولولہ نہیں تھا۔ بدھ مت کے پیروؤں کے بارے میں بھی [illegible]۔ لیکن اس کی زندگی سے مطمئن تھا۔ پہلے کی طرح تھوڑا کھاتا، تھوڑا پڑھتا، تھوڑا ٹہلتا اور تھوڑا سوتا تھا۔ اور دور کا لیں سے ہٹ کے، بغیر کسی جذباتی لے میں آئے اپنی زندگی کی راہ پر کچھوے کی چال مزے سے چلتا آ رہا تھا۔

[illegible] کے بعد ہمارے درمیان خط پھر رک گئی۔ سماجی قوتوں کو سمجھے بغیر تم بودھ دھرم کو نہیں سمجھ پاؤ گے؟ ہر چیز کا میدان ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے، زندگی سے جڑا ہوا ہے۔ کوئی چیز

Scanned with CamScanner

زندگی سے الگ نہیں ہے۔ تم جیون سے الگ ہو کر دھرم کو بھی کیسے سمجھ سکتے ہو؟

کبھی وہ مسکراتا، کبھی سر ہلاتا، اور سارا وقت طلسمیوں کی طرح میرے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میرے کہے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا، کہ میں چکنے گھڑے پر پانی ڈالے جا رہا ہوں۔

سارے ملک سے نہ سہی، اپنے ملک سے تو دلچسپی ہے۔ اب تو جاگو، کچھ کر دکھانے کا دور آیا ہوا ہے۔

اس پر بھی وہ سر ہلاتا اور مسکراتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ ایک بھائی کو چھوڑ کر چین میں اس کا کوئی نہیں ہے۔ ۱۹۲۹ میں وہاں کوئی سیاسی اتھل پتھل ہوئی تھی، اس میں اس کا گاؤں اجڑ گیا تھا اور سب سگے رشتے دار مر گئے تھے یا جانے کہاں گئے تھے۔ لے دے کر ایک بھائی بچا تھا اور وہ پیکنگ کے قریب کسی گاؤں میں رہتا تھا۔ برسوں سے وانگ چو کا رابطہ اس کے ساتھ ٹوٹ چکا تھا۔ وانگ چو پہلے اپنے گاؤں کے سکول میں پڑھتا رہا تھا، بعد میں پیکنگ کے ایک کالج میں پڑھنے لگا۔ وہیں سے وہ پروفیسر شان کے ساتھ بھارت چلا آیا تھا۔

سنو وانگ چو، بھارت اور چین کے بیچ بند دروازے اب کھل رہے ہیں۔ اب دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات قائم ہو رہے ہیں اور اس کی بڑی اہمیت ہے۔ یہی مطالعہ جو تم تک تنہا کرتے رہے ہو، اب اپنے ملک کے باعث سمبندھ کے طور پر کر سکتے ہو۔ تمہاری حکومت تمہارے وظیفے کا بندوبست کرے گی۔ اب تمہیں الگ تھلگ پڑے نہیں رہنا پڑے گا۔ تم پندرہ سال سے زیادہ عرصے سے بھارت میں رہ رہے ہو، انگریزی اور ہندی زبانیں جانتے ہو، بودھ گرنتھوں پر کام کرتے رہے ہو، تم دونوں ملکوں کے تہذیبی تعلقات میں بہت قیمتی کڑی بن سکتے ہو۔۔۔

اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک آئی۔ سچ مچ اسے کچھ سہولتیں مل سکتی تھیں۔ کیوں نہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے! دونوں ملکوں کے درمیان پائی جانے والی یگانگت سے وہ بھی متاثر ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ کچھ ہی دنوں پہلے جب وہ وظیفے کی رقم وصول کرنے بنارس گیا تو راہ چلتے لوگ سڑکوں پر اس سے گلے مل رہے تھے۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ کچھ عرصے کے لیے ضرور اپنے ملک لوٹ جائے اور وہاں ہونے والی عظیم تبدیلیوں کو دیکھے اور سمجھے کہ سارناتھ میں الگ تھلگ بیٹھے رہنے سے اسے کچھ حاصل نہیں ہوگا، وغیرہ وغیرہ۔

وہ سنتا رہا، سر ہلاتا اور مسکراتا رہا، لیکن مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ میری باتوں کا اس پر کچھ اثر ہوا ہے یا نہیں۔

لگ بھگ چھ مہینے بعد اس کا خط آیا کہ وہ چین جا رہا ہے۔ مجھے بڑا اطمینان ہوا۔ اپنے ملک میں جائے گا تو دھوبی کے کتے والی اس کی حالت بدلے گی، کہیں کا تو ہو کر رہے گا۔ اس کی زندگی میں نیا دور پیدا ہوگا۔ اس نے لکھا کہ وہ اپنا ایک ٹرنک سارناتھ میں چھوڑے جا رہا ہے جس میں اس کی کچھ کتابیں اور تحقیقی کاغذ وغیرہ رکھے ہیں، کہ برسوں تک بھارت میں رہ چکنے کے بعد وہ اپنے کو بھارت ہی کا باشندہ سمجھتا ہے، اور یہ کہ وہ جلد ہی لوٹ آئے گا اور اپنا مطالعہ پھر سے شروع کرے گا۔ میں دل ہی دل میں ہنس دیا،

Scanned with CamScanner

ایک بار اپنے ملک میں گیا تو لوٹ کر نہیں آنے کا۔

چین میں وہ [illegible] [illegible] وہاں سے [illegible] نے مجھے پیکنگ کے قدیم راج محل کا تصویری کارڈ بھیجا۔ وہ ایک خط کی شکل میں [illegible] سے سیاست کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں تھی۔

[illegible] چین [illegible] نے واقعے [illegible] رہے تھے، [illegible] تھی۔ [illegible] کی جیب میں تقریباً [illegible] ہوئے تھے۔ [illegible] کام [illegible] تو ٹولیاں [illegible] کاٹتے ہوئے، ان [illegible] ہاتھ میں [illegible] [illegible] نہیں [illegible] کی شکی طبیعت کی وجہ سے وہ ٹولیوں سے [illegible] کاٹنے ہوئے [illegible] نہیں [illegible] تھا، لیکن انہیں جاتے دیکھ کر حیران سا کھڑا رہتا جیسے کسی دوسری دنیا میں پہنچ گیا ہو۔

[illegible] تو نہیں [illegible] لیکن [illegible] دور کی ایک خالہ اور وہ ایک واقف کار ضرور مل [illegible] وہ [illegible] گاؤں [illegible] کچھ [illegible] اسٹیشن سے گھر کی طرف جاتے ہوئے اس کا ایک [illegible] سارے کاغذ، ساری دستاویزیں جلا ڈالی گئی تھیں [illegible] کھو [illegible] تھی

[illegible] چین میں [illegible] کا [illegible] دیکھ [illegible] کی [illegible] گھڑیاں [illegible] اب بھی یاد تھیں۔ اس سے وہ ایک [illegible] کی [illegible] [illegible] کی [illegible] پوچھتے دیکھ [illegible] وہ [illegible] گاؤں کا [illegible] [illegible] تھا۔ [illegible] بھی [illegible] کچھ [illegible] کی حالت یہاں بھی ویسی ہی تھی جیسی بھارت میں رہی تھی۔ [illegible] میں [illegible] نہیں [illegible] کی [illegible] انگلیوں [illegible] سے پھسل پھسل جاتی تھیں۔ وہ یہاں بھی [illegible] کھوتا [illegible] شروع شروع کے دنوں [illegible] کی [illegible] بھی ہوئی۔ [illegible] سے [illegible] کی [illegible] اسکول میں [illegible] بھارت چین تعلقات کی [illegible] کے طور پر [illegible] بھی دیا گیا۔ [illegible] چھوڑ کر [illegible] لوگوں کو بھارت کے بارے میں بتاتا رہا۔ [illegible] نے طرح طرح کے سوال پوچھے [illegible] کے بارے میں، تیرتھوں میلوں کے بارے میں۔ [illegible] صرف [illegible] [illegible] کا [illegible] جانتا تھا [illegible] کے بارے میں وہ اپنے [illegible] سے کچھ جانتا تھا، لیکن بہت کچھ ایسا تھا جس کے بارے میں بھارت میں رہتے ہوئے بھی وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔

[illegible] چین میں [illegible] کی [illegible] پڑنے لگی۔ [illegible] نے گاؤں میں بھی لوگ لوہا [illegible] کر [illegible] تھے [illegible] [illegible] سے بھی [illegible] کے [illegible] ایک ٹولی کے ساتھ بھیج دیا گیا۔ دن بھر وہ [illegible] کے ساتھ [illegible] ایک [illegible] چاروں طرف [illegible] سے رہا تھا [illegible] ایک ایک لوہے کا ٹکڑا بڑے فخر سے [illegible] تھے [illegible] ڈھیر پر ڈال رہے تھے۔ رات کے وقت آگ سے لپلپاتے شعلوں میں اس ڈھیر کو پگھلایا جانے لگا۔ آگ کے گرد بیٹھے لوگ [illegible] گیت گا رہے تھے۔ سب لوگ ایک آواز ہو کر اس گیت میں حصہ لے رہے تھے۔ [illegible] چپ [illegible] بیٹھا تھا۔

چین میں رہتے رہتے دھیرے دھیرے ماحول میں تناؤ سا آنے لگا اور ایک حبس گھٹن سا گھیرنے لگا۔
ایک روز ایک آدمی نیلے رنگ کا کوٹ اور نیلے ہی رنگ کی پتلون پہنے اُن کے پاس آیا اور اُسے اپنے ساتھ گاؤں کے انتظامی مرکز میں لے گیا۔ راستے بھر وہ آدمی چپ چاپ رہا۔ مرکز میں پہنچنے پر اس نے پایا کہ ایک بڑے سے کمرے میں پانچ افراد کا ایک گروپ میز کے پیچھے بیٹھا اس کی راہ دیکھ رہا ہے۔

جب وانگ چو ان کے سامنے بیٹھ گیا تو وہ باری باری سے اُس کے بھارت کے قیام کے بارے میں سوال پوچھنے لگے۔ تم بھارت میں کتنے برسوں تک رہے؟ ، وہاں کیا کرتے رہے؟ ، کہاں کہاں گھومے؟ وغیرہ وغیرہ۔ پھر بودھ دھرم سے وانگ چو کی دلچسپی کے بارے میں جب ان میں سے ایک شخص بولا: تمہارے خیال میں بودھ دھرم کی مادی بنیاد کیا ہے؟

سوال وانگ چو کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اُس نے آنکھیں جھپکائیں۔

جدلیاتی مادیت کے نقطہ نظر سے تم بودھ دھرم کو کیسے سمجھتے ہو؟

سوال پھر بھی وانگ چو کی سمجھ میں نہیں آیا، لیکن اس نے بڑبڑاتے ہوئے جواب دیا، انسان کی روحانی ترقی میں، اس کے سکھ اور شانتی کے لیے، بودھ دھرم کے آٹھ رستے بہت اہم ہیں۔ مہاراج کا کہنا تھا۔۔۔

اور وانگ چو بودھ دھرم کے آٹھ احکام کی تفصیل بتانے لگا۔ ابھی وہ اپنی بات ختم نہیں کر پایا تھا کہ صدارتی کرسی پر بیٹھے، چھوٹی چھوٹی ترچھی آنکھوں والے شخص نے بات کاٹ کر کہا، "بھارت کی خارجہ پالیسی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

وانگ چو مسکرا دیا، پھر ذرا ٹھہر کر دانت کی مسکان۔ پھر بولا، آپ صاحبان اس بارے میں بہتر جانتے ہیں۔ میں تو ایک سیدھا سادہ بودھ کا متلاشی ہوں۔ مگر بھارت بہت قدیم ملک ہے۔ اس کی تہذیب امن اور انسان دوستی کی تہذیب ہے۔۔۔

نہرو کے بارے میں تم کیا سوچتے ہو؟

نہرو کو میں نے تین بار دیکھا ہے۔ ایک بار تو ان سے باتیں بھی کی ہیں۔ ان پر کچھ مغربی خیالات کا اثر زیادہ ہے، مگر پرانی تہذیب کے وہ بھی بڑے پرستار ہیں۔

اس کے جواب سنتے ہوئے کچھ دیر تو سب خاموش رہے، کچھ کا چہرہ تمتمانے لگا۔ پھر طرح طرح کے ٹیڑھے سوال پوچھے جانے لگے۔ انہیں احساس ہو گیا کہ جہاں تک حقائق کا، بھارت کی موجودہ زندگی کا تعلق ہے، وانگ چو کی معلومات ادھوری بلکہ صفر ہیں۔

سیاسی لحاظ سے تو تم صفر ہو! بودھ دھرم کی تعلیمات کو بھی سماجی علوم کے اعتبار سے پرکھ بھی سکتے، جانے وہاں بیٹھے کیا کرتے رہے ہو! ہم تمہاری مدد کریں گے۔

پوچھ گچھ کئی گھنٹوں چلتی رہی۔ پارٹی کے کارکنوں نے اسے جلدی پڑھنے کا کام دے دیا، ساتھ ہی پیکنگ کے میوزیم میں دو دن کام کرنے کی بھی اجازت دے دی۔

Scanned with CamScanner

[illegible] سے [illegible] کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ اپنے ملک میں [illegible] کا [illegible]
[illegible] تھا [illegible] سے [illegible] تو اسے اچانک [illegible] حرارت کی
[illegible] کی یاد آئی جس میں [illegible] پوتھیاں پڑھا کرتا تھا۔ [illegible] کا
[illegible] سے [illegible] کی قطار لگی ہوتی تھی۔ [illegible] لی بیٹھیں کا
[illegible]! [illegible] کرتا تھا۔

[illegible] بیٹھی کا [illegible] اپنے آپ اس کی کوٹھری میں چلا
[illegible] آنے تھے تو [illegible]
[illegible] میں بھی کہاں [illegible] ہے۔ [illegible] کی
[illegible] چانک [illegible] بدل گیا اور کشمیر کی
[illegible] سے ڈھکے پہاڑ۔ [illegible] سامنے آگئی [illegible]
[illegible] معصومیت والے [illegible] کا [illegible] نہیں ہوا تھا۔

[illegible] سے زیادہ پریشان [illegible]۔ وہ [illegible] سے باہر [illegible] ہوئی
[illegible] ہوتے تھے۔ جہاں [illegible]۔
[illegible] کی طرف سے تھا۔ یہاں [illegible]
[illegible] طاقت تھی [illegible]۔ [illegible] سے ایک ہی ڈھرے پر چلتے رہنے کی وجہ سے وہ
[illegible] کے [illegible] سے [illegible]۔ [illegible] سے
[illegible]۔ اچانک [illegible] محسوس کرنے لگا [illegible]
[illegible] سے اس خواب میں [illegible] لوٹ جاتا ہو گا جب وہ [illegible]
[illegible] لیا جاتا۔

[illegible] حرارت [illegible]۔ [illegible] نہیں تھا۔ ہماری سفارت خانے سے تو
[illegible]۔ [illegible] کی شہرت
[illegible] سے تعلقات [illegible] کے [illegible] آخر
[illegible] فیصلہ کر لیا کہ [illegible] کے [illegible]
[illegible] کی بیتی تھی۔

[illegible] ہماری [illegible] میں [illegible] ہوئی تھی اور [illegible]
[illegible] کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ وہ [illegible] سے باہر
[illegible] کے دفتر میں [illegible] وہاں ایک بلکار گھنٹے مرتک [illegible] کے
پاسپورٹ اور کاغذوں کی چھان بین کرتا رہا۔

دو سال پہلے آپ چین گئے تھے۔ وہاں جانے کا کیا مقصد تھا؟

میں بہت برسوں تک یہاں رہتا رہا تھا، کچھ وقت کے لیے اپنے ملک جانا چاہتا تھا۔

پولیس افسر نے اُسے سر سے پیر تک دیکھا۔ وانگ چُو پُرسکون تھا اور مُسکرا رہا تھا وہی ٹیڑھی سی مسکان۔

"آپ وہاں کیا کرتے رہے؟"

وہاں میں ایک کمیون میں کھیتی باڑی کی ٹولی میں کام کرتا تھا۔

مگر آپ تو کہتے تھے کہ آپ بودھ گرنتھ پڑھتے ہیں؟

ہاں۔ پیکنگ میں ایک ادارے میں ہندی پڑھانے لگا تھا اور مجھے پیکنگ میوزیم میں کام کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔

اگر اجازت مل گئی تھی تو آپ اپنے ملک سے بھاگ کیوں آئے؟ پولیس افسر نے غصے سے کہا۔

وانگ چُو کیا جواب دے؟ کیا کہے؟

میں کچھ وقت کے لیے ہی وہاں گیا تھا، اب لوٹ آیا ہوں۔۔۔

پولیس افسر نے ایک بار پھر اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں شک اتر آیا تھا۔ وانگ چُو کچھ عجیب سا محسوس کرنے لگا۔ بھارت میں پولیس افسروں کے سامنے کھڑے ہونے کا اس کا پہلا تجربہ تھا۔ اس سے ضمانت کے لیے پوچھا گیا تو اُس نے پروفیسر تان شان کا نام لیا، پر وہ دو سال پہلے گزر چکے تھے۔ اس نے سارناتھ کے ادارے کے منتری کا نام لیا، شانتی نکیتن کے دو ایک پرانے ساتھیوں کے نام لیے جو اُسے یاد تھے۔ سپرنٹنڈنٹ نے سب نام اور پتے نوٹ کر لیے۔ اُس کے کپڑوں کی تین بار تلاشی لی گئی۔ اُس کی ڈائری کو دیکھا گیا جس میں اُس نے کئی اقتباس اور نوٹس لکھ رکھے تھے۔ اور سپرنٹنڈنٹ نے اس کے نام کے آگے ہدایت لکھ دی کہ اس آدمی پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

ریل کے ڈبے میں بیٹھے تو مسافر فارنگ کا تذکرہ کر رہے تھے۔ اسے بیٹھتے دیکھ کر سب چپ ہو گئے اور اس کی طرف گھورنے لگے۔

کچھ دیر بعد جب مسافروں نے دیکھا کہ وہ تھوڑی بہت بنگالی اور ہندی بول لیتا ہے تو ایک بنگالی بابو اٹھ کر کھڑے ہوئے اور ہاتھ جھٹک جھٹک کر کہنے لگے، 'یہ تو کہو کہ تمہارے ملک نے دغا بازی کی ہے۔ تم تو ہمارے ملک سے نکل جاؤ۔۔۔ نکل جاؤ!'

ٹیڑھی سی مسکان جانے کہاں اوجھل ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ چہرے پر بے چینی اتر آئی تھی۔ بے چین اور خاموش وانگ چُو چپ چاپ بیٹھا رہا۔ کہے بھی تو کیا کہے! فارنگ کے بارے میں جان کر اُسے بھی گہرا صدمہ ہوا تھا۔ اس جھگڑے کی وجہ کے بارے میں اُسے کچھ بھی علم نہیں تھا۔ اور وہ جاننا چاہتا بھی نہیں تھا۔

سارناتھ پہنچ کر وہ سچ مچ جذبات سے مغلوب ہو گیا۔ اپنا تھیلا کندھے پر رکھے جب وہ آشرم کے

Scanned with CamScanner

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہمارے پاس چھوڑ جائیے۔

[illegible] لوکا پھر ہموار رفتار سے چلنے لگی ہے۔

[illegible] مقام پر لوٹ آئی۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"تم چین سے کب لوٹے؟"

وانگ چو نے بتا دیا۔

"کلکتے میں تم نے اپنے بیان میں کہا کہ تم شانتی نکیتن جا رہے ہو، پھر یہاں کیوں چلے آئے؟ پولیس کو پتا لگا ہے کہ تمہیں بڑی پریشانی اٹھانی پڑی ہے۔"

"میں نے دونوں جگہوں کے بارے میں کہا تھا۔ شانتی نکیتن تو میں صرف دو ایک دن کے لیے جانا چاہتا تھا۔"

"تم چین سے کیوں لوٹ آئے؟"

"میں بھارت میں رہنا چاہتا ہوں۔۔۔" اس نے پہلے کا جواب دہرا دیا۔

"لوٹ آنا تھا تو گئے کیوں تھے؟"

یہ سوال وہ بہت بار پہلے بھی سن چکا تھا۔ جواب میں بودھ گرنتھ کا حوالہ دینے کے سوا اسے کوئی اور جواب نہیں سوجھ پاتا تھا۔

سب کچھ ٹھیک ہی ہوا۔ وانگ چو کو ہدایت کی گئی کہ وہ ہر مہینے کے پہلے سوموار کو بنارس کے تھانے پولیس اسٹیشن میں آ کر اپنی حاضری دکھاتی ہوں۔

وانگ چو باہر آیا تو خود کو مضطرب سا محسوس کرنے لگا۔ ویسے یہ ایک بار کوئی بڑی بات نہیں تھی، لیکن اس سے اس کی پرسکون زندگی میں خلل پڑتا تھا۔

وانگ چو دنوں میں اتنا مضطرب محسوس کر رہا تھا کہ بنارس سے لوٹنے کے بعد کوٹھری میں جانے کے بجائے سب سے پہلے اس خاموش مقدس مقام پر جا بیٹھا جہاں صدیوں پہلے مہاتما بدھ نے اپنا پہلا وعظ کیا تھا، اور دیر تک وہاں بیٹھا مراقبہ کرتا رہا۔ بہت دیر بعد اس کا دل پھر سے ٹھکانے پر آیا اور دل میں پھر جذبے کی ترنگیں اٹھنے لگیں۔

یہ وانگ چو کو چین نصیب نہیں ہوا۔ کچھ ہی دن بعد اچانک چین اور بھارت میں جنگ چھڑ گئی۔ ملک بھر میں جیسے طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس روز شام کو پولیس کے کچھ لوگ ایک جیپ میں آئے اور وانگ چو کو حراست میں لے کر بنارس چلے گئے۔ سرکار یہ نہ کرتی تو اور کیا کرتی؟ حکومت اسے دوستوں کو اس وقت کہاں جنگی حالت میں مہلت دی اور نیک نیتی کے ساتھ دشمن کے ایک ایک شہری کی جانچ کرتے پھریں۔

دو دن تک دونوں چینیوں کو پولیس اسٹیشن کی ایک کوٹھری میں رکھا گیا۔ دونوں میں کوئی بات بھی مشترک نہیں تھی۔ جوتے بنانے والا چینی سارا وقت سگریٹ پھونکتا رہتا اور گھٹنوں پر کہنیاں رکھے بڑبڑاتا رہتا، جبکہ وانگ چو کوٹھری کی دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھا خلا میں دیکھتا رہتا۔

جس وقت وانگ چو اپنی صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، اسی وقت دو تین کو اسے چھوڑ کر

سپرنٹنڈنٹ [illegible] تھی۔ [illegible] کی خبر موجودگی [illegible] سے [illegible]
[illegible] سے [illegible] تھے۔ سپرنٹنڈنٹ [illegible] سامنے کاغذوں کا پلندہ رکھا تھا [illegible]
[illegible] تھے، [illegible] رہا [illegible] صاحب کچھ دیر
[illegible] کاغذوں [illegible] سے [illegible] کے سامنے [illegible] کی [illegible] ڈھونڈتے [illegible]
[illegible] کاغذوں کے پلندے [illegible] سے [illegible] کے پاس بھیج دیا جاتا
[illegible] نہیں جا سکتا تھا۔

[illegible] ایک مہینے بعد ملی۔ [illegible]
[illegible] تو نکلتے ہیں [illegible] کاغذ
[illegible] اور ایک طرف سے اس سے لیے
سب کچھ تھے۔ [illegible] دلی بھیج دیا گیا ہے، [illegible] پاؤں تک کانپ گئی۔

وہ [illegible] کاغذ آپ کے [illegible] بہت کچھ [illegible] وہ بہت ضروری ہیں۔

[illegible] کاغذوں کا [illegible] آپ لے گئے ہیں، آپ [illegible] جاتے
[illegible] ایک چھوٹی کوٹھری میں [illegible] کاغذوں کے [illegible] وہ
[illegible] کاغذوں [illegible] ہیں۔ [illegible] کی [illegible] نگرانی
[illegible] آ کر [illegible] بیٹھا [illegible] ڈنڈا تھا
[illegible] کسی ایک [illegible] کسی [illegible] کنویں کی منڈیر پر جا
[illegible] بیٹھ [illegible] اس کے علاوہ [illegible] بھیجے ہیں
[illegible] نہیں جا سکتا تھا۔

[illegible] چھوٹی سی چٹھی ملی [illegible] تفصیل [illegible] کے بعد اس نے لکھا کہ [illegible] کا مستری
[illegible] سے مستری [illegible] اور ایک چھوٹا [illegible] جائے گا۔
[illegible] بھیجے [illegible] کاغذوں [illegible] جیسے [illegible] پڑھے انھیں پولیس کے ہاتھوں
[illegible] پاس بھیجوں [illegible] کے پولیس اسٹیشن میں رکھے پیش ہونے
[illegible] ایک بار [illegible] پڑھے تو اسے [illegible] ہوگی۔ [illegible] طرح جیسے میں [illegible]
[illegible] کام [illegible] نہیں لگتا، سر پر تلوار لٹکتی رہتی ہے۔

[illegible] نہیں ہوا کہ مجھے آپ ہی سے یہ کام نہیں ہو پائے گا۔ ہمارے
[illegible] نہیں ہو سکتا۔ [illegible] لوگوں میں رشتے سے بڑا آدمی
[illegible] کچھ [illegible] کے پاس گیا، ایک سے دوسرے کی طرف بھیجا،
[illegible] تھک ہار کر لوٹ آیا۔ یقین دہانیاں تو بہت ملیں مگر سب یہی
کہتے: وہ [illegible] گیا ہے، وہاں سے واپس کیوں آیا؟ یا پھر پوچھتے: پچھلے بیس سال سے مطالعہ ہی کر رہا

Scanned with CamScanner

ہے؟"

لیکن جب میں اس کے مسودوں کا ذکر کرتا تو سب یہی کہتے: ہاں، یہ تو شکل نہیں ہو پا رہی ہے۔ وہ سامنے رکھے کاغذ پر کچھ نوٹ کر لیتے۔ پر سرکاری کام کے راستے طول طویل ہوتے ہیں اور ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی آدمی تمہیں تمہاری حیثیت کی پہچان کراتا رہتا ہے۔ میں نے جواب میں اسے اپنی کوششوں کی تفصیل لکھی، یہ بھی تسلی دی کہ میں پھر لوگوں سے ملوں گا لیکن ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا کہ جب حالات بہتر ہو جائیں تو وہ اپنے ملک لوٹ جائے کیوں کہ اس کے لیے یہی بہتر ہے۔

خط سے اس کے دل پر کیا اثر ہوا، میں نہیں جانتا۔ اس نے کیا سوچا ہوگا؟ مگر ان دنوں ہم سے دونوں میں جب مجھے خود چین کے رویے پر غصہ آ رہا تھا، میں وانگ چُو کی صورتِ حال کو زیادہ ہمدردی کے ساتھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اس کا پھر ایک خط آیا۔ اس میں چین لوٹ جانے کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس میں صرف وظیفے کا ذکر کیا گیا تھا۔ وظیفے کی رقم اب بھی چالیس روپے ہی تھی لیکن اسے اطلاع دے دی گئی تھی کہ سال ختم ہونے پر پھر غور کیا جائے گا کہ وہ ملتا رہے گا یا بند کر دیا جائے گا۔

لگ بھگ سال بھر بعد وانگ چُو کو ایک پرزہ ملا کہ تمہارے کاغذ واپس کیے جا چکے ہیں اور تم پولیس اسٹیشن آ کر انہیں لے جا سکتے ہو۔ ان دنوں وہ بیمار پڑا تھا، لیکن بیماری کی حالت میں بھی وہ گرتا پڑتا سارناتھ پہنچا۔ مگر اس کے ہاتھ صرف ایک تہائی کاغذ لگے۔ پوٹلی اب بھی کھلی ہوئی تھی۔ وانگ چُو کو پہلے تو یقین نہیں آیا، پھر اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ اس پر تھانیدار رکھائی کے ساتھ بولا، "ہم کچھ نہیں جانتے۔ انہیں اٹھاؤ اور یہاں سے لے جاؤ، ورنہ لکھ دو کہ ہم انہیں لینے سے انکار کرتے ہیں۔"

وانگ چُو چند بنڈل بغل میں دبائے کانپتی ٹانگوں سے لوٹ آیا۔ کاغذوں میں صرف ایک پورا مضمون اور کچھ نوٹس بچے تھے۔

اس دن سے وانگ چُو کی آنکھوں کے سامنے دھول اڑنے لگی۔

وانگ چُو کی موت کی خبر مجھے مہینے بھر بعد ملی، وہ بھی بودھ وِہار کے منتری کی طرف سے۔ مرنے سے پہلے وانگ چُو نے درخواست کی تھی کہ اس کا چھوٹا سا ٹرنک اور گنی چنی کتابیں مجھے پہنچا دی جائیں۔ عمر کے اس حصے میں پہنچ کر انسان بری خبریں سننے کا عادی ہو جاتا ہے اور وہ دل پر گہرا اثر نہیں کرتیں۔

میں فوراً سارناتھ نہیں جا پایا۔ جانے کی کوئی تُک بھی نہیں تھی کیوں کہ وہاں وانگ چُو کا کون بیٹھا تھا جس کے سامنے افسوس کرتا۔ وہاں تو صرف ٹرنک ہی رکھا تھا۔ پر کچھ دن بعد موقع ملنے پر میں گیا۔ منتری جی نے وانگ چُو کی بابت کچھ اچھے الفاظ کہے، بڑا نیک دل آدمی تھا، سچے معنوں میں بودھ بھکشو

Scanned with CamScanner

[illegible] چٹھیاں تھیں، کچھ میری، کچھ بیگم کی، کچھ اور لوگوں کی۔

[illegible]

[illegible] پر دو آنسو بہائے تھے۔

[illegible] ہے؟ وہ کہتے، میں تو ڈیوٹی کر رہا ہوں...

[illegible]

**

# بھیشم ساہنی

ترجمہ: خورشید قائم خانی - تاج قائم خانی

## امرتسر آ گیا ہے

گاڑی کے ڈبے میں زیادہ مسافر نہیں تھے۔ میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے سردار جی مجھے بڑی دیر سے محاذ جنگ کے قصے سنا رہے تھے۔ جنگ کے زمانے میں وہ برما کی لڑائی میں حصہ لے چکے تھے اور بات بات پر کھی کھی کر کے ہنستے اور گورے فوجیوں کا مذاق اڑاتے جا رہے تھے۔ ڈبے میں تین پٹھان بیوپاری بھی تھے۔ اُن میں سے ایک ہرے رنگ کی پوشاک پہنے اوپر والی برتھ پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ آدمی بڑا ہنس مکھ تھا اور بڑی دیر سے میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ایک دُبلے سے بابو کے ساتھ اُس کا مذاق چل رہا تھا۔ وہ دبلا بابو پشاور کا رہنے والا جان پڑتا تھا کیوں کہ کسی کسی وقت وہ آپس میں پشتو میں باتیں کرنے لگتے تھے۔ میرے سامنے بائیں طرف کونے میں ایک بڑھیا منہ سر ڈھانپے بیٹھی تھی اور دیر سے مالا جپ رہی تھی۔ یہی کچھ لوگ رہے ہوں گے۔ ممکن ہے دو ایک مسافر اور بھی رہے ہوں لیکن وہ مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں۔

گاڑی دھیمی رفتار سے چلی جا رہی تھی، گاڑی میں بیٹھے مسافر باتیں کر رہے تھے، باہر گیہوں کے کھیتوں میں ہلکی ہلکی لہریں اٹھ رہی تھیں، اور میں من ہی من میں بڑا خوش تھا کیوں کہ میں دلی میں ہونے والا آزادی کا جشن دیکھنے جا رہا تھا۔

ان دنوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو لگتا ہے ہم کسی جھٹ پٹے میں جی رہے تھے۔ شاید وقت بیت جانے پر ماضی کا سارا بیوپار ہی جھٹ پٹے میں گزرا ہوا جان پڑتا ہے۔ جوں جوں مستقبل کے پٹ کھلتے جاتے ہیں، یہ جھٹ پٹا اور بھی گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔

انہیں دنوں پاکستان کے بنائے جانے کا اعلان کیا گیا تھا اور لوگ طرح طرح کے اندازے لگانے

لگے تھے کہ مستقبل میں، ہندی کا نفاذ لیب ہوگا۔ مگر کسی کا بھی تصور بہت دور تک نہیں جا پاتا تھا۔ میرے سامنے بیٹھے ہوئے سردار جی بار بار مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ پاکستان بن جانے کے بعد جناح صاحب بمبئی ہی میں رہیں گے یا پاکستان جا کر بس جائیں گے۔ اور میرا ہر بار یہی جواب ہوتا: بمبئی کیوں چھوڑیں گے، پاکستان آتے جاتے رہیں گے۔ بمبئی چھوڑنے کی کیا تک ہے؟ لاہور اور گورداسپور کے بارے میں بھی اندازے لگائے جا رہے تھے کہ کون سا شہر کس طرف جائے گا۔ مل بیٹھنے کے ڈھنگ میں، گپ شپ میں، ہنسی مذاق میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ کچھ لوگ اپنے گھر چھوڑ کر جا رہے تھے جب کہ دوسرے لوگ ان کا مذاق اڑا رہے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کون سا قدم ٹھیک ہوگا اور کون سا غلط۔ ایک طرف پاکستان بن جانے کا جوش تھا تو دوسری طرف ہندوستان کے آزاد ہونے کا جوش۔ جگہ جگہ فساد بھی ہو رہے تھے اور یوم آزادی کی تیاریاں بھی چل رہی تھیں۔ اس پس منظر میں لگتا، ملک آزاد ہو جانے پر فسادات اپنے آپ بند ہو جائیں گے۔ ماحول کے اس جھٹ پٹے میں آزادی کی سنہری دھوپ سی نظر آتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ غیر یقینی پن بھی ڈول رہا تھا۔ اور اسی غیر یقینی پن کی حالت میں کسی کسی وقت مستقبل کا خاکہ جھلک دے جاتا تھا۔

شاید مغل سرائے اسٹیشن گزر چکا تھا جب اوپر والی برتھ پر بیٹھے پٹھان نے ایک پوٹلی کھول لی، اور اس میں سے ابلا ہوا گوشت اور نان کے ٹکڑے نکال نکال کر اپنے ساتھیوں کو دینے لگا۔ پھر وہ ہنسی مذاق کے بیچ میری بغل میں بیٹھے بابو کی طرف بھی نان کا ٹکڑا اور گوشت کی بوٹی بڑھا کر کھانے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ کھا لے بابو، طاقت آئے گی۔ ہم جیسا ہو جائے گا۔ بیوی بھی تیرے ساتھ خوش رہے گی۔ کھا لے دال خور، تو دال کھاتا ہے اس لیے دبلا ہے۔۔۔'

ڈبے میں لوگ ہنسنے لگے تھے۔ بابو نے پشتو میں کچھ جواب دیا اور پھر مسکراتا سر ہلاتا رہا۔

اس پر دوسرے پٹھان نے ہنس کر کہا، او ظالم، ہمارے ہاتھ سے نہیں لیتا ہے تو اپنے ہاتھ سے اٹھا لے۔ خدا کی قسم بکرے کا گوشت ہے اور کسی چیز کا نہیں ہے!

اوپر بیٹھا پٹھان چہک کر بولا، او خنزیر کے بچے، ادھر تمہیں کون دیکھتا ہے؟ ہم تیری بیوی کو نہیں بولے گا۔ او ہمارے ساتھ بوٹی توڑے گا تو ہم تیرے ساتھ دال پیئے گا۔

اس پر قہقہہ اٹھا لیکن دبلا پتلا بابو ہنستا سر ہلاتا رہا اور کبھی کبھی دو لفظ پشتو میں بھی کہہ دیتا۔

او کتنا برا بات ہے، ہم کھاتا ہے اور تو ہمارا منہ دیکھتا ہے۔۔۔ سب پٹھان ہنس رہے تھے۔

یہ اس لیے نہیں لیتا کہ تم نے ہاتھ نہیں دھوئے ہیں، بھاری بھرکم سردار جی بولے اور بولتے ہی کھی کھی ہنسنے لگے۔ ادھ لیٹی حالت میں بیٹھے سردار جی کی توند سیٹ سے نیچے لٹک رہی تھی۔ تم ابھی سو کر اٹھے ہو اور اٹھتے ہی پوٹلی کھول کر کھانے لگ گئے ہو۔ اسی لیے بابو جی تمہارے ہاتھ سے نہیں لیتے۔ اور کوئی بات نہیں۔ سردار جی نے میری طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور پھر کھی کھی کرنے لگے۔

گوشت نہیں کھاتا ہے بابو تو جاؤ زنانہ ڈبے میں جا کر بیٹھو۔ ادھر کیا کرتا ہے؟ پھر قہقہہ اٹھا۔

Scanned with CamScanner

ڈبے میں اور بھی کئی مسافر تھے لیکن پرانے مسافر یہی تھے جو سفر شروع ہونے پر گاڑی میں بیٹھے تھے۔ باقی مسافر اترتے چڑھتے رہے تھے۔ پرانے مسافر ہونے کے ناتے ہی اُن میں ایک طرح کی بے تکلفی آ گئی تھی۔

ادھر آ کر بیٹھو۔ تم ہمارے ساتھ بیٹھو۔ آؤ ظالم قصہ خوانی کی باتیں کریں گے۔ تب ہی کسی سٹیشن پر گاڑی رکی تھی اور نئے مسافروں کا ریلا اندر آ گیا تھا۔ بہت سے مسافر ایک ساتھ اندر گھستے چلے آئے تھے۔

"کون سا سٹیشن ہے؟" کسی نے پوچھا۔

وزیر آباد ہے شاید، میں نے باہر کی طرف دیکھ کر کہا۔ گاڑی وہاں تھوڑی دیر کھڑی رہی لیکن چھوٹنے سے پہلے ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا۔ ایک آدمی ساتھ والے ڈبے میں سے پانی پینے اترا تھا اور نل پر جا کر پانی لوٹے میں بھر رہا تھا کہ اچانک بھاگ کر اپنے ڈبے کی طرف لوٹ آیا۔ چھلچھلاتے لوٹے میں سے پانی گر رہا تھا۔ لیکن جس ڈھنگ سے وہ بھاگا تھا اُسی نے بہت کچھ بتا دیا تھا۔ نل پر کھڑے دوسرے لوگ بھی --- تین یا چار آدمی رہے ہوں گے --- ادھر اُدھر اپنے اپنے ڈبوں کی طرف بھاگ گئے تھے۔ اس طرح گھبرا کر بھاگتے لوگوں کو میں دیکھ چکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پلیٹ فارم خالی ہو گیا۔ مگر ڈبے کے اندر اب بھی ہنسی مذاق چل رہا تھا۔

کہیں کوئی گڑبڑ ہے، میرے پاس بیٹھے دبلے بابو نے کہا۔

کہیں کچھ تھا، لیکن کیا تھا، کوئی بھی ٹھیک سے نہیں جانتا تھا۔ میں کئی فساد دیکھ چکا تھا اس لیے ماحول میں ہونے والی چھوٹی سی تبدیلی کو بھی بھانپ گیا تھا۔ بھاگتے لوگ، کھٹاک سے بند ہوتے دروازے، گھروں کی چھتوں پر کھڑے آدمی، خاموشی اور سناٹا، سبھی فساد کے آثار تھے۔

ٹھیک تب ہی پچھلے دروازے کی طرف سے، جو پلیٹ فارم کے دوسری طرف کھلتا تھا، ہلکا سا شور ہوا۔ کوئی مسافر اندر گھسنا چاہتا تھا۔

کہاں گھسا آ رہا ہے، نہیں ہے جگہ! بول دیا جگہ نہیں ہے۔ کسی نے کہا۔

بند کرو جی دروازہ۔ یوں ہی منہ اٹھائے گھسے آتے ہیں--- آوازیں آ رہی تھیں۔

جتنی دیر کوئی مسافر ڈبے کے باہر کھڑا اندر آنے کی کوشش کرتا رہے، اندر بیٹھے مسافر اس کی مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ایک بار جیسے تیسے وہ اندر آ جائے تو مخالفت ختم ہو جاتی ہے اور وہ مسافر جلد ہی ڈبے کی دنیا کا باسی بن جاتا ہے اور اگلے سٹیشن پر وہی سب سے پہلے باہر کھڑے مسافر پر چلانے لگتا ہے: نہیں ہے جگہ! اگلے ڈبے میں جاؤ۔ گھسے چلے آتے ہیں---

دروازے پر شور بڑھتا جا رہا تھا۔ تب ہی میلے کچیلے کپڑوں اور لٹکتی مونچھوں والا ایک آدمی دروازے میں سے اندر گھستا دکھائی دیا۔ چیکٹ میلے کپڑے، ضرور کہیں حلوائی کی دکان کرتا ہوگا۔ وہ لوگوں کی شکایتوں آوازوں کی طرف دھیان دیے بغیر دروازے کی طرف گھوم کر بڑا سا کالے رنگ کا صندوق اندر کی

Scanned with CamScanner

طرف کھسکنے لگا۔

"آجاؤ، آجاؤ، تم بھی چڑھ جاؤ!" وہ اپنے پیچھے کسی سے کہے جا رہا تھا۔ پھر دروازے میں ایک سوکھی سی عورت نظر آئی اور اس کے پیچھے دس بارہ برس کی ایک لڑکی اندر آ گئی۔ لوگ سب ہی چلا رہے تھے۔ "ہم دو آدمی ہیں، دو لوگوں کے لیے اتنا بیٹھنا۔"

"بہت ہوشیاری دکھا رہے ہو، سامنے چڑھے آتے ہیں! اپنے باپ کا گھر سمجھ رکھا ہے۔ مت گھسنے دو جی، تیار ہے ... پیچھے..." دوسرے لوگ بھی چلا رہے تھے۔

وہ آدمی اپنا سامان اندر گھسیٹے جا رہا تھا اور اس کی بیوی اور بیٹی سرداروں کے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی تھیں۔

"اور کوئی ڈبا نہیں ملا؟ عورت ذات کو بھی نہیں سمجھا رہا ہے!"

وہ آدمی پسینے میں تر تھا اور ہانپتا ہوا سامان اندر گھسیٹے جا رہا تھا۔ صندوق کے بعد رسیوں سے بندھی کھاٹ کی پٹیاں اندر کی طرف کھینچنے لگا۔

"ٹکٹ ہے جی میرے پاس، میں نے ٹکٹ لیے ہیں۔ لاہور جا رہے ہیں، شہر میں فساد ہو گیا ہے۔ بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچا ہوں۔" اس پر ڈبے میں بیٹھے بہت سے لوگ چپ ہو گئے، لیکن برتھ پر بیٹھا پٹھان ایک دم بولا، "نکل جاؤ، ہم کو ... نہیں، اسے اندر جگہ نہیں ہے!"

وہ پٹھان سے آنکھ بچاتا رہا، آگے بڑھ کر ... سے ایک مسافر کو ایک طرف ہٹا دیا، مگر ... اس آدمی کے ساتھ آئے ... اس کی بیوی نے کچھ کہا اور وہ وہیں ... لڑکی بیٹھ گئی۔

اس آدمی کے پاس مسافروں کے ساتھ الجھنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ وہ اپنا سامان اندر گھسیٹے جا رہا تھا۔ سارے ڈبے میں خاموشی چھا گئی۔ کھاٹ کی پٹیوں کے بعد بڑی بڑی گٹھریاں آئیں۔ اس پر اوپر بیٹھے پٹھان کی قوت برداشت جواب دے گئی۔

"تمہارا ... کون ہے یہ؟" وہ چلایا۔

اس پر دوسرے پٹھان نے جو پیچھے کی سیٹ پر بیٹھا تھا، اس آدمی کا صندوق دروازے میں سے پیچھے ... کر دیا۔ ... ایک ایک کر کے سامان اندر پھینک رہا تھا۔

اس کی بیوی کو ... لگی، پر کچھ مسافر چپ ہو گئے تھے، صرف کونے میں بیٹھی بڑھیا کہہ رہی تھی، "... بیٹھنے دو۔ آ جا بیٹی، تو میرے پاس آ جا ... کاٹ لیں گے۔ چھوڑو ... بیٹھنے دو۔"

ابھی آدھا ہی سامان اندر آ پایا ہو گا کہ انجن کا وسل بجنے لگی۔

"چھوٹ گیا سامان چھوٹ گیا!" وہ آدمی بدحواس ہو کر چلایا۔

"ہمارا سامان چھوٹ گیا!" دروازے کے پاس کھڑی لڑکی سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی اور چلائے جا رہی تھی۔

Scanned with CamScanner

"اترو، نیچے اترو!" وہ آدمی بڑبڑا کر چلایا اور آگے بڑھ کر کھاٹ کی پٹیاں اور گٹھریاں باہر پھینکتے ہوئے دروازے کا ہینڈل پکڑ کر نیچے اتر گیا۔ اس کے پیچھے اس کی سہمی ہوئی بیٹی اور پھر اس کی بیوی بچے کو دونوں ہاتھوں سے دبائے، ہائے ہائے کرتی، نیچے اتر گئی۔

"بہت برا کیا ہے تم لوگوں نے، بہت برا کیا ہے!" بڑھیا اونچی آواز میں بول رہی تھی۔ "تمھارے دل میں درد مر گیا ہے۔ چھوٹی سی بچی اس کے ساتھ تھی۔ بے رحمو، تم نے بہت برا کیا ہے، دھکے دے کر اتار دیا!"

گاڑی سونے پلیٹ فارم کو لانگھتی آگے بڑھ گئی۔ ڈبے میں بے چین سی خاموشی چھا گئی۔ بڑھیا نے بولنا بند کر دیا تھا۔ پٹھانوں کی مخالفت کرنے کی کسی کو ہمت نہیں ہوئی۔

میری بغل میں بیٹھے دبلے بابو نے میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا، "آگ ہے، دیکھو آگ لگی ہے۔"

گاڑی پلیٹ فارم چھوڑ کر آگے نکل آئی تھی اور شہر پیچھے چھوٹ رہا تھا۔ تب ہی شہر کی طرف سے اٹھتے دھوئیں کے بادل اور ان میں لپلپاتی آگ کے شعلے نظر آنے لگے تھے۔

"فساد ہو رہا ہے۔ اسٹیشن پر بھی لوگ بھاگ رہے تھے۔ ضرور کہیں فساد ہوا ہے۔"

شہر میں آگ لگی ہوئی تھی۔ یہ بات ڈبے بھر کے لوگوں کو معلوم ہو گئی اور وہ لپک لپک کر کھڑکیوں سے آگ کا منظر دیکھنے لگے۔

جب گاڑی شہر چھوڑ کر آگے نکل گئی تو ڈبے میں سناٹا چھا گیا۔ میں نے گھوم کر ڈبے کے اندر دیکھا، دبلے بابو کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور ماتھے پر پسینے کی پرت کسی مردے کے ماتھے کی طرح چمک رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے اپنی اپنی جگہ بیٹھے سب مسافروں نے اپنے ادھر ادھر بیٹھے لوگوں کا جائزہ لیا ہے۔ سردار جی اٹھ کر میری سیٹ پر آ بیٹھے۔ نیچے والی سیٹ پر بیٹھا پٹھان اٹھا اور اپنے دو ساتھی پٹھانوں کے ساتھ اوپر والی برتھ پر چڑھ گیا۔ یہی عمل شاید ریل گاڑی کے دوسرے ڈبوں میں بھی جاری تھا۔ اب ڈبے میں تناؤ آ گیا۔ لوگوں نے بات چیت بند کر دی۔ تینوں کے تینوں پٹھان اوپر والی برتھ پر ساتھ ساتھ بیٹھے چپ چاپ نیچے دیکھے جا رہے تھے۔ تمام مسافروں کی آنکھیں پہلے سے زیادہ کھلی کھلی اور شک بھری نظر آنے لگیں۔ یہی صورت حال شاید گاڑی کے سبھی ڈبوں میں پیدا ہو رہی تھی۔

"کون سا اسٹیشن تھا یہ؟" ڈبے میں کسی نے پوچھا۔

"وزیر آباد،" کسی نے جواب دیا۔

جواب ملنے پر ڈبے میں ایک دوسرا رد عمل ہوا۔ پٹھانوں کے دل کا تناؤ فوراً ڈھیلا پڑ گیا، جب کہ ہندو سکھ مسافروں کی خاموشی اور زیادہ گہری ہو گئی۔ ایک پٹھان نے اپنی واسکٹ کی جیب میں سے نسوار کی ڈبیا نکالی اور ناک میں نسوار چڑھانے لگا۔ دوسرے پٹھان بھی اپنی اپنی ڈبیا نکال کر نسوار چڑھانے لگے۔ بڑھیا برابر مالا جپے جا رہی تھی۔ کسی کسی وقت اس کے بدبداتے ہونٹ نظر آتے، لگتا ان میں سے کوئی کھوکھلی سی آواز نکل رہی تھی۔

Scanned with CamScanner

اگلے اسٹیشن پر جب گاڑی رکی تو وہاں بھی سناٹا تھا۔ کوئی پرندہ تک نہیں پھڑک رہا تھا۔ ہاں، ایک بھشتی پیٹھ پر پانی کی مشک لادے، پلیٹ فارم لانگھ کر آیا اور مسافروں کو پانی پلانے لگا۔

لو پیو پانی، پانی پیو۔ زنانہ ڈبے میں سے عورتوں اور بچوں کے کئی ہاتھ باہر نکل آئے تھے۔

بہت مار کاٹ ہوئی ہے، بہت لوگ مرے ہیں۔ لگتا تھا وہ اس مار کاٹ میں اکیلا ثواب کمانے چلا آیا تھا۔

گاڑی سرکی تو اچانک کھڑکیوں کے پٹ چڑھائے جانے لگے۔ دور دور تک پہیوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ کھڑکیوں کے پٹ چڑھنے کی آواز آنے لگی۔

کسی نامعلوم خطرے کے احساس سے دبلا بابو میرے پاس والی سیٹ سے اٹھا اور دو سیٹوں کے درمیان فرش پر لیٹ گیا۔ اس کا چہرہ اب بھی مردے کی طرح پیلا ہو رہا تھا۔ اس پر برتھ پر بیٹھا پٹھان اس کا مذاق اڑانے لگا۔ اوئے بے غیرت، تم مرد ہے کہ عورت ہے؟ سیٹ سے اٹھ کر نیچے لیٹتا ہے۔ تم مرد کے نام کو بدنام کرتا ہے! وہ بار بار بول رہا تھا اور بار بار ہنسے جا رہا تھا۔ پھر پشتو میں کچھ کہنے لگا۔ بابو چپ چاپ لیٹا رہا۔ دوسرے تمام مسافر بھی چپ تھے۔ ڈبے کا ماحول بوجھل ہو گیا تھا۔

ایسے آدمی کو ہم ڈبے میں بیٹھنے نہیں دے گا۔ او بابو، تم اگلے اسٹیشن پر اترو اور زنانہ ڈبے میں بیٹھو۔

مگر اب بابو کی حاضر جوابی اس کے گلے میں سوکھ چکی تھی۔ وہ ہکلا کر چپ ہو رہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ اپنے آپ سیٹ پر جا بیٹھا اور دیر تک اپنے کپڑوں کی دھول جھاڑتا رہا۔ وہ فرش پر کیوں لیٹ گیا تھا؟ شاید اسے ڈر تھا کہ باہر سے گاڑی پر پتھراؤ ہوگا یا گولی چلے گی۔ شاید اسی خوف سے کھڑکیوں کے پٹ بھی چڑھائے جا رہے تھے۔

کچھ بھی کہنا مشکل تھا۔ ممکن ہے کسی ایک مسافر نے کسی وجہ سے کھڑکی کا پٹ چڑھایا ہو اور پھر اس کی دیکھا دیکھی، بلا سوچے سمجھے، دھڑادھڑ کھڑکیوں کے پٹ چڑھائے جانے لگے ہوں۔

بوجھل اور غیر یقینی سے ماحول میں سفر کٹنے لگا۔ رات گہری ہونے لگی۔ ڈبے کے مسافر خاموش اور خوف زدہ، [illegible] بیٹھے تھے۔ کبھی گاڑی کی رفتار اچانک ٹوٹ کر دھیمی پڑ جاتی تو لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتے۔ اور کبھی راستے میں رک جاتی تو ڈبے کے اندر کا سناٹا اور بھی گہرا ہو جاتا۔ صرف پٹھان بے فکر بیٹھے تھے۔ ہاں، بات چیت کرنا انہوں نے بھی چھوڑ دیا تھا، کیونکہ اب ان کی بات چیت میں کوئی بھی شامل ہونے والا نہیں تھا۔

دھیرے دھیرے پٹھان اونگھنے لگے، جب کہ دوسرے مسافر پھٹی پھٹی آنکھوں سے خلا میں گھور رہے تھے۔ [illegible] سر ٹیکے، پاؤں سیٹ پر رکھے بیٹھی بیٹھی سو گئی تھی۔ اوپر والی برتھ پر ایک پٹھان نے ادھ لیٹے ہی لیٹے کرتے کی جیب میں سے کالے منکوں کی تسبیح نکالی اور اسے دھیرے دھیرے ہاتھ میں چلانے لگا۔

Scanned with CamScanner

کھڑکی کے اوپر آسمان میں چاند نکل آیا تھا اور چاندنی میں باہر کی دنیا اور بھی زیادہ غیر یقینی، اور پُراسرار ہو گئی تھی۔ کسی کسی وقت دور، کسی طرف آگ کے شعلے اٹھتے نظر آتے، کوئی نگر جل رہا تھا۔ گاڑی کسی وقت چنگھاڑتی ہوئی آگے بڑھنے لگتی، پھر کسی وقت اس کی رفتار دھیمی پڑ جاتی اور میلوں تک دھیمی رفتار ہی سے چلتی رہتی۔

اچانک وہ بابو کھڑکی میں سے باہر دیکھ کر اونچی آواز میں بولا "ہربنس پورہ گزر گیا ہے۔" اس کی آواز میں جوش تھا، وہ جیسے چیخ کر بولا تھا۔ ڈبے کے سبھی لوگ اس کی آواز سن کر چونک گئے۔ اس وقت ایسا لگا جیسے ڈبے کے زیادہ تر مسافروں نے اس کی آواز ہی کو سن کر کروٹ بدلی ہو۔

"او بابو، چلاتا کیوں ہے؟" تسبیح والا پٹھان چونک کر بولا۔ "ادھر اترے گا تم؟ زنجیر کھینچوں؟" اور کھی کھی کر کے ہنس دیا۔ ظاہر ہے وہ ہربنس پورہ کے حالات سے بلکہ اس کے نام تک سے ناواقف تھا

بابو نے کوئی جواب نہیں دیا، صرف سر ہلا کر ایک آدھ بار پٹھان کی طرف دیکھا اور پھر کھڑکی کے باہر جھانکنے لگا۔

ڈبے میں پھر خاموشی چھا گئی۔ تبھی انجن نے سیٹی دی اور ایک دم اس کی رفتار ٹوٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک کھٹاک کی سی آواز سنائی دی، شاید گاڑی نے لائن بدلی تھی۔ بابو نے جھانک کر اس سمت میں دیکھا جدھر گاڑی چلی جا رہی تھی۔

"شہر آ گیا ہے!" وہ پھر اونچی آواز میں چلایا۔ "امرتسر آ گیا ہے!" اس نے پھر سے کہا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اوپر والی برتھ پر لیٹے پٹھان کو مخاطب کر کے کہا، "او بے پٹھان کے بچے! نیچے اتر تیری ماں کی۔۔۔ نیچے اتر، تیری اس پٹھان بنانے والے کی میں۔۔۔"

بابو چلانے لگا تھا اور چیخ چیخ کر گالیاں بکنے لگا تھا۔ تسبیح والے پٹھان نے کروٹ بدلی اور بابو کی طرف دیکھ کر بولا "او کیا اے بابو؟ ام کو کچھ بولا؟"

بابو کو جوش میں دیکھ کر دوسرے مسافر بھی اٹھ بیٹھے۔

"نیچے اتر، تیری میں۔۔۔ ہندو عورت کو لات مارتا ہے، حرام زادے، تیری اس۔۔۔"

"اے بابو، بک بک مت کرو۔ او خنزیر کے تخم، گالی مت بکو، ام نے بول دیا۔ ام تمارا زبان کھینچ لے گا۔"

"گالی دیتا ہے مادر۔۔۔" بابو چلایا اور اچھل کر سیٹ پر چڑھ گیا۔ وہ سر سے پیر تک کانپ رہا تھا۔

"بس بس،" سردار جی بولے، "یہ لڑنے کی جگہ نہیں ہے۔ تھوڑی دیر کا سفر باقی ہے، آرام سے بیٹھو۔"

"تیری میں لات نہ توڑوں تو کہنا۔ گاڑی تیرے باپ کی ہے؟" بابو چلایا۔

"او ام نے کیا بولا۔ سب لوگ اس کو نکالتا تا، ام نے بی نکالا۔ یہ ادھر ام کو گالی دیتا اے۔ ام اس کا زبان کھینچ لے گا۔"

بڑھیا بیچ میں پھر بول اٹھی، "ارے جیسی جوگیو، آرام سے بیٹھو۔ اے رب دیو بندیو، کچھ ہوش کرو!" اس کے ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے اور ان میں سے ہلکی سی پھسپھساہٹ سنائی دے رہی تھی۔

بابو چلائے جا رہا تھا، "اپنے گھر میں شیر بنتا تھا۔ اب بول، تیری ہی میں اس پٹھان بنانے والے کی۔۔۔"

تب ہی گاڑی اورسر کے پلیٹ فارم پر رکی۔ پلیٹ فارم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا جو جھانک جھانک کر ڈبوں کے اندر دیکھنے لگے۔ لوگ بار بار ایک ہی سوال پوچھ رہے تھے: "پیچھے کیا ہوا ہے؟ کہاں پر فساد ہوا ہے؟"

کھچا کھچ بھرے پلیٹ فارم پر شاید اسی بات کا ذکر تھا کہ پیچھے کیا ہوا ہے۔ پلیٹ فارم پر کھڑے دو تین خوانچے والوں پر مسافر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ سبھی کو اچانک بھوک پیاس پریشان کرنے لگی تھی۔ اسی دوران تین چار پٹھان ہمارے ڈبے کے باہر دکھائی دیے اور کھڑکی میں سے جھانک جھانک کر اندر دیکھنے لگے۔ اپنے پٹھان ساتھیوں پر نظر پڑتے ہی وہ ان سے پشتو میں کچھ بولنے لگے۔ میں نے گھوم کر دیکھا، بابو ڈبے میں نہیں تھا۔ نہ جانے کب وہ ڈبے سے نکل گیا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہ غصے میں پاگل ہوا جا رہا تھا، نہ جانے کیا کر بیٹھے۔ مگر اسی دوران ڈبے کے تینوں پٹھان اپنی اپنی گٹھری اٹھا کر باہر نکل گئے اور اپنے پٹھان ساتھیوں کے ساتھ گاڑی کے کسی اگلے ڈبے کی طرف بڑھ گئے۔ جو تقسیم پہلے ہر ایک ڈبے کے اندر ہوتی رہی تھی، اب وہ پوری گاڑی کی سطح پر ہو رہی تھی۔

خوانچے والوں کے ارد گرد بھیڑ چھٹنے لگی۔ لوگ اپنے اپنے ڈبوں کی طرف لوٹنے لگے۔ اچانک مجھے ایک طرف سے وہ بابو آتا دکھائی دیا۔ اس کا چہرہ اب بھی زرد تھا اور ماتھے پر بالوں کی لٹ جھول رہی تھی۔ نزدیک آیا تو میں نے دیکھا، اس نے اپنے بائیں ہاتھ میں لوہے کی ایک سلاخ اٹھا رکھی تھی۔ جانے وہ اسے کہاں سے مل گئی تھی۔ ڈبے میں گھستے وقت اس نے سلاخ کو اپنی پیٹھ کے پیچھے کر لیا اور ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے آہستہ سے سیٹ کے نیچے سرکا دیا۔ سیٹ پر بیٹھتے ہی اس کی آنکھیں پٹھانوں کی تلاش میں اوپر کو اٹھیں، لیکن ڈبے میں پٹھانوں کو نہ پا کر وہ مڑ مڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

"نکل گئے حرامی، مادر۔۔۔ سب کے سب نکل گئے!" پھر وہ سٹپٹا کر اٹھ کھڑا ہوا اور چلا کر بولا، "تم نے ان کو جانے کیوں دیا؟ تم سب نامرد ہو، بزدل!"

گاڑی میں بہت بھیڑ تھی، بہت سے نئے مسافر آ گئے تھے۔ کسی نے اس کی طرف کوئی خاص دھیان نہیں دیا۔

گاڑی سرکنے لگی تو وہ پھر میری سامنے والی سیٹ پر آ بیٹھا۔ وہ بہت جوش میں تھا اور بڑبڑائے جا رہا تھا۔

دھیرے دھیرے ہچکولے کھاتی گاڑی آگے بڑھنے لگی۔ ڈبے کے پرانے مسافروں نے پیٹ بھر پوریاں کھا لی تھیں اور پانی پی لیا تھا۔ اب گاڑی اس علاقے میں آگے بڑھنے لگی تھی جہاں ان کے جان و

Scanned with CamScanner

مال کو خطرہ نہیں تھا۔

سبھی مسافر باتوں میں مصروف تھے۔ دھیرے دھیرے گاڑی اپنی عام رفتار سے چلنے لگی تھی اور کچھ ہی دیر بعد لوگ اونگھنے بھی لگے تھے۔ مگر بابو اب بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے کی طرف دیکھے جا رہا تھا اور بار بار مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ پٹھان ڈبے میں سے نکل کر کس طرف گئے ہیں۔ اس کے سر پر جنون سوار تھا۔

گاڑی کے ہچکولوں میں میں خود اونگھنے لگا تھا۔ ڈبے میں لیٹنے کی جگہ نہیں تھی۔ بیٹھے بیٹھے ہی نیند میں میرا سر کبھی ایک طرف کو لڑھک جاتا اور کبھی دوسری طرف۔ کسی کسی وقت جھٹکے سے میری نیند ٹوٹتی اور مجھے سامنے کی سیٹ پر بے پروائی سے پڑے سردار جی کے خراٹے سنائی دیتے۔ امرتسر پہنچنے کے بعد سردار جی پھر سے سامنے کی سیٹ پر ٹانگیں پسار کر لیٹ گئے تھے۔ ڈبے میں طرح طرح کی آڑی ترچھی حالتوں میں مسافر پڑے تھے۔ ان کی بے ترتیب ہیئت کو دیکھ کر لگتا جیسے ڈبا لاشوں سے بھرا ہو۔ پاس بیٹھے بابو پر نظر پڑتی تو کبھی وہ کھڑکی سے باہر منہ کیے ہوتا تو کبھی دیوار سے پیٹھ لگائے تن کر بیٹھا نظر آتا۔

کسی کسی وقت جب گاڑی کسی اسٹیشن پر رکتی تو پہیوں کی گڑگڑاہٹ بند ہو کر خاموشی چھا جاتی۔ اس وقت یوں لگتا جیسے پلیٹ فارم پر کچھ گرا ہے یا جیسے کوئی مسافر گاڑی سے اترا ہے، اور میں جھٹکے کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ جاتا۔

اسی طرح ایک بار جب میری نیند ٹوٹی تو گاڑی کی رفتار دھیمی پڑ گئی تھی اور ڈبے میں اندھیرا تھا۔ میں نے اسی طرح ادھ لیٹے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ دور، پیچھے کی طرف، کسی اسٹیشن کے سگنل کے لال قمقمے چمک رہے تھے۔ ظاہر ہے گاڑی کسی اسٹیشن سے گزر کر آئی تھی لیکن ابھی تک اس نے رفتار نہیں پکڑی تھی۔

ڈبے کے باہر مجھے دھیمی سی، مبہم آوازیں سنائی دیں۔ دور ایک دھندلا سا کالا ہیولا نظر آیا۔ نیند کے خمار میں کچھ دیر میری نظریں اس پر جمی رہیں، پھر میں نے اسے سمجھ پانے کا خیال چھوڑ دیا۔ ڈبے کے اندر اندھیرا تھا، بتیاں بجھی ہوئی تھیں، لیکن باہر لگتا تھا پو پھٹنے لگی ہے۔

میری پیٹھ پیچھے، ڈبے کے باہر، کسی چیز کے کھرچنے کی سی آواز آئی۔ میں نے دروازے کی طرف مڑ کر دیکھا۔ ڈبے کا دروازہ بند تھا۔ مجھے پھر دروازہ کھرچے جانے کی آواز سنائی دی۔ پھر میں نے صاف صاف سنا، لاٹھی سے کوئی آدمی ڈبے کا دروازہ پیٹ رہا تھا۔ میں نے جھانک کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سچ مچ ایک آدمی ڈبے کی دو سیڑھیاں چڑھ آیا تھا۔ اس کے کندھے پر ایک گٹھری جھول رہی تھی اور ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ اس نے بدرنگ سے کپڑے پہن رکھے تھے اور اس کے داڑھی تھی۔ پھر جب میری نظر باہر نیچے کی طرف گئی تو دیکھا، گاڑی کے ساتھ ساتھ ایک عورت ننگے پاؤں بھاگتی آ رہی تھی۔ اس نے دو گٹھریاں اٹھا رکھی تھیں۔ بوجھ کی وجہ سے اس سے دوڑا نہیں جا رہا تھا۔ ڈبے کے پائیدان پر کھڑا آدمی

Scanned with CamScanner

بار بار اُس کی طرف مڑ کر دیکھ رہا تھا، ور باچت ہو، کہے جا رہا تھا، "آ جا، آ جا، تو بھی چڑھ جا!"

دروازے پر پھر لاٹھی پٹخنے کی آواز آئی۔ "کھولو جی دروازہ، خدا کے واسطے دروازہ کھولو۔"

وہ آدمی ہانپ رہا تھا۔ "خدا کے لیے دروازہ کھولو۔ میرے ساتھ عورت ذات ہے۔ گاڑی نکل جائے گی..."

اچانک میں نے دیکھا، بابو ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کے پاس جا کر دروازے میں لگی ہوئی کھڑکی سے منہ باہر نکال کر بولا، "کون ہے؟ ادھر جگہ نہیں ہے۔" باہر کھڑا آدمی پھر گڑگڑانے لگا، "خدا کے واسطے، گاڑی نکل جائے گی..." اور کھڑکی میں سے ہاتھ اندر ڈال کر دروازہ کھولنے کے لیے چٹخنی ٹٹولنے لگا۔

"نہیں ہے جگہ، بول دیا! اُتر جاؤ گاڑی پر سے..." بابو چلایا، اور اُسی لمحے لپک کر دروازہ کھول دیا۔

"یا اللہ!" اُس آدمی کی مبہم سی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھلنے پر جیسے اُس نے اطمینان کا سانس لیا ہو۔

اور اُسی وقت میں نے بابو کے ہاتھ میں لوہے کی سلاخ کو چمکتے ہوئے دیکھا۔ ایک ہی بھرپور وار بابو نے اُس مسافر کے سر پر کیا تھا۔ میں دیکھتے ہی ڈر گیا اور میری ٹانگیں لرز گئیں۔ مجھے لگا سلاخ کے وار کا اُس آدمی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اُس کے دونوں ہاتھ اب بھی زور سے دروازے کے ہینڈل کو پکڑے ہوئے تھے۔ کندھے پر لٹکتی ہوئی گٹھری کھسک کر اُس کی کہنی پر آ گئی تھی۔

اچانک اُس کے چہرے پر خون کی دو تین دھاریں ایک ساتھ پھوٹ پڑیں۔ جھٹ پٹے میں مجھے اُس کے کھلے ہونٹ اور چمکتے دانت نظر آئے۔ وہ دو ایک بار "یا اللہ!" بڑبڑایا، پھر اُس کے پیر لڑکھڑا گئے۔ اُس کی آنکھوں نے بابو کی طرف دیکھا، دھندلی سی آنکھیں جو دھیرے دھیرے سکڑتی جا رہی تھیں گویا اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں کہ وہ کون ہے اور اُس سے کس عداوت کا بدلہ لے رہا ہے۔ اس دوران اندھیرا کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔ اُس کے ہونٹ پھر سے پھڑپھڑانے اور سفید دانت جھلکنے لگے۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ مسکرایا ہو، لیکن حقیقت میں صدمے کی وجہ سے اُس کے ہونٹوں پر بل پڑنے لگے تھے۔

نیچے پٹری کے ساتھ ساتھ بھاگتی ہوئی عورت کوستی جا رہی تھی۔ اُسے ابھی تک معلوم نہیں ہو پایا تھا کہ ہو کیا گیا ہے۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ شاید گٹھری کی وجہ سے اس کا شوہر گاڑی پر ٹھیک طرح چڑھ نہیں پا رہا اور اس کا پیر جم نہیں رہا۔ وہ گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتی ہوئی، اپنی دو گٹھریوں کے باوجود، اپنے شوہر کے پیر کو پکڑ پکڑ کر پائیدان پر ٹکانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اچانک اُس آدمی کے دونوں ہاتھ ڈنڈے کے ہینڈل سے چھوٹ گئے اور وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح نیچے جا گرا۔ اُس کے گرتے ہی عورت نے بھاگنا بند کر دیا جیسے دونوں کا سفر ایک ساتھ ہی ختم ہو گیا ہو۔

بابو اب بھی میرے قریب ڈبے کے کھلے دروازے میں بُت بنا کھڑا تھا۔ لوہے کی سلاخ اُسی طرح اُس کے ہاتھ میں تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ سلاخ کو پھینک دینا چاہتا ہے لیکن پھینک نہیں پا رہا، اُس کا ہاتھ جیسے

Scanned with CamScanner

اُٹھ ہی نہیں رہا تھا۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی اور ڈبے کے اندھیرے کونے میں کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھا ہوا میں اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

پھر وہ کھڑے کھڑے ہلا اور کسی نجانی قوت کے بس میں آکر وہ ایک قدم آگے بڑھ آیا اور دروازے میں سے باہر، پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔ گاڑی آگے نکلتی جا رہی تھی۔ دور پٹری کے کنارے اندھیرا ہیولا سا نظر آ رہا تھا۔

بابو کا جسم حرکت میں آیا۔ ایک جھٹکے سے اُس نے لوہے کی سلاخ کو ڈبے سے باہر پھینک دیا۔ پھر گھوم کر ڈبے کے اندر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ سب مسافر سوئے پڑے تھے۔ میری طرف اُس کی نظر نہیں اٹھی۔

تھوڑی دیر تک وہ وہیں کھڑا رہا، پھر اس نے گھوم کر دروازہ بند کر دیا۔ اُس نے غور سے اپنے کپڑوں کو دیکھا، دونوں ہاتھوں کو دیکھا، پھر باری باری اپنے ہاتھوں کو ناک کے قریب لا کر سونگھا، جیسے جاننا چاہتا ہو کہ کہیں اس کے ہاتھوں میں سے خون کی بُو تو نہیں آ رہی۔ پھر وہ دبے پاؤں چلتا ہوا آ کر میری بغل والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

دھیرے دھیرے دھندلکا چھٹنے لگا اور صبح پھوٹ پڑی۔ چاروں طرف روشنی پھیلنے لگی۔ کسی نے زنجیر کھینچ کر گاڑی کو نہیں روکا تھا اور لوہے کی سلاخ کی چوٹ کھا کر گری ہوئی اُس آدمی کی لاش میلوں پیچھے رہ گئی تھی۔ سامنے گیہوں کے کھیتوں میں پھر وہی ہلکی ہلکی لہریں سی اٹھتی نظر آنے لگی تھیں۔

سردار جی اپنا بدن کھجلاتے اٹھ بیٹھے۔ میری بغل میں بیٹھا بابو اپنے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھے سامنے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ رات بھر میں اُس کے چہرے پر داڑھی کے چھوٹے چھوٹے بال اُگ آئے تھے۔ اپنے سامنے بیٹھا دیکھ کر سردار جی اس سے باتیں کرنے لگے۔ "بڑے جی دار ہو بابو، دبلے پتلے ہو لیکن ہو بڑے دل والے۔ بڑی ہمت دکھائی تم نے۔ تم سے ڈر کر ہی وہ پٹھان ڈبے میں سے نکل گئے۔ یہاں رہتے تو ایک نہ ایک کی کھوپڑی تم ضرور درست کر دیتے۔" اور سردار جی ہنسنے لگے۔

جواب میں بابو مسکرایا، ایک خوفناک مسکراہٹ، اور دیر تک سردار جی کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔

**

# نرمل ورما

ہندی سے ترجمہ: خورشید قائم خانی۔ تاج قائم خانی

## ایک دن کا مہمان

اس نے اپنا سوٹ کیس دروازے کے آگے رکھ دیا۔ گھنٹی کا بٹن دبایا اور انتظار کرنے لگا۔ مکان میں خاموشی تھی۔ کوئی ہلچل نہیں ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے اسے گمان ہوا کہ شاید گھر میں کوئی نہیں ہے اور وہ خالی مکان کے سامنے کھڑا ہے۔ اس نے رومال نکال کر پسینہ پونچھا، اپنا بریف کیس سوٹ کیس کے اوپر رکھ دیا۔ دوبارہ بٹن دبایا اور کان لگا کر سننے لگا۔ برآمدے کے پیچھے کوئی کھلی کھڑکی ہوا میں پھڑپھڑا رہی تھی۔

وہ پیچھے ہٹ کر اوپر دیکھنے لگا۔ گلی کے دوسرے سرے پر مکان تھا۔ وہ دوسرے مکانوں کی طرح، کالی چھت، کھڑکی کے اوپر کی شکل میں دونوں طرف سے ڈھلان دار، اور بیچ میں پتھر کی دیوار جس کی پیشانی پر مکان کا نمبر ایک ڈال کی طرح چمک رہا تھا۔ وہاں کی کھڑکیاں بند تھیں اور پردے گرے ہوئے تھے۔ کہاں جا سکتے ہیں اس وقت؟ اس نے سوچا۔

وہ مکان کے پیچھے چلا گیا۔ وہی لان، گھاس اور جھاڑیاں تھیں جو اس نے دو سال پہلے دیکھی تھیں۔ بیچ میں وہ بوڑھی شیشم کھڑی تھی جو کسی کالے بوڑھے ریچھ کی طرح اونگھ رہا تھا۔ لیکن گیراج کھلا اور خالی پڑا تھا۔ وہ کار میں کہیں گئے تھے۔ ممکن ہے صبح سے انھوں نے دیر تک اس کا انتظار کیا ہو اور اب کسی کام سے باہر نکل گئے ہوں۔ لیکن دروازے پر اس کے لیے ایک چٹ تو چھوڑ ہی سکتے تھے۔

وہ پھر سامنے کے دروازے پر لوٹ آیا۔ اگست کی چلچلاتی دھوپ اس کی آنکھوں پر پڑ رہی تھی۔ سارا جسم پسینے سے بھیگ رہا تھا۔ وہ برآمدے کی سیڑھی پر اپنے سوٹ کیس پر بیٹھ گیا۔ اچانک اسے لگا سڑک کے پار مکانوں کی کھڑکیوں سے کچھ چہرے باہر جھانک رہے ہیں، اسے دیکھ رہے ہیں۔ اس نے سنا تھا انگریز لوگ دوسروں کی پریشانیوں میں دخل نہیں دیتے، لیکن وہ مکان کے باہر برآمدے میں بیٹھا تھا جہاں

Scanned with CamScanner

پرائیویسی کا کوئی مطلب نہیں تھا؛ اسی لیے وہ لوگ بلا جھجک، پوری بے باکی سے اُسے گھور رہے تھے۔ لیکن شاید اُن کے تجسس کی ایک دوسری وجہ بھی تھی؛ اُس چھوٹے سے انگریزی قصباتی شہر میں لگ بھگ سب ایک دوسرے کو پہچانتے تھے اور وہ نہ صرف اپنی شکل صورت سے بلکہ ڈھیلے ڈھالے ہندوستانی سوٹ میں کافی عجیب مخلوق دکھائی دے رہا ہوگا۔ اس کے ٹوٹے پھوٹے سامان اور گرد اور پسینے سے لت پت چہرے سے کوئی یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا کہ ابھی تین دن پہلے اس نے فرینکفرٹ کی کانفرنس میں پیپر پڑھا تھا۔ میں ایک ٹوٹا پھوٹا ایشین مہاجر دکھائی دے رہا ہوں گا، اس نے سوچا اور اچانک کھڑا ہو گیا۔ جیسے کھڑے ہو کر انتظار کرنا زیادہ آسان ہو۔ اس بار بنا سوچے سمجھے اس نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اور ایک دم ہکا بکا ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ ہاتھ لگتے ہی دروازہ پٹ سے کھل گیا تھا۔ سیڑھیوں پر پیروں کی چاپ سنائی دی۔ اور دوسرے ہی لمحے وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

وہ بھاگتے ہوئے سیڑھیاں اُتر کر نیچے آئی تھی اور اُس سے چمٹ گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ پوچھتا، کیا تم اندر تھیں؟ اور وہ پوچھتی، "تم باہر کھڑے تھے؟"، اس نے اپنے دھول بھرے قسم پشتم ہاتھوں سے اس کے دبلے کندھوں کو پکڑ لیا اور لڑکی کا سر نیچے جھک آیا اور اس نے اپنا منہ اس کے بالوں پر رکھ دیا۔

پڑوسیوں نے ایک ایک کر کے اپنی کھڑکیاں بند کر دیں۔
لڑکی نے دھیرے سے اُسے اپنے سے الگ کر دیا۔ باہر کب سے کھڑے تھے؟
"پچھلے دو سال سے۔"
واہ! لڑکی ہنسنے لگی۔ اسے اپنے باپ کی ایسی ہی باتیں بوڑھی جان پڑتی تھیں۔
میں نے دو بار گھنٹی بجائی۔ تم لوگ کہاں تھے؟
گھنٹی خراب ہے۔ اسی لیے میں نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔
تمہیں مجھے فون پر بتانا چاہیے تھا۔ میں پچھلے ایک گھنٹے سے آگے پیچھے دوڑ رہا ہوں۔
میں آپ تمہیں بتانے والی تھی، لیکن بیچ میں لائن کٹ گئی۔ تم نے اور پیسے کیوں نہیں ڈالے؟

میرے پاس صرف دس پینس تھے... وہ عورت کافی چڑیل تھی۔
کون عورت؟ لڑکی نے اُس کا بیگ اٹھا لیا۔
وہی جس نے ہمیں بیچ میں کاٹ دیا۔
آدمی اپنا سوٹ کیس کھینچ ڈرائنگ روم میں گھسیٹ لایا۔ لڑکی شوق سے بیگ کے اندر جھانک رہی تھی۔ سگریٹ کے پیکٹ، اسکاچ کی بوتل، چاکلیٹ کے بنڈل... وہ ساری چیزیں جو اس نے ہڑبڑی میں فرینکفرٹ کے ایئرپورٹ پر ڈیوٹی فری شاپ سے خریدی تھیں، اب بیگ سے باہر جھانک رہی تھیں۔

Scanned with CamScanner

تم نے اپنے بال کٹوا لیے؟ آدمی نے پہلی بار غور سے لڑکی کا چہرہ دیکھا۔

ہاں، صرف چھٹیوں کے لیے۔ کیسے لگتے ہیں؟

مگر تم میری بیٹی ہو۔ سو میں تو یہی کہوں گا، بہت دنوں بعد سمجھ میں آئی ہے۔

اوہ پاپا! لڑکی نے ہنستے ہوئے بیگ سے پیکٹ نکالا، ریپر کھولا، پھر اس کی طرف بڑھا دی۔

سوئس چاکلیٹ! اس نے منہ میں گھلاتے ہوئے کہا۔

میرے لیے ایک گلاس پانی لا سکتی ہو؟

ٹھہرو، میں چائے بنا رہی ہوں۔

چائے بعد میں... وہ اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں کچھ ٹٹولنے لگا... نوٹ بک، والٹ، پاسپورٹ، سب چیزیں باہر نکل آئیں، آخر میں اسے ٹیبلٹس کی ڈبیا ملی جسے وہ ڈھونڈ رہا تھا۔

لڑکی پانی کا گلاس لے کر آئی اور اس سے پوچھا، کیسی دوائی ہے؟

جرمن، اس نے کہا۔ "بہت اثر کرتی ہے۔"

اس نے ٹیبلٹ پانی کے ساتھ نگل لی، پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا اس نے سوچا تھا: وہی کمرہ، شیشے کا دروازہ، کھلے ہوئے پردوں کے درمیان سے نظر آتا وہی چھوٹا سا صحن جیسا لان، ٹی وی کے اسکرین پر اڑتے ہوئے پرندوں کا سایہ جو باہر اڑتے تھے پر گمان یہ ہوتا تھا جیسے اندر ہی ہوں۔

وہ کچن کی دہلیز پر آیا۔ کیبن کے چولھوں کے پیچھے لڑکی کی پیٹھ دکھائی دے رہی تھی۔ کالی جینز اور سفید قمیص جس کی آستینیں کہنیوں پر جھول رہی تھیں۔ وہ بہت ہلکی پھلکی اور چھوٹی سی دکھائی دے رہی تھی۔

ماما کہاں ہیں؟ اس نے پوچھا۔ شاید اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ لڑکی نے اسے نہیں سنا، لیکن اسے لگا جیسے لڑکی کی گردن کچھ اوپر اٹھی تھی۔ ماما کیا اوپر ہیں؟ اس نے دوبارہ کہا اور لڑکی ویسے ہی ساکت کھڑی رہی تو اسے عجیب لگا۔ اس نے پہلی دفعہ بھی اس کے سوال کو سن لیا تھا۔

کیا وہ باہر گئی ہیں؟ اس نے پوچھا۔ لڑکی نے بہت دھیرے سے، بغیر مڑے، سر ہلایا، جس کا مطلب کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

پاپا، تم کچھ میری مدد کرو گے؟

وہ پلٹ کر کچن میں چلا آیا۔ بتاؤ، کیا کام ہے؟

تم چائے کی کیتلی لے کر اندر جاؤ، میں ابھی آتی ہوں۔

بس! اس نے مایوسی سے لہجے میں کہا۔

ہاں، پیالے اور پلیٹیں بھی لیتے جاؤ۔

وہ سب چیزیں لے کر اندر کمرے میں چلا آیا۔ وہ دوبارہ کچن میں جانا چاہتا تھا لیکن لڑکی کے ڈر سے وہیں صوفے پر بیٹھا رہا۔ کچن سے کچھ تلنے کی خوشبو آ رہی تھی۔ لڑکی اس کے لیے کچھ بنا رہی تھی، اور وہ اس

Scanned with CamScanner

کی کوئی مدد نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک بار خیال آیا کچن میں جا کر اُسے منع کر آئے کہ وہ کچھ نہیں کھائے گا، لیکن دوسرے ہی لمحے بھوک نے اُسے پکڑ لیا۔ صبح سے اُس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ بوسٹن اسٹیشن کے کیفے ٹیریا میں اتنی لمبی کیو لگی تھی کہ وہ ٹکٹ لے کر سیدھا ٹرین میں گھس گیا تھا۔ سوچا تھا ڈائننگ کار میں کچھ کھا پی لے گا، لیکن وہ دوپہر سے پہلے نہیں کھلتی تھی۔ سچ پوچھا جائے تو اُس نے آخری کھانا کل شام ڈینکفرٹ میں کھایا تھا اور جب رات کو لندن پہنچا تو اپنے ہوٹل کی بار میں پیتا رہا تھا۔ تیسرے گلاس کے بعد اُس نے جیب سے نوٹ بک نکالی، نمبر دیکھا اور باہر کے ٹیلی فون بوتھ میں جا کر فون ملایا۔ پہلی دفعہ تک پتا نہیں چلا اس کی بیوی کی آواز ہے یا بچی کی۔ اُس کی بیوی نے فون اٹھایا ہوگا، کیوں کہ کچھ دیر تک فون کا سناٹا اُس کے کان میں جھنجھناتا رہا تھا۔ پھر اُس نے سنا وہ اوپر سے بچی کو بلا رہی ہے۔ اور اُسی وقت اس نے گھڑی دیکھی۔ اُسے خیال آیا، اس وقت وہ سو رہی ہو گی۔ وہ فون نیچے رکھنا چاہتا تھا کہ اسی وقت اسے بچی کی آواز سنائی دی۔ وہ آدھی نیند میں تھی؛ کچھ دیر تک اُسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ انڈیا سے بول رہا ہے یا ڈینکفرٹ یا لندن سے۔ وہ اُسے اپنی جگہ بتا ہی رہا تھا کہ تین منٹ ختم ہو گئے، اور اس کے پاس اتنی ریزگاری بھی نہیں تھی کہ لائن کو کٹنے سے بچا سکتا۔ اُسے تسلی صرف اتنی تھی کہ وہ نیند، گھبراہٹ اور نشے کے باوجود یہ بتانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ وہ کل اُن کے شہر پہنچ رہا ہے۔ کل یعنی آج۔

وہ اچھے لگے تھے۔ باہر انگلینڈ کی پیلی اور ملائم دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ گھر کے اندر تھا۔ اُس کے دل میں گرمی کی لہریں اٹھنے لگیں۔ ہوائی اڈوں کی بھاگ دوڑ، ہوٹلوں کی جھیل جھپٹ، ٹیکسیوں کی ہڑبڑاہٹ ـــ وہ ان سب سے دور ہو گیا تھا۔ وہ گھر کے اندر تھا؛ اپنا خود کا گھر نہ سہی، پھر بھی ایک گھر۔ کھڑکیاں، پردے، سوفا، ٹی وی۔ وہ عرصے تک ان چیزوں کے بیچ رہا تھا اور ہر چیز کی تاریخ سے واقف تھا۔ ہر دو تین سال بعد جب وہ آتا تو سوچتا تھا، بچی کتنی بڑی ہو گئی ہو گی۔ اور بیوی؟ وہ کتنی بدل گئی ہو گی! لیکن یہ چیزیں اُس دن سے ایک ہی جگہ ٹھہر گئی تھیں جس دن اس نے گھر چھوڑا تھا۔ گویا وہ اُس کے ساتھ جاتی تھیں اور ساتھ ہی لوٹ آتی تھیں۔

پاپا، تم نے چائے نہیں ڈالی؟" وہ کچن سے دو پلیٹیں لے کر آئی۔ ایک میں ٹوسٹ اور مکھن تھا اور دوسری میں کٹے ہوئے سا بیز۔

"میں تمھارا انتظار کر رہا تھا۔"

"چائے ڈالو نہیں تو بالکل ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

وہ اُس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔ "ٹی وی کھول دوں؟ دیکھو گے؟"

"ابھی نہیں ـــ سنو، تمھیں میرے اسٹیمپس مل گئے تھے؟"

ہاں پاپا، تھینکس!" وہ ٹوسٹوں پر مکھن لگا رہی تھی۔

لیکن تم نے چٹھی ایک بھی نہیں لکھی!"

میں نے ایک لکھی تھی، لیکن جب تمھارا ٹیلیگرام آیا تو میں نے سوچا، اب تم آ رہے ہو تو چٹھی

Scanned with CamScanner

بھیجنے کی کیا ضرورت۔"

"تم بچ بچ کا کاکا ہو!"

لڑکی نے اُس کی طرف دیکھا اور ہنسنے لگی۔ یہ اُس کا چڑ والا نام تھا جو باپ نے برسوں پہلے، اُس وقت رکھا تھا جب وہ اُس کے ساتھ گھر میں رہتا تھا۔ وہ بہت چھوٹی تھی اور اُس نے ہندوستان کا نام بھی نہیں سنا تھا۔

بچی کی ہنسی کا دھاگہ اٹھاتے ہوئے وہ اُس کے قریب کھسک آیا جیسے وہ کوئی شوخ چڑیا ہو جس کو صرف سوت لے کے دھوکے میں پکڑا جا سکتا ہو۔

"ممی کب لوٹیں گی؟"

سوال سن کر اچانک لڑکی کچھ نہیں بول سکی۔ "وہ اوپر اپنے کمرے میں ہیں۔"

"اوپر؟ لیکن تم نے تو کہا تھا۔۔۔"

کرچ، کرچ، کرچ۔ وہ جلے ہوئے ٹوسٹ کو چاقو سے کرید رہی تھی جیسے اس کے ساتھ ساتھ اُس کے سوال کو بھی کھرچ دینا چاہتی ہو۔

ہنسی اب بھی تھی لیکن اب وہ برف میں جمے ہوئے کیڑے کی طرح اُس کے ہونٹوں پر چپکی ہوئی تھی۔

"کیا اُنھیں معلوم ہے کہ میں یہاں ہوں؟"

لڑکی نے ٹوسٹ پر مکھن لگایا، پھر جیم، پھر پلیٹ اُس کے سامنے رکھ دی۔

"ہاں، معلوم ہے۔"

"کیا وہ نیچے آ کر ہمارے ساتھ چائے نہیں پئیں گی؟"

لڑکی دوسری پلیٹ میں سانیج سجانے لگی۔ پھر اُسے کچھ یاد آیا۔ وہ باورچی خانے میں گئی اور اپنے ساتھ مسٹرڈ اور کیچپ کی بوتلیں لے آئی۔

"میں اوپر جا کر پوچھ آتا ہوں۔" اُس نے لڑکی کی طرف دیکھا جیسے اُس سے اپنی کارروائی کی تائید چاہتا ہو۔ جب وہ کچھ نہیں بولی تو وہ زینے کی طرف جانے لگا۔

"ٹھہرو پاپا!"

اُس کے پاؤں ٹھٹھک گئے۔

"آپ پھر اُن سے لڑنا چاہتے ہیں؟" لڑکی نے کچھ غصے سے اُسے دیکھا۔

"لڑنا؟" وہ شرم کے مارے ہونہہ کر ہنسنے لگا۔ "میں یہاں دو ہزار میل چل کر اُن سے لڑنے آیا ہوں؟"

"پھر آپ میرے پاس بیٹھیے۔" لڑکی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ وہ اپنی ماں کی طرف تھی، لیکن باپ کے لیے بھی سنگ دل نہیں تھی۔ وہ اسے پرچھائی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ "میں تمہارے پاس

Scanned with CamScanner

ہوں۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟"

وہ کھانے لگا، ٹوسٹ، ساسیجز، ٹن کے اُبلے ہوئے مٹر۔ اُس کی بھوک اُڑ گئی تھی، لیکن لڑکی کی نگاہیں اُس پر لگی تھیں۔ وہ اُسے دیکھ رہی تھی اور کچھ سوچ رہی تھی۔ کبھی کبھی ٹوسٹ کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈال لیتی اور پھر چائے پینے لگتی۔ پھر اُس کی طرف دیکھتی اور چپ چاپ مسکرانے لگتی۔ اُسے دلاسہ دیتی، سب کچھ ٹھیک ہے، تمہاری ذمے داری مجھ پر ہے اور جب تک میں ہوں ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔

ڈر نہیں تھا۔ ہاں، ٹیبلٹ کا اثر رہا ہوگا یا پھر سفر کی تھکن۔ وہ کچھ دیر کے لیے لڑکی کی نظروں کے سامنے سے ہٹنا چاہتا تھا، اپنے آپ کو دور رکھنا چاہتا تھا۔

"میں ابھی آتا ہوں،" اُس نے کہا۔ لڑکی نے شک بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔ "کیا باتھ روم جاؤ گے؟" وہ اُس کے ساتھ ساتھ غسل خانے تک چلی آئی اور جب اُس نے دروازہ بند کر لیا تو بھی اُسے لگا کہ وہ دروازے کے پیچھے کھڑی ہے۔

اُس نے بیسن میں اپنا منہ ڈال دیا اور نلکا کھول دیا۔ پانی جھر جھر کرتا اُس کے چہرے پر بہنے لگا۔ وہ سسکنے سا لگا، ادھورے سے الفاظ اُس کے کھوکھلے سینے سے باہر نکلنے لگے، جیسے اندر جمی ہوئی کائی باہر نکال رہا ہو۔ اُلٹی، جو سیدھی دل سے باہر آئی ہے۔ وہ ٹیبلٹ جو کچھ دیر پہلے کھائی تھی، اب پیلے چھورے کی طرح بیسن کے سنک ہول پر تیر رہی تھی۔ پھر اُس نے نل بند کر دیا اور رومال نکال کر منہ صاف کیا۔ باتھ روم کی کھونٹی پر عورت کے سیلے کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ پلاسٹک کی ایک چوڑی بالٹی میں انڈرویئر اور برے سیر صابن میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کھڑکی کھلی تھی اور باغ کا پچھواڑا دھوپ میں چمک رہا تھا۔ کہیں کسی دوسرے باغ سے گھاس کٹنے کی دھیمی سی گھرر گھرر کی آواز قریب آ رہی تھی۔

وہ جلدی سے باتھ روم کا دروازہ بند کر کے کمرے میں چلا آیا۔ سارے گھر میں سناٹا تھا۔ وہ کچن میں آیا تو لڑکی دکھائی نہیں دی۔ وہ ڈرائنگ روم میں لوٹا تو وہ بھی خالی پڑا تھا۔ اُسے شک ہوا کہ وہ اوپر والے کمرے میں اپنی ماں کے پاس بیٹھی ہے۔ ایک عجیب سے خوف نے اُسے جکڑ لیا۔ گھر جتنا پُرسکون تھا اُتنا ہی اُسے اندیشے سے بھرا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ کونے میں گیا جہاں اُس کا سوٹ کیس رکھا تھا۔ وہ جلدی جلدی اُسے کھولنے لگا۔ اُس نے اپنے کامرنس کے تولیے اور کاغذات الگ کیے، ان کے نیچے سے وہ سارا سامان نکالنے لگا جو دلی سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ امبرائیڈری کا راجستانی دوپٹا (لڑکی کے لیے)، تانبے اور پیتل کے ٹرنکٹس جو اُس نے فٹ پاتھ پر تبتی لاماؤں سے خریدے تھے، پشمینے کی کشمیری شال (بچی کی ماں کے لیے)، ایک لال کڑھائی زری دار سلیپر جسے بچی اور ماں دونوں پہن سکتے تھے، بھدوہی کے بیڈ کور، ہندوستانی کھلونوں کا البم، اور ایک بہت بڑی باتصویر کتاب "بنارس دی ایٹرنل سٹی"۔ فرش پر ڈھیر سے ڈھیر ایک چھوٹا سا ہندوستان جمع ہو گیا تھا جسے وہ ہر دفعہ یوروپ جاتے وقت اپنے ساتھ اٹھا لاتا تھا۔

اچانک اُس کے ہاتھ ٹھٹک گئے۔ وہ کچھ دیر تک چیزوں کے ڈھیر کو دیکھتا رہا۔ کمرے کے فرش پر پڑی وہ بالکل یتیم اور قابلِ رحم دکھائی دے رہی تھیں۔ اُس کے دل میں پاگلوں جیسی ایک خواہش پیدا

Scanned with CamScanner

ہوئی کہ وہ ان کو کمرے میں جوں کا توں چھوڑ کر جائیں گھر سے۔ کسی کو پتا ہی نہیں چلے گا کہ وہ کہاں چلا گیا۔ لڑکی تھوڑا بہت ضرور حیران ہو گی، لیکن وہ بھی برسوں سے ایسے ہی اچانک اس سے ملتی رہی تھی اور بلا وجہ بچھڑتی بھی رہی تھی۔ "You are a coming and going man" وہ اس سے کہا کرتی تھی۔ پہلے بار اسی سے، اور بعد میں ہنسی مذاق کے طور پر۔ اسے کمرے میں بیٹھا نہ پا کر لڑکی کو زیادہ صدمہ نہیں ہو گا۔ وہ اوپر جائے گی اور وہاں سے کہے گی، اب تم نیچے آ سکتی ہو۔ وہ چلے گئے۔ پھر وہ دونوں ایک ساتھ نیچے آئیں گی اور انھیں سکون ہو گا کہ اب ان دونوں کے علاوہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔

پاپا! وہ چونک گیا جیسے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔ اس نے کھسیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ کمرے کی دہلیز پر کھڑی تھی اور کھلے ہوئے سوٹ کیس کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ کوئی جادو کی پٹاری ہو جس نے اپنے پیٹ سے اچانک رنگ برنگی چیزوں کو الٹ دیا ہو۔ لیکن اس کی آنکھوں میں کوئی خوشی نہیں تھی، ایک شرم سی تھی۔ جب بچے اپنے بڑوں کو کوئی ایسی حرکت کرتے دیکھتے ہیں جس کا راز انھیں پہلے سے معلوم ہوتا ہے تو وہ اسی جھینپ کو چھپانے کے لیے کچھ زیادہ ہی بے تاب ہو جاتے ہیں۔

اتنی چیزیں؟ وہ آدمی کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ کیسے لانے دیں؟ سنا ہے آج کل کسٹم والے بہت تنگ کرتے ہیں۔

نہیں اس دفعہ انھوں نے کچھ نہیں کیا۔ آدمی نے جوش میں آ کر کہا۔ شاید اس لیے کہ میں سیدھا فرینکفرٹ سے آ رہا تھا۔ انھیں صرف ایک چیز پر شک ہوا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے لڑکی کی طرف دیکھا۔

کس چیز پر؟ لڑکی نے اس بار سچ مچ بے چین ہو کر پوچھا۔

اس نے اپنے بیگ سے دال سیو کا ڈبا نکالا اور اسے کھول کر میز پر رکھ دیا۔ لڑکی نے جھجکتے ہوئے دو چار دانے اٹھائے اور انھیں سونگھنے لگی۔ کیا ہے یہ؟ اس نے بڑے تجسس کے ساتھ آدمی کی طرف دیکھا۔

وہ بھی اسی طرح سونگھ رہے تھے۔ وہ ہنسنے لگا۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں اس میں چرس گانجا تو نہیں ہے۔

حشیش؟ لڑکی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ کیا اس میں سچ مچ حشیش ملی ہوئی ہے؟

کھا کر دیکھو۔

لڑکی نے کچھ دال سیو منھ میں ڈالی اور اسے چبانے لگی۔ پھر پریشان ہو کر سی سی کرنے لگی۔

مرچیں ہوں گی۔ تھوک دو! آدمی نے کچھ گھبرا کر کہا۔

لیکن لڑکی نے انھیں نگل لیا تھا اور وہ چھلکتی ہوئی آنکھوں سے باپ کو دیکھنے لگی۔

تم بھی پاگل ہو۔ سب نگل بیٹھیں! آدمی نے جلدی سے اسے پانی کا گلاس دیا جو وہ اس کے لیے

Scanned with CamScanner

لائی تھی۔

"مجھے پسند ہے یہ!" لڑکی نے جلدی سے پانی پیا اور اپنی قمیص کی مڑی ہوئی آستینوں سے آنکھیں پونچھنے لگی۔ پھر مسکراتے ہوئے آدمی کی طرف دیکھا۔ ""I love it"" وہ کئی باتیں صرف اس آدمی کا دل رکھنے کے لیے کرتی تھی؛ ان کے درمیان بہت کم وقفہ ہوتا تو اور وہ اس کے پاس پہنچنے کے لیے یہ شارٹ کٹ لیتی تھی جنھیں پار کرنے میں دوسرے بچوں کو مہینے لگ جاتے ہیں۔

کیا انھوں نے بھی اسے چکھ کر دیکھا تھا؟ لڑکی نے پوچھا۔

نہیں، ان میں اتنی ہمت کہاں تھی۔ انھوں نے صرف میرا سوٹ کیس کھولا، کاغذات کو الٹا پلٹا، اور جب انھیں پتا چلا کہ میں کانفرنس سے آرہا ہوں تو انھوں نے کہا: "Mister, you may go

کیا کہا انھوں نے؟ لڑکی ہنس رہی تھی۔

انھوں نے کہا: "Mister, you may go Like an Indian crow

آدمی نے برا سر ر نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

کیا ہے یہ؟" لڑکی ہنستی رہی۔

جب وہ بہت چھوٹی تھی اور آدمی کے ساتھ پارک میں گھومنے جاتی تھی تو وہ یہ سرپھرا کھیل کھیلتے تھے۔ وہ درخت کی طرف دیکھ کر پوچھتا: ""Oh dear, is there anything to see?"" اور لڑکی چاروں طرف دیکھ کر کہتی: "Yes dear, there is a crow over the tree" آدمی تعجب سے اس کی طرف دیکھتا۔ کیا ہے یہ؟ اور وہ فتح مندانہ جوش سے کہتی: ""A poem!""

""A poem!"" جیسے بڑھتی ہوئی عمر میں چھوٹے ہوئے بچپن کا سایہ سرک آیا ہو۔ پارک کی ہوا، درخت اور ہنسی مذاق۔ وہ باپ کی انگلی پکڑ کر اچانک ایک ایسی جگہ آگئی جسے وہ مدت ہوئی چھوڑ چکی تھی، ہاں کبھی کبھار، رات کو سوتے ہوئے، خوابوں میں ضرور دکھائی دے جاتی تھی۔

میں تمھارے لیے کچھ انڈین سکے لایا ہوں۔ تم نے پچھلی بار کہا تھا۔؟

دکھاؤ کہاں ہیں! لڑکی نے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی شوق دکھاتے ہوئے کہا۔

آدمی نے سنہ ستاروں سے جڑی ہوئی ایک لال تھیلی اٹھائی جیسی بھی لوگ اپنے پاسپورٹ رکھنے کے لیے خریدتے تھے۔ لڑکی نے اُسے اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور ہوا میں جھلانے لگی۔ تھیلی میں رکھی چونیاں اٹھنیاں چھنچھنانے لگیں۔ پھر اس نے تھیلی کا منھ کھولا اور سارے پیسوں کو میز پر بکھیر دیا۔

کیا ہندوستان میں سب لوگوں کے پاس ایسے ہی سکے ہوتے ہیں؟

وہ ہنسنے لگا۔ اور کیا سب کے لیے الگ الگ ہیں گے؟

لیکن غریب؟ اس نے آدمی کو دیکھا۔ "میں نے ایک رات ٹی وی پر انھیں دیکھا تھا---" وہ سکوں کو بھول گئی اور کچھ تعجب سے فرش پر بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھنے لگی۔ اس وقت پہلی بار آدمی کو لگا جیسے وہ لڑکی جو اس کے سامنے بیٹھی ہے کوئی غیر ہے۔ پہچان کا فریم وہی ہے جو اس نے دو سال پہلے دیکھی

Scanned with CamScanner

تھا، لیکن اب اس کی تصویر بدل گئی ہے۔ گھر وہ گھر نہیں تھی، صرف کہیں اور چلی گئی تھی۔ وہاں باپ جو بچے [illegible] ساتھ ہمیشہ نہیں رہتے۔ [illegible] اپنی منزلوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے جو ان کی غیر معمولی [illegible] پر [illegible] رہتی ہیں۔ لڑکی اپنے بچپن کے قصے جانتی ہیں جو گزری جیسے باپ سے مل سکتی تھی، لیکن کسی [illegible] سے چھوڑ کر دوسرے کمروں میں چلی جاتی تھی جن کے بارے میں آدمی کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔

پاپا! [illegible] نے ان کی طرف دیکھا۔ کیا میں ان چیزوں کو سیٹ کر دوں؟

کیوں، اتنی جلدی کیا ہے؟

نہیں جلدی نہیں۔۔۔ لیکن ماما آ کر دیکھیں گی تو۔۔۔ اس کی آواز میں ہلکی سی گھبراہٹ تھی جیسے وہ [illegible] دوبارہ دیکھ رہی ہو۔

آ رہی ہیں وہ؟ آدمی نے کچھ تعجب سے لڑکی کی طرف دیکھا۔

پاپا [illegible]! اس نے باہر [illegible] کی طرف دیکھا۔ وہاں سناٹا تھا۔ جیسے گھر کا جسم دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک حصہ [illegible] دوسرا وہ جس میں وہ دونوں بیٹھے تھے۔ اس وقت اسے یوں لگا جیسے لڑکی [illegible] ہے۔ جیسے جیسے وہ دن کا کھنچتا ہے، ویسے ویسے [illegible] ہے۔ یہیں وہ [illegible] جاگے کو دیکھ سکتا ہے نہ اسے جو وعا کا ملتا ہے۔۔۔

وہ [illegible] لڑکی نے خوف زدہ ہو کر اسے دیکھا۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

وہ [illegible] نہیں آئیں گی؟ اس نے پوچھا۔

نہیں معلوم ہے آپ یہاں ہیں۔ لڑکی نے کچھ خفگی سے کہا۔

کیا وہ نہیں آ رہی ہیں؟

ہاں۔۔۔ اس نے کہا، [illegible] کسی بھی وقت آ سکتی ہیں۔

[illegible] ایک چھوٹی سی بات نہیں سمجھ سکتے۔ آپ بیٹھیے۔ میں ابھی ان سب چیزوں کو سمیٹ دیتی ہوں

وہ [illegible] بیٹھی رہی۔ بڑی صفائی سے ہر چیز کو اٹھا کر کونے میں رکھنے لگی۔ [illegible] کی جوتی، [illegible] کا بیڈ کور۔ اس کی پیٹھ باپ کی طرف تھی لیکن وہ اس کے ہاتھ دیکھ سکتا تھا۔ پتلے [illegible] ہاتھ [illegible] ویسے ہی بے سہارا اور ٹھنڈے جو اس کی لائی ہوئی چیزوں کو [illegible] تھے اس کے دل کے اندر [illegible] سناٹا دیتے تھے۔ وہ ایک ایسی بچی کے ہاتھ تھے [illegible] محدود [illegible] شفقت کو چھو سکتی تھا، [illegible] کے جذبے [illegible] کو نہیں جو باپ کے [illegible] باہر آتے ہیں۔

اچانک لڑکی کے ہاتھ ٹھٹک گئے۔ اسے لگا کوئی دروازے کی گھنٹی بجا رہا ہے، لیکن دوسرے ہی لمحے فون [illegible] مخصوص جگہ رکھا تھا اور [illegible] بند [illegible] بچے کی طرح زور زور سے چیخ رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

لڑکی نے چیزیں ویسے ہی چھوڑ دیں، بھاگتی ہوئی سیڑھیوں کے پاس گئی اور فون اٹھایا۔ ایک لمحے تک کچھ سنائی نہیں دیا، پھر وہ چلائی:

ماما، آپ کا فون!

لڑکی زینے کے بینسٹروں کے ساتھ سہارا لیے کھڑی تھی، ہاتھ میں فون جھلاتی ہوئی۔ اوپر کا دروازہ کھلا اور بند ہونے لگا۔ کوئی نیچے آ رہا تھا۔ پھر ایک سر لڑکی کے چہرے پر جھکا، گندھا ہوا جوڑا، اور فون کے درمیان ایک پورا چہرہ ابھر آیا۔

کس کا ہے؟ عورت نے نیچے لٹکتے ہوئے جوڑے کو پیچھے کی طرف ہٹاتے ہوئے لڑکی کے ہاتھ سے فون کھینچ لیا۔ آدمی کرسی سے اٹھا۔ لڑکی نے اس کی طرف دیکھا۔ ہیلو! عورت نے کہا۔ ہیلو، ہیلو! عورت کی آواز اونچی ہوئی اور تب اسے پتا چلا کہ یہ اس عورت کی آواز ہے جو اس کی بیوی تھی۔ وہ اسے برسوں بعد بھی سیکڑوں آوازوں کی بھیڑ میں پہچان سکتا تھا: اونچی پچ پر ہلکا سا کپکپاتی ہوئی، ہمیشہ کی سست، رکی، پریشان۔ اس کے جسم کی وہ حد جہاں جسم سے پرے آدمی کی روح پر حدوں کی کمر ونچ سی کھینچ جاتی تھی۔ وہ جیسے اٹھا تھا ویسے ہی بیٹھ گیا۔

لڑکی مسکرا رہی تھی۔ وہ بینسٹر کے آئینے میں آدمی کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اور وہ چہرہ کچھ ویسا ہی سے ڈول دکھائی دے رہا تھا جیسے عمر کے آئینے میں عورت کی آواز — شفاف، ٹیڑھی، پچھلی جیب بے اسرار۔ تینوں اس دائرے میں چار کانوں میں بٹ گئے تھے: لڑکی، اس کی ماں، وہ خود اور اس کی بیوی۔ گھر جب زندگی میں بدلتا ہے تو اپنے آپ پھیلتا جاتا ہے...

تم جینی سے بات کرو گی؟ عورت نے لڑکی سے کہا، اور لڑکی جیسے اسی لمحے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اچھل کر اوپر والی سیڑھی پر آئی اور ماں سے ٹیلی فون لے لیا۔ ہیلو جینی، اِٹس می!

وہ دو سیڑھیاں نیچے اتری۔ اب آدمی اسے پورے کا پورا دیکھ سکتا تھا۔

بیٹھو... آدمی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس کی آواز میں ایک ایسی التجا تھی جیسے اسے ڈر ہو کہ کہیں اسے دیکھ کر وہ الٹے پاؤں لوٹ نہ جائے۔

لمحہ بھر وہ تذبذب میں کھڑی رہی۔ اب واپس مڑنا بے معنی تھا۔ لیکن اس طرح اس کے سامنے کھڑے رہنے کی بھی کوئی تک نہیں تھی۔ وہ سٹول کھینچ کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئی۔

کب آئے؟ اس کی آواز کچھ ایسی تھی کہ آدمی کو لگا ٹیلی فون پر کوئی اور عورت بول رہی تھی۔

کافی دیر ہو گئی... مجھے تو پتا ہی نہ تھا کہ تم اوپر کمرے میں ہو۔

عورت چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

آدمی نے جیب سے رومال نکالا، پسینا پونچھا اور مسکرانے کی کوشش میں مسکرانے لگا۔ میں بہت دیر باہر کھڑا رہا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ گھنٹی خراب ہے۔ گیراج خالی پڑا تھا۔ میں نے سوچا تم دونوں کہیں باہر گئے ہو... تمھاری کار؟ اسے معلوم تھا، پھر بھی اس نے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

"ہندوستان کے بے بسی ہے،" عورت نے کہا۔ وہ ہمیشہ سے اس کی چھوٹی، بے کار کی باتوں سے نفرت کرتی آئی تھی، جب کہ آدمی کے لیے یہ باتیں کچھ ایسے تنکوں کا کام دیتی تھیں جن کے سہارے ڈوبنے سے بچا جا سکتا ہو۔ "گھر سے کچھ دیر سے سب۔"

"تمھیں معلوم ہے، نیلیفر میں کب تک تھا؟ میں ویک اینڈ پر آیا تھا، اسی کمٹمنٹ پر یہاں آ گیا۔ کچھ پاؤنڈ زیادہ دینے پڑے۔ میں نے تمھیں وہاں سے فون بھی کیا لیکن تم دونوں کہیں باہر تھے۔۔۔"

"کب؟" عورت نے چلنے سے ہوتی کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ "ہم دونوں گھر میں تھے۔"

"گھنٹی بجتی رہی تھی لیکن کسی نے اٹھایا نہیں۔ ہو سکتا ہے آپریٹر میری انگریزی نہ سمجھ سکی ہو اور غلط نمبر دے دیا ہو۔ لیکن سنو۔۔۔" وہ ہنسنے لگا۔ "ایک عجیب بات ہوئی۔ ہیتھرو ایئرپورٹ پر مجھے ایک عورت ملی جو پیچھے سے بالکل تمھاری طرح دکھائی دے رہی تھی۔ یہ تو اچھا ہوا میں نے اسے بلایا نہیں۔۔۔ ہندوستان سے باہر ہندوستانی عورتیں ایک جیسی ہی دکھائی دیتی ہیں۔۔۔" وہ بولے جا رہا تھا۔ وہ اس آدمی کی طرح تھا جو آنکھوں پر پٹی باندھ کر تنی ہوئی رسی پر چلتا ہے۔ عورت کہیں بہت نیچے تھی، ایک خواب میں، جسے وہ بہت پہلے جانتا تھا لیکن اب اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کے سامنے کیوں بیٹھی ہے۔

وہ چپ ہو گیا۔ اسے دھیان آیا کہ کافی دیر سے وہ صرف اپنی ہی آواز سن رہا ہے۔ اس کے سامنے بیٹھی عورت بالکل چپ تھی۔ وہ اس کی طرف بہت ٹھنڈی اور مایوس نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟" آدمی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"میں نے تم کو منع کیا تھا۔ تم سمجھتے کیوں نہیں؟"

"کاہے کے لیے؟ تم نے کاہے کے لیے منع کیا تھا؟"

"میں تم سے کچھ نہیں چاہتی۔۔۔ تم میرے گھر یہ سب کیوں لاتے ہو؟ کیا فائدہ ہے ان کا؟"

ایک کے بعد وہ نہیں سمجھا کہ کون سی چیزیں۔ پھر اس کی نگاہیں فرش پر پڑیں۔ شاپنگ بیگ کا ڈبہ، نیکٹائی کا ڈبہ، ہوٹل کا ڈبا۔ وہ چیزیں اب بہت لٹی پٹی دکھائی دے رہی تھیں۔ جس حال میں وہ کرسی پر بیٹھا تھا، اسی طرح وہ فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ "کون سی زیادہ ہیں؟" اس نے کھسیاتے ہوئے کہا۔ "انھیں نہ لاتا تو آدھا سوٹ کیس خالی پڑا رہتا۔"

"لیکن میں تم سے کچھ نہیں مانگتی۔۔۔ تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے؟"

عورت کی آواز کانپتی ہوئی ... جس کے پیچھے دب سے گئے جھگڑوں کا درد اور کتنی راتوں کا پانی ... تھا جو ... ٹوٹتے ہی جیسے باہر آنے لگا۔ ایک ایک قدم آگے بڑھتا ہوا۔ اس نے رومال نکالا اور اپنے منہ ... چہرہ پونچھنے لگا۔

"کیا تمھیں معلوم ہے کہ ... کی دیر ... ہے؟"

"ہاں ... اس کا جسم ... وہ ایک عجیب نگاہ کے ساتھ ڈھیلی پڑ گئی۔ "میں تمھیں دیکھنا نہیں چاہتی، بس!"

کیا یہ اتنا آسان ہے؟ وہ کسی ضدی لڑکے کی طرح اسے دیکھنے لگا جو بات سمجھ چکنے کے بعد بھی بہانہ کرتا ہے کہ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

"رکو!" اس نے دھیرے سے کہا۔ "پلیز!"

"مجھے معاف کرو۔۔۔" عورت نے کہا۔

"تم چاہتی کیا ہو؟"

"بیوی الون۔۔۔ اس سے زیادہ میں کچھ اور نہیں چاہتی۔"

"میں بچی سے ملنے بھی نہیں آسکتا؟"

"اس گھر میں نہیں۔ تم اس سے کہیں باہر مل سکتے ہو۔"

"باہر؟" آدمی نے چونک کر سر اٹھایا۔ "باہر کہاں؟"

اسے لگا وہ بھول گیا کہ باہر پوری دنیا پھیلی ہوئی ہے، پارک، سڑکیں، ہوٹل کے کمرے، [illegible] بس ڈپو۔ بچی کہاں کہاں اس کے ساتھ گھسٹے گی!

وہ فون پر ہنس رہی تھی، کچھ کہہ رہی تھی۔ نہیں، میں آج نہیں آسکتی۔ ڈیڈی گھر میں ہیں۔ ہاں، ابھی آئے ہیں۔۔۔ نہیں، مجھے معلوم نہیں۔۔۔ میں نے پوچھا نہیں۔۔۔ کیا نہیں معلوم؟ شاید اس کی سہیلی نے پوچھا تھا کہ وہ کتنے دن رہے گا۔ سامنے بیٹھی عورت بھی شاید یہی جاننا چاہتی تھی: کتنا وقت، کتنی گھڑیاں، کتنی تکلیف سہنی اور اس کے ساتھ گھسٹنی پڑے گی؟

شام کی آخری دھوپ اندر آرہی تھی۔ ٹی وی کا سکرین چمک رہا تھا، لیکن وہ خالی تھا اور اس میں صرف عورت کا سایہ بیٹھا تھا، جیسے خبریں شروع ہونے سے پہلے اناؤنسر کی پرچھائیں دکھائی دیتی ہے، پہلے کمزور اور دھندلی، پھر دھیرے دھیرے برابر ہوتی ہوئی۔ وہ سائیں سائیں کر رہا تھا کہ وہ کچھ کہے، حالانکہ اسے معلوم تھا کہ پچھلے برسوں سے صرف ایک بیزار دل سے ہوم [illegible] پر ایک پرانے درد کا ٹیپ کھولنے لگتی ہے جس کا تعلق اسی دوسری زندگی سے ہے۔ چیزیں اور لوگ کتنے مختلف ہیں۔ برسوں بعد بھی گھر، کتابیں اور کمرے ویسے ہی رہتے ہیں جیسا تم چھوڑ گئے تھے۔ لیکن لوگ؟ وہ اسی دن سے مرنے لگتے ہیں جس دن سے الگ ہو جاتے ہیں۔ مرتے نہیں، بلکہ ایک دوسری زندگی جینے لگتے ہیں جو دھیرے دھیرے اس زندگی کا گلا گھونٹ دیتی ہے جو تم نے ایک ساتھ گزاری تھی۔۔۔

"میں صرف بچی سے نہیں۔۔۔" وہ ہکلانے لگا۔ "میں تم سے بھی ملنے آیا تھا۔"

"مجھ سے؟" عورت کے چہرے پر ہنسی، حقارت، حیرانی ایک ساتھ اُمڈ آئیں۔ "تمہاری جھوٹ کی عادت ابھی تک نہیں گئی؟"

"تم سے جھوٹ بول کر اب مجھے کیا ملے گا؟"

"معلوم نہیں تمہیں کیا ملے گا۔ مجھے جو ملا ہے اسے میں بھگت رہی ہوں۔" اس نے ایک ٹھہری ہوئی ٹھنڈی نظر سے باہر دیکھا۔ "مجھے اگر تمہارے بارے میں پہلے سے کچھ معلوم ہوتا تو میں کچھ کر سکتی

Scanned with CamScanner

تھی

[illegible] آدمی کو پکڑ لیا۔

[illegible] کوئی میری طرف

دیکھتا بھی نہیں۔

دکھو! اُس نے ہاتھ پکڑ لیا۔

مت لو میرا نام ۔۔۔ وہ سب ختم ہو گیا۔

[illegible] امید سے کوئی سروکار نہیں

تھا۔ آنسو جو کسی ایک وجہ سے نہیں بلکہ پورا بند ٹوٹ جانے سے آتے ہیں۔ ایک ڈھلتی ہوئی زندگی میں

[illegible] تھک گئی تھی ۔۔۔

[illegible] سب سے نچلی سیڑھی پر بیٹھی، [illegible]

[illegible] لیکن اُس کے چہرے

[illegible] ہیں جو [illegible] میں مستور رکھوتے ہیں۔ وہ [illegible]

[illegible] کی جانی پہچانی لکیریں [illegible] کے [illegible]

[illegible]

وہ آدمی کی طرف [illegible] کیونکہ جواب اس کے لیے نہیں تھا۔ عورت نے اُسے

[illegible]

[illegible]

[illegible] کا احساس [illegible]

[illegible] اور [illegible] سے الگ بیٹھا

[illegible] معلوم تھا۔ مگر جو آدمی [illegible] سب سے

[illegible] چھوڑ دیا تھا؛ [illegible] کا مطلب

[illegible] چھوڑ دیا تھا، ٹھیک وہیں

[illegible]

[illegible] بیٹھ گئی۔

[illegible] دیکھنے چلو گے؟ اُس نے کہا

[illegible] کو دیکھا۔ وہ کچھ بے تاب اور [illegible] دکھائی دے رہی تھی،

[illegible] اندر کھو جانا ممکن ہو۔

[illegible] پچھلی چیزوں کو اوپر لے جاؤ۔

[illegible]

"بعد میں کب؟" آدمی نے کچھ شک کے ساتھ پوچھا۔

"آپ چلیے تو!" لڑکی نے ٹنگ ٹنگ اسے گھسیٹتے ہوئے کہا

"ان سے کہو اپنا سامان سوٹ کیس میں رکھ دیں۔" عورت کی آواز سنائی دی۔

اسے لگا جیسے کسی نے اچانک پیچھے سے دھکا دیا ہو۔ وہ چونک کر پیچھے مڑا۔ "کیوں؟"

"مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

اس کے اندر شدید تندی اٹھنے لگی۔ "میں نہیں لے جاؤں گا۔ تم چاہو تو، انہیں باہر پھینک سکتی ہو۔"

"باہر؟" عورت کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔ "میں ان کے ساتھ تمہیں بھی باہر پھینک سکتی ہوں۔" رونے کے بعد اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ گالوں کا گیلاپن سوکھ کے کائی سا جم گیا تھا جو پونچھے ہوئے نہیں سوکھے ہوئے آنسوؤں سے ابھر کر آتا ہے۔

"کیا ہم باغ دیکھنے نہیں چلیں گے؟" بچی نے اس کا ہاتھ کھینچا اور وہ اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ گھاس کی کیاریاں اور درخت کسی گونگی فلم کی طرح چل رہے تھے۔ صرف اس کی بیوی کی آواز کرخت کمنٹری کی طرح گونج رہی تھی۔ "باہر، باہر۔"

"آپ ممی کے ساتھ بحث کیوں کرتے ہیں؟" لڑکی نے کہا۔

"میں نے بحث کہاں کی ہے؟" اس نے بچی کو دیکھا، جیسے وہ بھی اس کی دشمن ہو۔

"آپ کرتے ہیں!" لڑکی کا لہجہ عجیب سنجیدہ ہو گیا تھا۔ وہ انگریزی میں "یو" کہتی تھی جس کا مطلب پیار میں "تم" ہوتا تھا اور ناراضگی میں "آپ"۔ انگریزی میں پروردہ بچوں کا یہ دہرا پن ہمیشہ باپ بیٹی کے رشتے کو ہوا میں لٹکائے رکھتا تھا، کبھی بہت قریب کبھی بہت دور، جس کا صحیح اندازہ لڑکی کی ٹون ہی سے کرنا پڑتا تھا۔ ایک عجیب سے ڈر نے آدمی کو پکڑ لیا۔ وہ ایک ہی وقت میں ماں اور بچی دونوں کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔

"بڑا پیارا باغ ہے۔" اس نے اس کو پھسلاتے ہوئے کہا۔ "کیا مالی آتا ہے؟"

"نہیں، مالی نہیں ہے۔" لڑکی نے پرجوش ہو کر کہا۔ "میں شام کو پانی دیتی ہوں اور چھٹی کے دن ممی گھاس کاٹتی ہیں ---- ارے ادھر آؤ! میں تمہیں ایک چیز دکھاتی ہوں۔"

وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ لان بہت چھوٹا تھا ہرا، پیلا، ٹھنڈا۔ پیچھے گراج تھا اور دونوں طرف جھاڑیوں کی فینس لگی ہوئی تھی۔ بیچ میں ایک گھنا بوڑھا ولو کا پیڑ کھڑا تھا۔ لڑکی پیڑ کے پیچھے چھپ گئی، پھر اس کی آواز سنائی دی، "کہاں ہو تم؟"

وہ چپ چاپ دبے پاؤں پیڑ کے پیچھے چلا آیا اور حیران سا کھڑا رہا۔ ولو اور فینس کے بیچ کاٹھ کا لکڑی کا باڑا تھا جس کے دروازے سے ایک خرگوش باہر جھانک رہا تھا۔ دوسرا خرگوش لڑکی کی گود میں تھا۔ وہ اسے یوں سہلا رہی تھی جیسے اسے ڈر ہو کہ کبھی بھی ہاتھ سے چھوٹ کر جھاڑیوں میں گم ہو جائے گا۔

یہ ہم نے ابھی پالے ہیں--- پہلے دو تھے، اب چار۔

باقی کہاں ہیں؟

[illegible] کے اندر۔ وہ ابھی بہت چھوٹے ہیں۔

پہلے اس کا جی چاہا خرگوش کو چھونے کو [illegible] مگر اس کا ہاتھ آپ ہی سے سر پر چلا گیا اور وہ دھیرے دھیرے [illegible] چھوٹے بالوں سے کھیلنے لگا۔ لڑکی چپ کھڑی رہی۔ خرگوش بھی ناک سکیڑے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

پاپا؟ لڑکی نے [illegible] دھیرے دھیرے سے کہا۔ کیا آپ نے [illegible] ریٹرن کا ٹکٹ لیا ہے؟

نہیں۔ کیوں؟

ایسے ہی۔ یہاں واپسی کا ٹکٹ بہت مشکل ملتا ہے۔

[illegible] بیٹھنے کے لیے [illegible] یہاں [illegible] تھا۔ اس نے دھیرے سے [illegible] تو لڑکی نے سر سے [illegible] لیا۔

آپ [illegible] کہاں [illegible] ہیں؟ [illegible] لڑکی [illegible] حد [illegible] سے عاری تھی۔

اگر میں یہاں رہوں تو؟

لڑکی نے دھیرے سے [illegible] دیا اور کمرے سے [illegible] کر دیا۔

میں مذاق کر رہا تھا۔ اس نے ہنس کر کہا۔ میں آخری [illegible] سے لوٹ جاؤں گا۔

لڑکی نے [illegible] طرف دیکھا [illegible] یہاں دو تین اچھے ہوٹل بھی ہیں--- میں ابھی فون کر کے پوچھ سکتی ہوں۔ [illegible] ہوٹل [illegible] جاتے ہیں۔ [illegible] رات کو کہیں نہیں ٹھہرے گا، وہ وہاں سے [illegible] لڑکی [illegible] اس کا ہاتھ پکڑ [illegible] جیسے ابھی کچھ دیر پہلے [illegible] آدمی کا [illegible] میں [illegible] تھی۔

[illegible] میں [illegible] آؤں گی۔ [illegible] جائے۔

[illegible] آدمی نے کچھ نہیں کہا۔ صرف باڑے میں خرگوشوں کی کھڑبڑ سنائی دے رہی تھی۔

پاپا--- تم کچھ بولتے کیوں نہیں؟

تم ہر سال یہی کہتی ہو۔

نہیں سچ--- [illegible] بار میں آؤں گی، ڈونٹ یو بیلیو می؟

[illegible] کہاں رہ گئے

[illegible] جب [illegible] آیا تھا [illegible] کی پتیاں سرسرا رہی تھیں۔ کمروں کے پردے [illegible] تھے [illegible] لڑکی بھاگتی ہوئی اندر [illegible] واش بیسن کا نل کھول کر ہاتھ دھونے لگی [illegible] پیچھے [illegible] سنک کے اوپر آئینے میں اس نے اپنا چہرہ دیکھا--- روکھی گرد [illegible]

موٹی داڑھی اور سُرخ آنکھوں کے بیچ اُس کی طرف حیرت سے دیکھتا ہو۔۔۔ نہیں، تمہارے لیے کوئی امید نہیں۔۔۔

"پاپا، کیا تم اب بھی اپنے آپ سے بولتے ہو؟" لڑکی نے پانی میں بھیگا پاجامہ دکھایا۔ وہ شیشے میں اُسے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں، لیکن اب مجھے کوئی سنتا نہیں۔" اُس نے دھیرے سے بچی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "کیا فریج میں سوڈا ہوگا؟"

"تم اندر چلو، میں ابھی لاتی ہوں۔"

کمرے میں کوئی نہ تھا۔ اُس کی چیزیں بٹور دی گئی تھیں۔ سوٹ کیس کونے میں کھڑا تھا۔ جب وہ باغ میں تھے، اُس کی بیوی نے شاید ان سب چیزوں کو دیکھا ہوگا۔ انہیں چھوا ہوگا۔ وہ اُن سے پہلے کتنی بار ملی ہوں۔ مگر چیزوں کی بات الگ تھی۔ وہ انہیں اوپر نہیں لے گئی تھی، لیکن انہیں دوبارہ سوٹ کیس میں ڈالنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ اس نے انہیں اپنی قسمت پر چھوڑ دیا تھا۔

کچھ دیر بعد جب بچی سوڈا اور گلاس لے کر آئی تو اُسے فوراً پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔۔ پورا اندھیرا نہیں، صرف اتنا جس میں کمرے میں بیٹھا آدمی چیزوں کے بیچ چیز جیسا دکھائی دیتا ہے۔ "پاپا، تم نے بتی نہیں جلائی؟"

"ابھی جلاتا ہوں۔" وہ بٹن اور سوئچ کو ڈھونڈنے لگا۔ بچی نے سوڈا اور گلاس میز پر رکھ دیا اور ٹیبل لیمپ جلا دیا۔

"ممی کہاں ہیں؟"

"وہ نہا رہی ہیں۔ ابھی آتی ہیں۔"

اُس نے بیگ سے وسکی نکالی جو فرینکفرٹ کے ایئرپورٹ پر خریدی تھی۔ گلاس میں ڈالتے ہوئے اُس کے ہاتھ ٹھٹھک گئے۔ "تمہاری جبرائیل کہاں ہے؟"

"میں ابھی اسے بھیجتی ہوں۔" لڑکی نے ہنس کر اُس کی طرف دیکھا۔ "تمہیں برف چاہیے؟"

"نہیں۔ لیکن تم جا کہاں رہی ہو؟"

"باڑے میں کھانا ڈالنے۔ نہیں تو وہ ایک دوسرے کو مار کھائیں گے۔"

وہ باہر گئی تو کھلے دروازے سے باغ کا اندھیرا دکھائی دیا، تاروں کی پیلی تلچھٹ میں جھلملاتا ہوا۔ وہ نہیں تھی۔ باہر کا سناٹا کمرے کی دکھائی نہ دینے والی دیواروں کے اندر سے چھن کر آتا تھا۔ اسے لگا وہ اپنے کمرے میں بیٹھا ہے، اور جو کئی برسوں پہلے ہوتا تھا وہی اب ہو رہا ہے۔ وہ شاور کے نیچے گنگناتی رہتی تھی اور جب باہوں پر تولیہ صافے کی طرح باندھ کر باہر نکلتی تھی تب پانی کی بوندیں باتھ روم سے لے کر اُس کے کمرے تک ایک لکیر بناتی جاتی تھیں۔ پتا نہیں وہ لکیریں بیچ میں کہاں سوکھ گئیں؟ کون سی جگہ، کس [illegible] موڑ پر وہ چیز ہاتھ سے چھوٹ گئی جسے وہ دوبارہ کبھی نہیں پکڑ سکا۔

Scanned with CamScanner

[illegible]

برف بھی رکھی ہے، اُس نے کہا۔

[illegible]

وہ کچھ دیر چپ رہی، پھر دھیرے سے کہا، "اگلے سال وہ چودہ سال کی ہو جائے گی۔ قانون کے مطابق تب وہ کہیں بھی جا سکتی ہے۔"

"میں قانون کی بات نہیں کر رہا۔ تمھارے بغیر وہ کہیں نہیں جائے گی۔"

عورت نے گلاس کی چپکی سطح سے آدمی کو دیکھا۔

"میرے پاس چلے تو اسے کبھی وہاں نہ بھیجوں۔"

"کیوں؟" آدمی نے اُس کی طرف دیکھا۔

وہ دھیرے سے ہنسی۔ "کیا یہ دو مہینے اُس کے لیے کافی نہیں ہیں؟"

وہ بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد کچن کا دروازہ کھلا، لڑکی اندر آئی۔ چپ چاپ دونوں کو دیکھا اور پھر ریک کے پاس جا بیٹھی جہاں ٹیلی فون رکھا تھا۔

"کسے کر رہی ہو؟" عورت نے پوچھا۔

لڑکی چپ رہی۔ فون کا ڈائل گھمانے لگی۔

آدمی نے اس کی طرف دیکھا۔ "تھوڑا سا اور لو گی؟"

"نہیں۔" اُس نے سر ہلایا۔ آدمی دھیرے سے اپنے گلاس میں ڈالنے لگا۔

"کیا بہت پینے لگے ہو؟" عورت نے کہا۔

"نہیں ... " آدمی نے سر ہلا کر کہا۔ "سفر میں کچھ زیادہ ہو جاتی ہے۔"

"میں نے سوچا تھا، اب تک تم نے گھر بسا لیا ہوگا۔"

"کیسے؟" اُس نے عورت کو دیکھا۔ "تمھیں معلوم ہے، میں کہاں رہتا ہوں؟"

عورت کچھ دیر خالی آنکھوں سے اُسے دیکھتی رہی۔ "کیوں، اُس لڑکی کا کیا ہوا؟ وہ تمھارے ساتھ نہیں رہتی؟" عورت کے لہجے میں کوئی تیزی نہیں تھی، نہ غصے کا کوئی سایہ تھا۔ جیسے وہ آدمی مدت بعد کسی بیتے ہوئے قصے کا ذکر کر رہے ہوں جس نے ایک جھٹکے میں دونوں کو الگ الگ کناروں پر پھینک دیا تھا۔

"میں اکیلا رہتا ہوں ــــ ماں کے ساتھ۔" اُس نے کہا۔

عورت نے اُسے تعجب سے دیکھا۔ "کیا بات ہوئی؟"

"کچھ نہیں ... میں شاید ساتھ رہنے کے قابل نہیں ہوں۔" اس کا لہجہ غیر معمولی طور پر دھیما ہو گیا، جیسے وہ اُسے کسی پوشیدہ بیماری کے بارے میں بتا رہا ہو۔ "تم حیران ہو؟ لیکن ایسے لوگ ہوتے ہیں ... " وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا، محبت کے بارے میں، وفاداری کے بارے میں، غصے اور دھوکے کے بارے میں، کوئی بات جو سب سے بچھڑنوں سے الگ رہتا ہے، جو سیکنڈ کے حصے میں بجلی کی طرح کوندتا ہے اور دوسرے ہی لمحے ہمیشہ کے لیے اندھیرے میں غائب ہو جاتا ہے۔

لڑکی شاید اسی لمحے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ ٹیلی فون سے اُٹھ کر آدمی کے پاس آئی۔ ایک بار ماں کو دیکھا، وہ ٹیبل لیمپ کے پیچھے اندھیرے کے آدھے کونے میں چھپ گئی تھی۔ اور آدمی؟ وہ گلاس کے

ف یک ڈنڈا باسا سا دھواں گرد گیا تھا۔

پاپا! لڑکی کے ہاتھ میں کاغذ کا پرزہ تھا۔ یہ ہوٹل کا نام ہے۔ ٹیکسی تمہیں دس منٹ میں پہنچا دے۔

ں نے لڑکی کو پاس کھینچ لیا اور کاغذ جیب میں رکھ لیا۔ کچھ دیر تک دونوں چپ بیٹھے رہے ن پہلے، سو ... نکلنے سے پہلے، گھر کے سب لوگ ایک ساتھ سمٹ کر چپ ہو جاتے تھے۔ باہر ستارے نکل آئے تھے جن میں دھندلا، جھاڑیاں اور گھر کونوں کا بڑا ایک ساکت پیلے منظر میں پاس سرک آئے تھے۔

ں نے اپنا گلاس میز پر رکھا، پھر دھیرے سے لڑکی کو چھوا، اپنا سوٹ کیس اٹھایا، اور جب لڑکی دروازہ کھولا تو وہ لمحہ بھر کو دہلیز پر ٹھٹک گیا۔ میں چلتا ہوں، اُس نے کہا۔ پتا نہیں یہ بات اُس نے سنی تھی، مگر جہاں وہ بیٹھی تھی وہاں سے کوئی آواز نہیں آئی۔ وہاں اتنی ہی گھنی خاموشی تھی جتنی اندھیرے میں، جہاں وہ جا رہا تھا۔

**

# شانی

ہندی سے ترجمہ: دولی رام ویش

## دوزخی

میں دبے پاؤں داخل ہوا۔ باہر کا گیٹ میں نے دھیرے سے کھولا، بیچ کا آنگن پار ہوا۔ کمرے کے سامنے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، ہمیشہ کی طرح۔ میں نے اسے بھی دھیرے سے دھکیلا۔ اصل میں میں جمیل کے سامنے بالکل اچانک آنا چاہتا تھا، دن کے دورے کی طرح۔

یہ بھوپال جیسے شہر کی دوپہری تھی، ڈھلتی ہوئی۔ دن میں سونا اور آلکس تو کب کے ختم ہو چکے تھے۔ میں جانتا تھا کہ یہ جمیل کے گھر پر ملنے کا وقت ہے۔ شہر اور اس کے اپنے وزن کی وجہ سے نہیں، اس کے کام کے اعتبار سے بھی۔ اس کا کلینک صبح شام کھلتا تھا اور ساری دوپہر خالی رہتی تھی۔

جمیل دیوان پر لیٹا ہوا تھا، دیوار کی طرف منہ کیے۔ آہٹ سے چونک کر جب اس نے دیکھا تو ایک آدھ پل بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ حیران۔ پھر اٹھ کر لپکتا ہوا آیا، اور ہم دونوں لپٹ گئے۔ اس کی پکڑ زبردست تھی۔ بانہیں اس کی لمبی اور مضبوط تھیں اور ہتھیلیاں جیسے میری پیٹھ میں دھنس جانا چاہتی تھیں، گوشت پوست کو چھیدتی ہوئی۔ پہلی بار لگا کہ ہاتھ کی انگلیاں بھی بولتی ہیں۔

"کب آیا؟" کئی پل بعد اس نے گردن ہٹا کر پوچھا، ٹک ٹک دیکھتے ہوئے ہی۔ اس کا چہرہ تب بھی میرے اتنے پاس تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ نہیں پا رہے تھے۔

"صبح،" میں نے کہا۔ "دکن ایکسپریس سے۔"

الگ ہوئے۔ بیٹھے۔

میں تب بیتے دنوں کو یاد کر رہا تھا، وہ بولا، اور گاؤ تکیے سے ٹک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ وہ بڑی بھرپور نظر تھی جس میں آپ سمو لینا چاہتے ہیں سب کچھ۔ تبھی بغل والے کمرے کا پردہ ہٹا کر بیوی نسیم آئی،

Scanned with CamScanner

[illegible] ہوئی۔ [illegible] پاس بیٹھی [illegible] پوچھا۔ خوش ہوئی۔

[illegible] کیسی ہیں؟ میں نے [illegible] سے کہا۔ ان سے میرا سلام۔۔۔

[illegible] ہوئی ہوں۔ [illegible] تمہارے لیے [illegible] پوچھتی رہتی ہو۔

[illegible] میں جانتا تھا [illegible] میں کہوں گا۔ وہ [illegible] چلی گئی۔

[illegible] کی طبیعت کیسی ہے؟ میں نے جمیل سے پوچھا۔

[illegible] جمیل [illegible] کا پیکٹ [illegible] ایک [illegible] کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ [illegible] بھائی جان، [illegible] باپ۔ [illegible] شاید [illegible] جب ایک دن بھائی جان اچانک نہیں رہے تھے۔ [illegible] لیکن [illegible]

کون ہے؟ [illegible] سے آواز آئی۔ وہ شاید [illegible] سے اٹھ رہی تھیں۔ [illegible] جمیل۔ جمیل [illegible] دلی سے [illegible]

[illegible] جمیل سے [illegible] کہا [illegible] جانے کے لیے۔

[illegible]

جمیل [illegible]

دلی [illegible] جمیل [illegible]

چلو، میرٹھ کی مار کاٹ کی سنی۔ کیا حال ہیں؟

[illegible] فساد [illegible] میں نے کہا۔ [illegible] کیا [illegible]

تمہیں اخباروں پر بھروسہ ہوتا ہے؟

میں چپ ہو گیا۔

[illegible] پڑھتے ہیں [illegible] اس نے کہا۔

"کہاں سے ہو؟"

"دلی والا۔ کہیں سے؟ کناٹ کا، میرٹھ کا، جمشید پور یا حاجی پور کا؟"

میں کمرے کی دیواروں کو دیکھنے لگا جن میں کسی طرح کی پینٹنگ لگی ہوئی تھیں، کیلنڈر کی بھالی ہوئی۔ ان میں حسینیں ورینہ۔ کا ملا جلا ترو تیج تھا۔ ظاہر ہے کہ میں بچنا چاہتا تھا۔ شاید ہم دونوں بچنا چاہتے تھے، اس بات سے جس کے چھو جانے کا ڈر ہم دونوں ہی کو تھا۔

"تیری پرانی شکل لوٹ آئی ہے،" جمیل نے بات پلٹتے ہوئے کہا۔ "پچھلی بیماری میں جانے وہ کہاں چلی گئی تھی۔"

"یہ ہارٹ اٹیک کی دین ہے،" میں نے کہا اور ساوتی ہنسی ہنسنے لگا جیسے میں کوئی قلعہ جیت لیا ہوں۔

"اب تو تو بالکل ٹھیک ہے نا؟" اس نے پوچھا۔

"بالکل کا تو پتہ نہیں۔ ہاں، ٹھیک ضرور ہوں۔ اتنا ہی ٹھیک جتنا دل کے مریض رہتے ہیں۔"

"اور یہ کیسے کے ساتھ ہی مجھے لاکر مسرے لیے میں خود ہی آگئی ہے۔" میں نے پرانے سب بیماری کے اندر پر لوٹتے ہوئے کہا۔ "اصل میں اب میں نے پرواہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ جب آنا ہے آ جائے گی۔ تب نہ ڈاکٹروں کے چنے رکے گی نہ میرے رکے۔"

"بہت دنوں تک یہاں کسی کو پتا نہیں تھا،" جمیل نے کہا۔ "افواہ کی طرح خبر آئی تھی کچھ اڑی سی۔ ہم لوگوں نے گھر کر ڈی فون کیا تھا، لیکن تمہارے وہاں کے دوستوں نے کہا کہ ویسی کوئی بات نہیں ہے۔ اسپتال میں ضرور ہے، انٹینسو کیئر یونٹ میں بھی ہے، لیکن ہارٹ ورٹ کا معاملہ نہیں ہے۔ وہ تو دلی سے مجھے دیکھ کر لوٹے پنکج نے بتایا کہ سب کچھ کتنا سیریس تھا۔ یہ ہوا کیسے؟"

"اسی طرح جیسے ہوتا ہے۔ اچانک۔"

"گھر پر؟"

"نہیں، دفتر میں۔"

"کیسے؟"

"میں باتیں کر رہا تھا ایک ملنے والے سے۔ یکایک مجھے بے چینی سی ہوئی۔ سینے میں گھٹن اور درد کے بگولے سے اٹھ آئے اور میں پسینے میں شرابور ہو گیا۔ میری آواز بالکل مدھم ہو گئی تھی۔ دل ڈوبنے لگا تھا۔ میں اٹھنا چاہتا تھا مگر مجھ میں دم نہیں تھا۔ میں لیٹے رہنا چاہتا تھا لیکن اس بے چینی اور گھبراہٹ کے... تھوڑی ہی دیر میں میں فرش پر پڑا چھٹپٹا رہا تھا..."

کہتے کہتے میں رک گیا، کیوں کہ جمیل کے چہرے پر ایک رنج میں صاف صاف دیکھ رہا تھا، جو میں چاہتا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میری جس اذیت کو یہاں معمولی ڈھنگ سے لیا گیا تھا، میں اس کا حساب برابر کر رہا ہوں۔ دلی کے اپنے دوستوں کے رویے پر غصہ آ رہا تھا سو الگ۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایک مصلحت کے تحت میری بیماری کی سنجیدگی کو چھپایا گیا تھا، لیکن اس مصلحت نے مجھے اس سب سے یہاں محروم کر دیا

تھا جو نہیں جانتا تھا۔ ٹھیک ٹھیک ایک سال کے بعد میں اس شہر میں واپس آیا تھا، ایک ایسے آدمی کی طرح جو ناکام ہوتے ہوتے یکایک رہ گیا تھا۔

تمہیں یاد ہے میں نے تمہاری دوست کا خط تمہیں کب لکھا تھا؟ وہ سات اپریل کا دن تھا اور کوئی گھنٹا بھر پہلے میں نے تمہیں لکھا تھا۔ تب میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ تھوڑی سی دیر بعد ہی مجھے [illegible] پر پہنچ جانا ہو گا جہاں سے تمہیں کبھی نہیں آیا۔

تبھی اندر سے کنیز نکل آئی اور میرے سامنے کباب، روٹیاں، رکابی رکھتے ہوئے بولی، لو کھاؤ! پھر ایک سٹول کھینچ کر سامنے ہی بیٹھ گئی۔ پہلا ہی لقمہ توڑتے ہوئے مجھے لگا کہ حسین کا نام مجھے نہیں لینا چاہیے تھا۔ شاید میں چاہتا بھی نہیں تھا، بس بات نکل گئی تھی۔ لیکن کیوں نہیں؟ کیا میں اس کے لیے نہیں آیا تھا؟ [illegible] حسین کا! یہ وہ آدمی تھا جو ابھی کل تک اسی شہر میں دوسروں کے بارے کے لیے کیا کرتا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ چپ چاپ بیٹھا جایا کرتا تھا، سونی آنکھوں سے ایک طرف دیکھتا رہتا۔

خبر یہ بھی مجھے دفتر سے ملی تھی، دلی میں۔ جمیل نے نہیں دی تھی۔ اس شہر سے بھی نہیں گئی تھی۔ یہاں پورے سے سینہ کھونے لگا تھا۔

تمہیں یہ جان کر سخت صدمہ ہو گا۔ اس نے خط میں لکھا تھا، کہ ہم دونوں کے عزیز دوست حسین محمد صدیقی کا اچانک یہاں انتقال ہو گیا۔ ان کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔ [illegible] کی میت سے [illegible] آئی تھیں [illegible] کل ہوتا ہوں۔ [illegible] سوچ کر تین چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ رو رہی ایک جوان عورت نے ساتھ [illegible] سے کیا اس کی کوئی کمائی ہو سکتی ہے۔

اتنی دیر تک میں خط پیچھے بیٹھا رہ گیا تھا۔ میں نے اسے کوئی تین بار پڑھا تھا اور حسین کے نام پر [illegible] ڈالی تھی۔ میں یقین کرنا چاہتا تھا لیکن ہو نہیں رہا تھا۔ اور جب ہو تو [illegible] کے مزاروں میں رحمت اور چمکارے کی سانس لی۔ پھر میں نے [illegible] کو دھیرے دھیرے سمیٹ کر ایسے جیسے [illegible] گیا تھا اور ایک دم [illegible] ہو گیا تھا۔

یہ بھی کوئی بات ہوئی! میں اس کے بعد [illegible] کو بتا کر کہہ رہا تھا۔ کیا یہ اس کی جانے کی عمر تھی، اور وہ بھی [illegible] سے دور [illegible] تو مجھ سے بھی دو سال چھوٹا تھا۔ وہ خود سے [illegible] اور پرہیزگار آدمی تھا اور سگریٹ تک نہیں پیتا تھا۔

یہ سب کہتے ہوئے یا تو میں [illegible] تھا یا شاید [illegible] کو دور کر رہا تھا، حالانکہ دفتر سے گھر لوٹنے تک بھی اس سے [illegible] جھوٹ تھا۔ وہ گھر میں [illegible] اندر پہنچ کر بیٹھ گیا تھا کہ اس نے مجھے [illegible] ایک چپ کر دیا۔ [illegible] بھی [illegible] لیکن میں نے اس دن بیوی سے بھی نہیں کہا۔ اس ڈر سے کہ گھر پر بھی دیر تک [illegible] رہے گا اور [illegible] تو حسین کا چہرہ دکھے ہوئے نہیں دے گا۔ اس رات میں ہو تو

Scanned with CamScanner

گیا، یکّہ حسین سے تنگ برابر کیا۔ اس کا چہرہ چاروں طرف سے آ کر مجھ پر حملہ کرتا تھا اور خواہ ساری رات اس کی میّت دکھائی دی، کئی دن پہ تی میّت۔ یہ اُس دن ہی نہیں، اگلے دن بھی ہوا تھا اور اگلے دن بھی، حالاں کہ میں کسی سے کچھ بھی نہیں کہہ رہا تھا۔ تعزیت کا خط بھی تین دن ٹالنے میں سے جمیل کو لکھا تھا، اور میں بھی حسین کی طرح نہیں جانتا تھا کہ پرسے میں کیا کہنا چاہیے۔

بات عجیب سی لیکن سچ یہ ہے کہ حسین میرا دوست نہیں رہ گیا تھا، خاص کر ادھر کے برسوں جب وہ ماہیمبی چلا گیا تھا، یا شاید اس سے بھی پہلے جب میں دھیرے دھیرے اس کے چھوٹے بھائی کا دوست ہو گیا تھا۔

بہت دن برس پہلے جب میں بھوپال آیا تھا تو دوستی اسی سے ہوئی تھی۔ دونوں بھوپال میں باہر سے آئے ہوئے تھے اور وہاں ہمارا کوئی گھر نہیں تھا۔ حسین میں ایک خاص طرح کی مردانہ کشش تھی، سب اپنی طرف کھینچ لینے والی۔ وہ لمبا اور چھریرا تھا اور کھلے کھلے گیا سو رہا تھا۔ پہلے ہی دن میں نے دیکھ لیا تھا ایک مہین حساسیت والا ایسا غصیل اور خود پسند آدمی ہے جو اپنے آپ پر بھی ہنس سکتا ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے اور خوب صورت مبالغے کرتا تھا کہ کوئی بھی ہنستا ہنستا اس کا ہو جاتا تھا۔ تب ہم پرانے بھوپال کی امیر گنج گلی میں رہتے تھے اور جوان تھے۔ حسین ایک پرائیویٹ کالج میں سائنس پڑھاتا تھا اور میں ایک دفتر میں قلم گھسیٹ رہا تھا۔ محلہ پرانے رئیسوں اور امیروں کا تھا اور ہم جیسے پھٹے حال اس کی بانسے ہوئے تھے پیٹ پہ منہ چھپائے ہوئے۔

اصل میں ہم دونوں کی دوستی دو تنگ دست، کم ذہن اور غصیل آدمیوں کا ایسا میل تھا جو دونوں کو راحت دیتا تھا۔ رچا پہلے میں تھا، بعد میں اسے رچا لیا تھا، حالاں کہ ہم دونوں الگ الگ قماش کے تھے۔ وہ سائنس پڑھاتا تھا، دقیانوسی اور مذہبی تھا اور ہنسی ہنسی میں اپنے کو جنتی کہتا تھا۔ میرا سائنس کوئی بیسادت نہیں تھا، لیکن میں اس کی ساری باتوں کو جدید لگتا تھا اور ترقی پسند بنا ہوا تھا۔ حسین کا دعویٰ سراتھے پر لیے ہوئے کہ میں دوزخی ہوں۔ سچائی یہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو دوزخی سمجھتے تھے اور دونوں مل کر کسی تیسرے کو جو ہمارے بیچ نہیں تھا اور جسے ہم کاذو کہتے تھے۔

"تم مکار ہو۔" ایک بار اس نے غصے سے دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا تھا۔ "اول درجے کے پاکھنڈی دوزخی۔"

"کیوں، کیا تم سے بھی بڑا؟"

"ہاں، میں تو تمہارے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہوں۔"

"وہ تو تم ویسے بھی نہیں ہو!" میں نے بس گڑ گڑانا چاہا تھا۔

"تم دونوں جہانوں کے مزے مارنا چاہتے ہو۔" اس نے قریب قریب بال نوچتے ہوئے کہا تھا "دھرم ورم سے کچھ ہو نہیں، سب تمہارا ڈھونگ ہے!"

"تمہارے جنتی ہونے سے بھی بڑا ڈھونگ؟" میں نے حماقت کی تھی۔ "کیوں ناحق فاقے کرتے

Scanned with CamScanner

جو ہر!

میں اکثر کہا کرتا تھا کہ جو سچ مچ روزے دار ہوتے ہیں وہ سحری کے بعد افطار اور افطار کے بعد سحری کی فکر نہیں کیا کرتے۔ جو لوگ رمضان کے دنوں میں صبح شام تھیلی لیے بازار جاتے نظر آتے تھے، کسی طرح تو کبھی تیتر کے لیے، کبھی لوبے تو کبھی بٹیر، کبھی مچھلی تو کبھی بریانی کے لیے، میں ان کا مذاق اڑاتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس سے حسین کو چوٹ لگتی ہے کیوں کہ وہ بھی یہی چاہتا تھا۔

تم نہ سنّیوں میں نہ شیعوں میں، نہ یہاں نہ وہاں۔ اللہ تمہارا بیڑا غرق کرے! وہ مجھ سے کہتا تھا۔

یہ صرف ایک دن کی بات نہیں تھی۔ اکثر ہم دونوں کسی نہ کسی بات پر لڑتے تھے۔ غصے میں ایک دوسرے سے کبھی نہ بولنے کی دھمکی دیتے تھے، لیکن اگلے ہی دن پھر ملتے تھے، پھر سے لڑنے کے لیے۔

یہ وہ دور تھا جب ملک میں فسادوں کی فصل آئی تھی اور ایک کے بعد ایک کئی شہروں میں دنگے ہو رہے تھے۔ جبل پور، الہ آباد، جل گاؤں، احمد آباد، جمشید پور اور۔۔۔

ہم لوگ بھوپال جیسے شہر میں رہ رہے تھے، جس میں فساد کی کوئی تاریخ نہیں تھی، پھر بھی ڈرے ہوئے تھے کیوں کہ شہر میں تناؤ تھا۔ سرکار چوکس ہو گئی تھی۔ جگہ جگہ پولیس اور ہوم گارڈ کے جوان تعینات تھے۔ روز افواہیں اڑتی تھیں اور باہر سے دل دہلا دینے والی خبریں آتی تھیں، نفرت بھری خبریں۔ برسوں سے ساتھ رہتے آئے ہندو مسلمان ایک دوسرے کو شک بھری نظروں سے دیکھنے لگے تھے اور چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ گئے تھے۔

دیکھ لو، ایک ایسی ہی شام اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ "نیتاؤں کے بچوں نے ملک کا بٹوارا کر کے کیا کر دیا ہے!"

اس نے صبح سے اخبار میں کچھ اور دل دہلانے والی خبریں پڑھ لی تھیں۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور بال روکھے تھے، بکھرے بکھرے سے۔ وہ اور دنوں سے زیادہ کھنچا کھنچا رہا تھا۔

اب یہ ملک رہنے لائق نہیں رہا! وہ بولا۔ کسی دن ہم لوگوں کو کاٹ کر پھینک دیا جائے گا اور کوئی رونے والا نہیں ہوگا۔

کیوں، میں جو ہوں! میں نے ہنس کر کہا۔ دراصل میں اسے اور اس کے ڈر کو ہنسی میں اڑا دینا چاہتا تھا، اندھیرے میں گانا گانے والے بچے کی طرح۔

تم بھی نہیں ہو گے، اس نے کچھ تیز لہجے میں تلخی سے جواب دیا۔ کل جب گاؤں کا جتھا گنڈاسے اور تبر لے کر تمہارے دروازے پر آئے گا، تب کوئی نہیں پوچھے گا کہ تم کیا سوچتے ہو یا تمہارے خیالات کیا ہیں! بچنے کے لیے تمہارا نام کافی ہے۔

تم تو کہہ رہے تھے کہ بچنے کے لیے صرف نام کافی نہیں ہوتا؟

وہ اور بات تھی۔ دوسرے سلسلے میں کہی گئی تھی۔ مسئلوں کو گڈمڈ مت کیا کرو۔ میں جانتا ہوں تم

چالاکی کر رہے ہو۔"

ہاں، میں چالاکی کر رہا تھا، ہاں جان بوجھ کر، جہاں بنے رہنے کی چالاکی، سچائی سے ڈر کر جائے کھڑے ہونے کی چالاکی۔ میں حسین سے بالکل متفق نہیں ہونا چاہتا تھا، کیوں کہ اس کی بات ماننا اپنے پاؤں کے نیچے سے اُس ٹیلے کو کاٹنا تھا جس پر میں کھڑا تھا۔

اس بیچ ایک ایسی بات ہوئی جس کے بارے میں میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ حسین یکایک میرے لیے نایاب ہو گیا تھا۔ صبح اُس کا کالج ہوا کرتا تھا، دوپہر میں میرا دفتر۔ ایک شام ہی کا وقت تھا جس میں ہم اکثر ملا کرتے تھے، لیکن ادھر وہ ان شاموں سے غائب تھا۔ میرے لیے حسین کا گھر اجنبی نہیں تھا۔ جمیل بھی میرے لیے نیا نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ حسین کا چھوٹا بھائی ہے اور اُسی کالج میں پڑھتا ہے۔ جب جب میں حسین کے یہاں گپ شپ، چائے یا کھانے پر ہوتا، اکثر جمیل بھی ہوا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اُس کے باپ (بھائی جان) بھی۔ وہ اس لحاظ سے عجیب گھر تھا کہ یہاں پہنچ کر کسی بھی دوست یا مہمان سے پورا گھر ملتا تھا اور سبھی لوگ بات چیت میں شریک ہوتے تھے۔ مجھے بھائی جان کا بیچ میں ہونا کئی بار کھلتا تھا، کیوں کہ اس سے ہماری آزادی چھنتی تھی، لیکن جمیل کا ہونا مجھے بھی اچھا لگتا تھا۔ دراصل میں جمیل کو شروع سے پسند کرتا تھا۔

اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ جمیل کا پہلے مجھ سے ٹکرانا یا حسین کے وسیلے سے ملنا محض ایک اتفاق تھا، ورنہ شاید میں سیدھے اُسی کا دوست ہوتا۔ یہ بات تب بھی لگی تھی جب میں حسین کا اتا پتا کرنے کئی بار اُس کے گھر گیا تھا اور وہ مجھے نہیں ملا تھا۔ پھر میں دھیرے دھیرے حسین سے کٹ گیا تھا

"حسین بھائی سے آج کل شام کو ملنا مشکل ہے۔" میری دو تین بار کی مایوسی کے بعد جمیل نے بتایا تھا۔ "دراصل یہ اور سید محمود کسی چکر میں ہیں۔"

"کس چکر میں؟"

"تعجب ہے کہ آپ کو پتا نہیں! کیا آپ نہیں جانتے کہ دونوں باہر نکلنے کی جگاڑ میں ہیں؟"

"باہر یعنی؟"

"باہر یعنی کہیں بھی۔ مڈل ایسٹ، لیبیا، افریقا، وہاں جہاں جاب ملے، اچھے پیسے ملیں۔ سید محمود کی تو مجبوری ہے، ایسے کالج کی ماسٹری میں وہ ویسے ہی کنگال ہے۔ چار چار بیٹیاں سر پر، تنگی میں وہ بیٹا پولیو کا شکار ہے۔ حسین بھائی کا یہ ہے کہ وہ بہتر زندگی چاہتے ہیں۔"

سید محمود تب بھوپال میں تھا اور اُسی کالج میں پروفیسر تھا۔ وہ ہم تینوں کا دوست تھا، لیکن کسی کے ہاتھ نہیں آتا تھا کیوں کہ وہ ہر وقت جلدی میں ہوتا تھا، ایک ایسی بے چینی بھری جلدی میں ہوتا کہ کہیں دو پل سے زیادہ ٹکنے نہیں دیتی تھی۔ وہ آتا تو بیٹھتا نہیں تھا، بیٹھتا تو پر تولنے لگتا تھا، در حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے آتے ہی یہ دھڑکا لگ جاتا تھا کہ وہ کسی بھی پل چلا جائے گا۔ حسین کی اس سے دوستی ایک حد تک چھنے

Scanned with CamScanner

کی وجہ سے تھی لیکن عمر اور صحت کے لحاظ سے وہ مجھ سے زیادہ نزدیک پڑتا تھا۔ پھر بھی مجھے تعجب نہیں ہوا، کیوں کہ دونوں ایک ہی مقصد کے لیے گئے تھے، جیسے ہی کال [illegible] ہوں۔

کیوں، جاگ رہے ہو؟ [illegible] دنوں کے بعد جب حسین پکڑا ہی آیا تو میں نے اسے دھیرے سے پوچھا۔ حسین نے مجھے ایسی انداز سے دیکھا جس میں اس کی چھوٹی موٹی آنکھیں کیوں ہو کر پھیلی ہو جاتی تھیں اور مغرور لگتی تھیں۔

کون جاگ رہا ہے؟

تم، اور کون!

میں جاگ نہیں رہا، جا رہا ہوں۔'

ایک ہی بات ہے۔

ایک ہی بات نہیں ہے [illegible] نے زور دے کر کہا۔ [illegible] جانے والے پاکستان میں ہیں اور وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔"

تم کون لوٹ کر آنے والے ہو!

کیوں، کیا میں کالے مشینوں سے بچ کے جا رہا ہوں؟

کیا پتا؟

"تم جیسے دوست تو یہی دعا کریں گے۔ کرو!"

میدان تو چھوڑ ہی رہے ہو۔"

دو چار سال سے یہ کہہ [illegible] تھا یہ اس چھوڑنا ہے؟ [illegible] نے [illegible] کہا۔ میں [illegible] اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں کچھ نہ سوچوں؟ یہیں پڑا سڑتا رہوں؟ اپنے آس پاس [illegible] معاشوں کو [illegible] دیکھتا رہوں؟ [illegible]؟ [illegible] جلاؤں؟

"بچے تو میرے بھی ہیں،" میں نے کہا۔

[illegible] تو تم اوپر اٹھ سکتے ہو نہ اٹھنا چاہتے ہو۔

پیسوں کے پیچھے بھاگنا اوپر اٹھنا ہے؟

[illegible] بیماروں، [illegible] کی [illegible] ہے [illegible] اسے تم اپنے ہی پاس رہنے دو۔"

اور وہ تیزی سے چلا گیا۔

پاکستان جانے سے پہلے حسین سے یہ میری آخری بات چیت تھی، کم سے کم اس سلسلے میں۔ اس کے بعد [illegible]، لیکن ہر ملاقات [illegible] تھی اور ہماری باتوں کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ ویسے بھی

Scanned with CamScanner

تب تک ہم ایک دوسرے سے کٹ چکے تھے۔ پھر ایک دن سنا کہ وہ چلا گیا، مجھ سے ملے بنا اور مجھے کہیں تنہائی میں رہتی کرتا ہوا۔ گیا سعد محمود بھی، لیکن اس کا جانا ایک سیدھی سادی عملی چھلانگ تھی۔ وہ بیوی کے سب کچھ، زیور اور سوروپئی۔ بیچ کر سعودی عرب گیا تھا، شکر حسین کو وہیں جا کے کسی سکول میں باقاعدہ کام ملا تھا اور اس کے لیے ہوائی جہاز کا ٹکٹ آیا تھا۔

اور کچھ دوں؟ نسیم مجھ سے کہہ رہی تھی، میرے سامنے کھڑی اور رکابی کی طرف بڑھتی ہوئی۔ میں جیسے چونکا۔

اور کیا؟

کباب یا ایک آدھ روٹی؟

بس بس، میں نے کہا۔ یوں ہی بہت ہو گیا۔ قاعدے سے مجھے کچھ نہیں کھانا چاہیے تھا دوپہر کا کھانا۔ اکثر میں ٹالنے کی کوشش کرتا ہوں، خاص کر باہر۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اسے معمول بنا لو۔

اور تم نے مان لیا؟ جمیل نے مسکرا کر ٹوکا، اور میں ہنسنے لگا۔ جمیل جانتا تھا کہ دلی نے پچھلے تین چار برسوں میں میرے ناشتوں کے پیچھے کتنی ادویات لگا دی ہیں۔ ابھی دلی میں پاؤں جمے بھی نہیں تھے کہ معلوم ہوا میں ایک مہلک بیماری کی چپیٹ میں ہوں۔ کیا کرتا؟ وقت یا اس کے خلاف اپنے رشتے والوں نے میری کوئی مدد نہیں کی اور میں ہسپتال پہنچ کر ایک وارڈ میں داخل ہو گیا تھا۔ کیبن نمبر ای ۵۳۵۔

وہ دوزخ کے دن تھے۔

رکابی ہٹا کر نسیم وہیں نہیں، کھڑی رہی۔ پھر دو پل مجھے گھور کر پوچھا، ابھی پچھلے دنوں تمہارا کیا ہارٹ اٹیک کا کچھ۔۔۔

میں نے چونک کر دیکھا۔ ہاں، چوٹ لگی تھی۔ کیا نسیم کو خبر نہیں تھی؟ میں تو سمجھا تھا کہ اس کو میں بھی سب سے پہلے نیم، تم کا ماحول بنا ہوگا اور جب پہنچوں گا تو مجھے ایسے بیچارے کا سا ٹک ٹک گھوریں گے آدمی چوہا بن کر رہ گیا ہو۔

اس کی بری حالت ہو گئی تھی۔ جمیل نسیم سے کہنے لگا۔ میرا ہارٹ اٹیک تھا۔ کوئی پچاس گھنٹے زندگی اور موت کے بیچ جھولتا رہا، وہ تو دل جیسی جگہ تھی جس نے سنبھالا کر چلا لیا، ورنہ خدا جانے کیا ہوتا!

نسیم کا چہرہ ایک پل کے لیے سفید ہو گیا، خوف سے۔ اس کے ہونٹ ہلکے سے کانپے تھے۔ مسکرا سی، اور اب بیٹھو جی۔ بیٹھو، یعنی تسلیم ہو گئی۔ جانے سے پہلے وہ سمٹتے ہوئے بولی:

اور سگریٹ پینا پھر مت چھوڑنا، اچھا!

تھوڑی دیر بعد میں نے تپائی کے سامنے چائے کی ٹرے رکھ دی۔ سٹول کھینچ کر نسیم ہمارے سامنے بیٹھ گئی اور چائے بنانے لگی۔ ادھر کے کمروں میں بتیاں جل اٹھی تھیں، لیکن ان کے اندر ہونے کا احساس یہاں سے مشکل تھا۔ پہلے تو شاید وہ نماز پڑھ رہی تھیں، لیکن تھوڑی دیر میں تو وہ باہر آ گئی تھیں اور صحن میں کسی سمت تکتی رہیں، ابھی کرسیوں سے الگ ہو۔ میں پھر دیواروں کو دیکھنے لگا جن پر نسیم کی پینٹنگز لٹکی ہوئی تھیں،

Scanned with CamScanner

[illegible]

دیکھتے دیکھتے کہیں سے چھپنی ہوئی اور وہ ایسٹ تھے۔ بس، منزل سے دو منٹ کے ہوں گے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ان کا کہیں دل وہیں سوچ رہا ہوگا۔ کہ لوگ، وہ دھواں کہ بہت کی ہو چکے تھے۔ کوئی دس بارہ دن بعد جب حامد کی ڈوریوں کو جیسے ہمیشہ بسی تو مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ ہمیشہ یا ہے حسین میاں کا وقت لے کر آئی ہیں۔ پھر سب کے رحم کھٹے، پھر ایک بار سے سر سے ہے، تم ہو۔۔۔

اور نصیب کی سنگ دلی تو دیکھو۔ تھوڑی دیر بعد کر جمیل شہ... تب ہوا تھا جب وہ لوٹنے ہی کو تھے۔ ابھی چھ مہینے پہلے جب وہ یہاں آئے تھے تو کہنے لگے، بس کچھ دنوں کی بات رہ گئی ہے، اس کانٹریکٹ کے ختم ہونے کے بعد میں ہندوستان لوٹ آؤں گا۔ کہنے لگے، اب تو وہاں نہیں رہا جاتا۔ کچھ بھی کہو، اپنا ملک اپنا ملک ہے۔۔۔ انھوں نے یہاں شہر میں اپنی پسند کا شاندار مکان بنوا لیا تھا۔ لوٹنے کے بعد وہ یہاں کیا کریں گے، یہ طے ہو چکا تھا۔ اور وہ بہت خوش تھے۔ تب انھوں نے کبھی نہیں سوچا ہوگا کہ اس گھر کی ایک ایک اینٹ انھوں نے اتنے پیار سے رکھی تھی اس میں وہ کبھی نہیں رہ پائیں گے۔۔۔ پچھلی بار ایک عجیب بات ہوئی تھی۔ جب میں انھیں ایئرپورٹ چھوڑنے گیا تھا تو زندگی میں پہلی بار ایک عجیب سی بات ہوئی تھی۔ پتا نہیں کیوں جی میں آیا تھا کہ انھیں بہت زور سے بھینچ لوں، ایک دم گلے سے لگا کر۔ میں یہ لگا رہا کوئی جذباتیت ہوگی۔ حسین بھائی کو ہمیشہ سے سنتے آئے ہیں! اور اپنے کوروں کر تیں سے وہ ہوش ہمیشہ کے لیے کھو دیں۔ اب وہی تکلیف آتی تھی سنگ دلی ہے کہ ہر وقت مجھے تنگ کرتی رہتی ہے۔ کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ ہم اکثر کسی زندگی بھی سمجھ پاتے ہیں یا کبھی نامعلوم کی مدد کے تحت بے موقعوں کو کہہ دیتے۔ سنتے ہیں زبان میں اکثر وہ آدمی جو پاتا ہے ہم انھیں آگے کے لیے ملتوی کر دیتے ہیں، یہ جانتے ہوئے کہ وہ ہماری زندگی میں پھر کبھی نہیں آئیں گے۔۔۔

نسیم نے پان کی طشتری میری طرف بڑھا دی۔ وہ کب پان لے کر آ بیٹھی تھی، مجھے پتا نہیں تھا۔ میں نے چپ چاپ پان لے لیا۔

میں جانتا تھا کہ جمیل نے مجھے کہیں اندر سے چھو لیا ہے۔ لیکن یہ وہ صرف چہرہ تھا، جو کی گرفت میں لے کر نچوڑ رہا نہیں؟ میں سامنے کی دیوار کی طرف دیکھنے لگا جس پر طغرے میں لکھا تھا: اللہ، اللہ، اللہ۔ دیکھتے ہوئے۔

پھر تصویریں آئیں حسین کی۔ حسین بھائی چھٹے باغ میں تینوں چھوٹے بچوں کے ساتھ۔ حسین بھائی نئی گاڑی میں۔ سٹیرنگ کے سامنے ہنستا ہوا کار کا دروازہ پکڑے کھڑی ہیں۔ میں نے وہ تصویر اٹھا لی جو دھندلی سی تھی شاید یہیں کی۔ اس میں صرف حسین تھا، صرف اس کا ہنستا ہوا چہرہ۔ تصویر میں وہ بہت تیزی سے بڑھاتا ہوا لگا اور یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس کے چہرے پر تھکاوٹ کی کوئی چھاپ نہیں تھی۔ لگتے وہ کسی پیڑ کی طرح ہو گئے تھے۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ لمبے ہو گئے تھے اور ان کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔

"یہ تو یہیں کی لگتی ہے،" میں نے کہا۔

Scanned with CamScanner

[illegible]

اس قدر جہالت کیوں بڑھی ہوئی ہے؟

[illegible]

Scanned with CamScanner

# اصغر وجاہت

ہندی سے ترجمہ: عبدالعظیم سوہرو

## کیک

انھوں نے میز پر ایک زوردار گھونسا مارا اور میز بہت دیر تک ہلتی رہی۔

میں کہتا ہوں کہ جب تک ریٹ سے تمام پانچ سو لوگوں کو گولی سے نہیں اڑا دیا جائے گا، حالات ٹھیک نہیں ہو سکتے! اپنی خاصی سپیکنگ پاور برباد کر کے وہ ہانپنے لگے۔ پھر انھوں نے اپنا اوپری ہونٹ نچلے ہونٹ سے دبا کر مجھے گھورنا شروع کیا۔ وہ یقیناً سمجھ گئے تھے کہ میں مسکرا رہا ہوں۔ پھر انھوں نے گھورنا بند کر دیا اور اپنی پلیٹ پر پل پڑے۔

پوری رات کو سیاست پر بات ہوتی ہے۔ دن کے دو بجے سے رات کے آٹھ بجے تک پروف ریڈنگ کا گھٹیا کام کرتے کرتے وہ کافی کھسیا ٹھتے ہیں۔

میں نے کہا، ان پانچ سو لوگوں میں آپ اپنے کو کسی جوڑ رہے ہیں؟

"اپنے کو کیوں جوڑوں؟ کیا میں کروک پولیٹیشن ہوں، یا اسمگلر ہوں، یا کروڑوں کی چور بازاری کرتا ہوں؟ وہ پھر مجھے گھورنے لگے تو میں ہنس دیا۔ وہ اپنی پلیٹ کی طرف دیکھنے لگے۔

آپ لوگ تو کسی بھی چیز کو سیریسلی نہیں لیتے ہیں۔

کھانا ختم ہونے کے بعد انھوں نے جوٹھی پلیٹیں اٹھائیں اور کچن میں چلے گئے۔ کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے مسٹر ڈی سوزا نے کہا، ڈیوڈ، میرے لیے پانی لیتے آنا۔

ڈیوڈ جگ بھر کر پانی لے آئے۔ مسٹر ڈی سوزا کو ایک گلاس دینے کے بعد بولے، پی لیجیے مسٹر، پی لیجیے!"

میرے انکار کرنے پر طنز کے طریقے سے بولے، تھینکس ٹو گاڈ! یہاں دن بھر پانی تو مل جاتا

Scanned with CamScanner

[illegible] آپ [illegible] ہوں۔ [illegible]
[illegible] پانی پی گئے۔

[illegible]

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

[illegible] وہ [illegible] بڑبڑاتے رہتے ہیں۔

میں جاسوسی [illegible] ناولوں کی [illegible] پوچھتا ہوں

[illegible] روپے کے لیے [illegible] کرتے ہیں۔ میں مسکرا کر [illegible]
[illegible] پوچھتا ہوں [illegible] وہ چپ ہو [illegible] ہیں۔ [illegible] ہو جاتے ہیں۔

میں [illegible] پڑھتے اور جاسوسی ناول لکھتے رہیں گے؟ سوچو تو [illegible] کتنی اچھی طرح سے زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ کتنا آرام [illegible]

"دیکھو ہے، کتنی بیوٹی ہے۔۔۔۔"

'پریشانی تو میرے لیے ہے ڈیوڈ صاحب۔ آپ تو بہت سے کام کر سکتے ہیں۔ مرغی خانہ کھول سکتے ہیں، بیکری لگا سکتے ہیں۔۔۔'

وہ آنکھیں بند کر کے بے یقینی کی ہنسی ہنسنے لگتے ہیں اور کمرے کی ہر ٹھوس چیز سے ٹکرا کر ان کی ہنسی ان کے منھ میں واپس چلی جاتی ہے۔

اکثر کھانے کے بعد وہ ایسی ہی باتیں چھیڑ دیتے ہیں۔ کام میں جی نہیں لگتا اور وقت بوجھ لگنے لگتا ہے۔ جی میں آتا ہے کہ لوہے کی ایک بڑی سی راڈ لے کر کسی فیشن ایبل علاقے میں نکل جاؤں۔ ڈیوڈ صاحب تو ساتھ چلنے پر تیار ہو ہی جائیں گے۔ پھر وہ بولنے لگتے ہیں۔ اور ان کے پیارے الفاظ "بچ، کوک، بال شٹ، شٹنگ، پیزنٹ ٹرائل، ڈسپوزیشن"، "کلاس اسٹرگل" وغیرہ بار بار سنائی پڑتے ہیں۔ بیچ بیچ میں وہ ہندوستانی گالیاں فراٹے سے بولتے ہیں۔

'اب کیا ہو سکتا ہے؟ پچیس سال تک پروف ریڈری کے بعد اب اور کیا کر سکتا ہوں؟ سن ۱۹۴۸ میں دلی آیا تھا۔ ارے صاحب، ڈیفنس کالونی کی زمین تین روپے گز میرے سامنے بکی ہے جس کا دام آج چار سو روپے ہے۔ نظام الدین سے اوکھلا تک جنگل تھا جنگل۔ کوئی شریف آدمی رہنے پر تیار ہی نہیں ہوتا تھا۔ اگر اس وقت نظام الدین میں زمین خرید لی ہوتی تو آج لکھ پتی ہوتا۔ لیکن اس وقت اتنا پیسا نہیں تھا، اور آج۔۔۔ سیسیر کیمبرج میں میرے ساتھ پڑھتا تھا۔ اب اگر آپ آج اسے دیکھ لیں تو مان ہی نہیں سکتے کہ میں اس کا کلاس فیلو اور دوست تھا۔ گورا چٹا رنگ، اے کلاس صحت، ایک جیپ، مسیڈیز اور ٹریکٹر ہے اس کے پاس۔ مرزا پور کے پاس فارمنگ کرتا ہے۔ اس زمانے میں دس روپے بیگھا زمین خریدی تھی اس نے۔ مجھ سے بہت کہا تھا کہ تم بھی لے لو ڈیوڈ، صرف پانچ سو بیگھے۔ بالکل اسی کے فارم کے سامنے پانچ سو بیگھے کا پلاٹ تھا۔ اے کلاس فرٹائل زمین! لیکن ان زمانے میں میں کچھ اور تھا۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنسے۔ آج اس کی آمدنی تین لاکھ روپے سال ہے۔ ایک ڈیری، اپنا مرغی خانہ۔ ٹھاٹھ ہے صاحب ٹھاٹھ۔ ڈیوڈ صاحب خوش ہو گئے جیسے وہ سب انھیں کا ہو۔ پروف کے پلندے کو اٹھا کر ایک کونے میں رکھتے ہوئے بولے۔ 'میری تو قسمت میں اس شاندار کمرے میں مسز ڈی سوزا کا کرایہ دار ہونا لکھا تھا۔"

مسز ڈی سوزا کو چالیس روپے دو، کمرہ مل جائے گا۔ پچیس روپے اور دو تو صبح کا ناشتا مل جائے گا، اور تیس روپے دو رات کا کھانا، جسے مسز ڈی سوزا انگریزی کھانا کہتی ہیں، مل جائے گا۔ مسز ڈی سوزا کے کمرے میں لگی تصویروں کو، جو اکثر ان کے جوانی کے دنوں کی ہیں، کرایہ دار ہٹا نہیں سکتا۔ کسی تصویر میں وہ موم بتی کے سامنے جھکی کتاب پڑھ رہی ہیں تو کسی میں اپنے بال گود میں رکھے خلا میں دیکھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ تصویروں میں سے کچھ لوگوں کا تعارف انگریزی افسر کے طور پر کراتی ہیں، پر دیکھنے میں وہ سب ہندوستانی لگتے ہیں۔ ایک تصویر مسز ڈی سوزا کی لڑکی کی بھی ہے جو ڈیوڈ صاحب کی پر

رکھی [illegible] ہے۔ [illegible] میں [illegible] ہے۔ [illegible] کے [illegible] سے یہ پکی ہے کہ [illegible] [illegible] ہاتھوں [illegible] تصویر [illegible] دیکھ کر ڈیوڈ صاحب نے [illegible] کی سلامتی [illegible] ہیں۔ [illegible] کی [illegible] [illegible] اُن کے [illegible] کا اعلان کر دیا اور ان کے ساتھ پراٹھے چلنے لگیں۔

صبح [illegible] جلدی جلدی [illegible] کی چائے کے کچھ [illegible]۔ رات کے [illegible] کرتے رہنے کے لیے آنکھوں کی [illegible] کرکٹ [illegible] آئے ہوئے۔ [illegible] کرکٹ [illegible] صاحب کا [illegible] دیکھا [illegible] پروف [illegible] کرکٹ [illegible] ہیں

[illegible] جلدی جلدی بس اسٹاپ کی طرف دوڑتا جیسے بس کو پکڑنا ہو۔ [illegible] دونوں ایک [illegible] ڈیوڈ صاحب [illegible] ایک ہی باتیں کرتے ہیں، مرغی [illegible] کھاتے رہیں تو [illegible] سال کی عمر [illegible] مرغی اور بھینس کے گوشت کا [illegible] بھی طرح معلوم ہے۔ [illegible] کے بارے میں ان کی معلومات محدود ہیں۔ [illegible] کتنا [illegible] ہونا چاہیے، کتنے [illegible] میں [illegible] کو [illegible] جائے، دودھ [illegible] پھینٹا جائے۔ [illegible] کے بارے میں [illegible] ہیں۔ [illegible] کو [illegible] کے پاس سیکڑوں [illegible] ہوتے ہیں جن کو [illegible] میں [illegible] نہیں جاتا۔ [illegible] کہتے ہیں، [illegible] دھوتی باندھنے والے، [illegible] کیا [illegible] مرغی کے لی، [illegible] میں [illegible] کے، بس اٹھا یا [illegible] کھا [illegible] مسلمان جاتے ہیں [illegible] گوشت [illegible] مسلمانوں کے پاس بھینسے کا گوشت [illegible] عقل موٹی کرنے [illegible] ہے۔ بھینسے کا گوشت کھاؤ بھینسے کی طرح عقل موٹی ہو جائے گی، اور پھر بھینسے ہی کی طرح [illegible] بھینسے کی طرح چل پڑو!

[illegible] آئے۔

[illegible] ہونی چاہیے۔

میں نے [illegible] تو کوئی اُلّو کا پٹھا ہی انکار کر سکتا ہے۔

[illegible] چلتے چلتے اچانک رک گئے۔ ایک [illegible] ہوئے مکان کو دیکھ کر بولے۔

Scanned with CamScanner

یہی جینیک اور کیلیبر کا معلوم ہوتا ہے! پھر انھوں نے مڑ کر جیب سے چشمہ نکالا، آنکھوں پر لگا کر [illegible] مکان کا نقشہ دیکھا۔ [illegible] دو [illegible] کے ساتھ اور سارا مکان [illegible] کر لیں۔

میں ایک گلاس دودھ، چار توسٹ اور مکھن، جام اور دو انڈے! انھوں نے ایک لمبی سانس کھینچی، جیسے غبارے میں سے ہوا نکل گئی ہو۔

نہیں، میں آپ سے ایگری نہیں کرتا۔ فروٹ جوس بہت ضروری ہے۔ ہاں۔

فروٹ جوس؟ وہ بولے۔ نہیں، اگر دودھ ہو تو اس کی ضرورت نہیں ہے۔

پراٹھے اور انڈے کا ناشتا کیسا رہے گا؟

[illegible] لنچ پر [illegible] ہوں۔

اور اگر ناشتے پر کیک ہو؟

وہ سپاٹ اور پھیکی ہنسی ہنسے۔

کئی سال ہوئے، میرے دلی آنے سے کچھ پہلے، ڈیوڈ صاحب نے پہلی بار تھوڑے پر کیک بنایا تھا۔ پہلے پورا بجٹ تیار کر لیا گیا تھا۔ سب خرچ جوڑ کر کل [illegible] روپے ہوتے تھے۔ پہلی تاریخ کو ڈیوڈ صاحب میدہ، شکر اور میوہ [illegible] لے آئے تھے۔ سارا سامان گھر میں پہلے سے تولا گیا تھا۔ پھر پیچھے بیکر کا پتا لگایا گیا تھا۔ ڈیوڈ صاحب نے اپنے دوستوں سے [illegible] کے ایک بیکر کی تعریف سنی [illegible] ایک دن اس سے بات کرنے گئے، بالکل اسی طرح جیسے دو ملکوں کے وزیر اعظم [illegible] مسائل پر بات کرتے ہیں۔ ڈیوڈ صاحب نے اس کے سامنے ایک [illegible] رکھ دیا کہ وہ لاجواب ہو گیا۔ اگر تم نے سارا سامان کیک میں [illegible] اور کچھ بچا لیا تو مجھے کیسے پتا چلے گا؟ اس مسئلے کا حل بھی انھوں نے خود ڈھونڈ لیا۔ کوئی ایسا آدمی ملے جو بیکر کے پاس اس وقت تک بیٹھا رہے جب تک کیک بن کر تیار ہو جائے۔ مسٹر ڈی سوزا نے اس کام کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا، مگر اصل میں ڈیوڈ صاحب کو مسٹر ڈی سوزا پر بھی اعتبار نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے بیکر اور مسٹر ڈی سوزا مل کر ڈیوڈ صاحب کو چوٹ دے دیں۔ جب پوری دلی میں معتبر آدمی نہیں ملا تو ڈیوڈ صاحب نے ایک دن کی چھٹی لی۔ میں نے اس کام میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی تھی لیکن [illegible] وہ دن مجھ سے ناراض رہے اور میری پیٹھ پیچھے انھوں نے مسٹر ڈی سوزا سے کہا کہ [illegible] کیک کیا ہوتا ہے! میں جانتا تھا کہ کیک بن جانے کے بعد [illegible] رات کو [illegible] کھوئے [illegible] ڈیوڈ صاحب کو خوش کیا جا سکتا ہے یا ان کے [illegible] کے بارے میں بات کر کے [illegible] خوش ہو جاتے ہیں [illegible] کام زیور کے پاس [illegible] اور وہ [illegible] کیسے رہتا ہے۔

کیک تھوڑے سے ایک دن پہلے گیا تھا۔ اب اسے رکھنے کا مسئلہ تھا۔ مسٹر ڈی سوزا کے گھر میں چوہے ضرورت سے زیادہ ہیں۔ [illegible] وقت میں نے ان کی مدد کی۔ اپنے ٹین کے بکس میں سے کپڑے نکال [illegible] تولیے میں [illegible] اور بکس میں کیک رکھ دیا۔ [illegible] ایک

[illegible]

سنائی دیتی۔ مسز ڈی سوزا آن کے زمانے کا متوقع پہلے زمانے سے ادا کرتی تھیں۔ انہیں پچیس سال تک کی چیزوں کے دام یاد ہیں۔ اس کے بعد سے مکان کا کرایہ ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ جس کا سیدھا مطلب ہم لوگوں پر رعب ڈالنا ہوتا ہے۔ ویسے رعب ڈالنے والے [illegible] میں دونوں کمرے [illegible] پر اٹھا دینے کے بعد وہ خود بھی تنہا ہو گئی ہیں۔ [illegible] ڈیوڈ صاحب ہوتے تو [illegible]۔ وہ مسز ڈی سوزا [illegible] رکھتی ہو [illegible] ڈی سوزا [illegible] کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

زیادہ نہیں، صرف دو سو روپے سے کام شروع کرنا ہوگی۔ [illegible] کام [illegible] ہو سکتا ہے۔ [illegible] کا مطلب ہے کہ سو روپے [illegible] ایک مہینے میں [illegible]۔ ویسے [illegible] ایک سال میں چھتیس [illegible] روپے۔ میں تو [illegible] میں [illegible] کی ضرورت [illegible] کا [illegible] کہتا ہوں۔ [illegible] ایک [illegible] کی [illegible] مکان کی [illegible] ہے۔ تب یہ مکان آپ چھوڑ دیجیے گا [illegible]۔ [illegible] کوئی آدمیوں [illegible] سے [illegible] سستا [illegible] کوٹھی [illegible] گا۔ ایک کا [illegible] لے لیجیے گا۔

تب تھوڑی دیر کے لیے وہ دونوں [illegible]۔ [illegible] کوٹھی کے پھاٹک سے [illegible] طرف [illegible] پر [illegible] ڈیوڈ اور مسز ڈی سوزا [illegible] چھوٹا سا ہوٹل۔

میں لوٹ کر آیا تو ڈیوڈ صاحب آ چکے تھے۔ [illegible] میں [illegible] پلنگ پر بیٹھے [illegible] تھوک میں گالیاں دے رہے تھے۔ مسز ڈی سوزا [illegible] کی کوشش کر رہی تھیں۔ ڈیوڈ صاحب [illegible] رہے تھے۔ [illegible] کا [illegible] کیا ہے۔ [illegible] کی آنکھوں میں [illegible] کاٹ تھی۔ چشمہ [illegible] کیا تھا۔ [illegible] چشمہ [illegible]۔ میں نے [illegible] سامنے ایک [illegible] کی ڈال پر [illegible] دیکھا۔ [illegible] کچھ ہی لمحوں بعد ڈیوڈ صاحب کو ایک [illegible] بیٹا۔ [illegible] طرف [illegible] کی ہوئی ہیں [illegible] کے اندر دو [illegible] کے ساتھ ڈیوڈ صاحب [illegible] ہیں [illegible] رہے ہیں۔ [illegible] ایک [illegible] پر بیٹھے ہیں۔ [illegible] کی [illegible] دکھائی پڑ رہا ہے۔

میں نے کہا، آپ کیوں پریشان ہیں ڈیوڈ صاحب؟ چھوڑیے سالی نوکری کو۔ ایک [illegible] کھول لیجیے۔ [illegible] سستا [illegible] مکان۔

[illegible] میں سستا [illegible] ساتھ [illegible] ہو سکتے۔ وہیں تو [illegible] کا مکان [illegible] ہے۔ [illegible] صاحب، یہ تو [illegible] ہے۔ [illegible] بغیر [illegible] کوئی آدمی کی طرح [illegible] سکتا۔ [illegible] رکھنے کے لیے آپ کو [illegible] کرنی پڑے گی، لوگوں کو [illegible] کرنا پڑے گا---

Scanned with CamScanner

[illegible] اور دو گھنٹے [illegible]
[illegible]---

[illegible] بہت کمال کیے ہو! مسز ڈی سوزا بولیں۔

[illegible]

[illegible] کہیں پروف کا کام زیادہ تو نہیں ملا؟

[illegible] شاید آپ [illegible] بات چلیں [illegible] الجھن [illegible]

[illegible] کہ میں اس دن کا ویلکم کروں گا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] ایک وِش ہے! مسز ڈی سوزا نے احسان لادا۔

[illegible] کیا ہوئے تو کیا کہنا!

[illegible] ڈیوڈ صاحب [illegible] ایک روپیہ [illegible] ڈیوڈ [illegible] ڈیوڈ [illegible]

کار ڈرائیور سماعیل خاں کو پسینہ چھوٹ آیا تھا۔ ۱۹۳۰ ماڈل کی فورڈ کار ان سیدھی چڑھائی کے چڑھنے سے انکار کر چکا تھا۔ ڈیوڈ صاحب نے اس کو ڈانٹ کر گاڑی سے اتار دیا تھا۔ سب لڑکے اور لڑکیاں اتر گئے تھے۔ انگریز لڑکوں کی ہمت چھوٹ گئی تھی۔ لیکن جولی نے اترنے سے انکار کر دیا تھا۔ ڈیوڈ بابا نے گاڑی اسٹارٹ کی، دو منٹ سوچا، گیئر بدل کر ایکسلریٹر پر دباؤ ڈالا اور گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ اوپر چڑھ گئی۔ سماعیل خاں نے اوپر آ کر ڈیوڈ بابا کے ہاتھ چوم لیے تھے۔ وہ بڑے بڑے انگریز افسروں کو گاڑی چلاتے دیکھ چکا تھا، مگر ڈیوڈ بابا نے کمال ہی کر دیا۔ جولی نے ڈیوڈ بابا کو اسی دن کس دینے کا وعدہ کیا تھا۔

ان سب باتوں کو سوچتے وقت ڈیوڈ صاحب کی بڑی عجیب حالت ہوتی ہے۔ وہ ڈیوڈ صاحب نہیں دیپک بن جاتے ہیں۔ سڑک کی دھول اڑتی ہے اور سیتاپور کی سول لائنز پر بنی بڑی سی کوٹھی کے پھاٹک میں ایک ۱۹۳۰ کی فورڈ داخل ہوتی ہے۔ پھاٹک کے ایک کھمبے پر صاف حرفوں میں لکھا ہوا ہے: مسٹر ڈیوڈ، ڈپٹی کلکٹر۔ کوٹھی کی چھت کھپریلوں سے بنی ہوئی ہے۔ کوٹھی کے چاروں طرف کئی بیگھے کا کمپاؤنڈ ہے۔ پیچھے آم اور سنترے کا باغ ہے۔ داہنی طرف ٹینس کورٹ، اور بائیں طرف بڑا سا کچن گارڈن۔ کوٹھی کے اونچے برآمدے میں باوردی چپراسی اونگھتا ہوا دکھائی پڑے گا۔ اندر ہال میں دو صوفے اور چھت پر لٹکتا ہوا ڈوری سے کھینچنے والا پنکھا۔ دوپہر میں پنکھا قلی پنکھا کھینچتے کھینچتے اونگھ جاتا ہے تو مسٹر ڈیوڈ ڈپٹی کلکٹر اپنے ولایتی جوتوں کی ٹھوکروں سے اس کے کالے بدن پر نیلے رنگ کے پھول کاڑھتے ہیں۔ رات کو ٹائی باندھ کر کھانے کی میز پر بیٹھ کر چکن سوپ پیتے ہیں، کھانا کھانے کے بعد آتش دان کے سامنے بیٹھتے ہیں، اور مسز ڈیوڈ کو گڈ نائٹ کہہ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ ساڑھے نو بجے کے آس پاس ۱۹۳۰ کی فورڈ پھر اسٹارٹ ہوتی ہے۔ اب وہ یا تو کلب چلی جاتی ہے یا کسی دیسی رئیس کی کوٹھی کے اندر گھس کر آدھی رات کو جھومتی ہوئی لوٹتی ہے۔

مسز ڈیوڈ ہوا کے ہال کی چھت کے اوپر سے دلی کی روشنیاں دکھائی پڑتی ہیں۔ سیکڑوں جنگلی جانوروں کی آنکھیں رات میں چمک رہی ہیں۔ پانی پینے کے لیے جب آتا ہوں تو ڈیوڈ صاحب پروف پڑھ رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر مسکراتے ہیں، قلم بند کر دیتے ہیں اور بیٹھنے کو کہتے ہیں۔ آنکھوں میں درد ہوتی ہے۔ وہ مجھے دھیرے دھیرے سمجھاتے ہیں۔ ان کے اس سمجھانے سے میں تنگ آ گیا ہوں۔ شروع شروع میں تو میں ان کو دو کا پاگل سمجھتا تھا، لیکن بعد میں پتا نہیں کیوں ان کی باتیں میرے اوپر اثر کرنے لگیں۔ سوال یہ اس شہر کا ہے، جتنی جلدی ہو سکے بھاگ جاؤ! میں بھی تمھاری طرح گاؤں سے نکل کر سیدھا اس شہر میں آیا تھا۔ ان دنوں جیتے۔ بس دیکھ رہے ہو کچھ نہیں ہے اس شہر میں، کچھ نہیں۔ میری بات چھوڑ دو۔ میں کہاں چلا جاؤں؟ کہاں کے راستے یہ شہر میرے اندر گھس چکا ہے۔

تو کیا اب تک کچھ نہیں ہو گا ڈیوڈ صاحب؟

اس وقت تک جب تک تمھارے پاس دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اور میں جانتا ہوں تمھارے

پاس وہ سب کچھ نہیں ہے جو لوگوں کو دیا جا سکتا ہے۔

میں لوٹ کر اوپر آ جاتا ہوں۔ میرے پاس کیا ہے دینے کے لیے؟ اونچی کرسیاں، کاک ٹیل پارٹیاں، لمبے چوڑے لان، انگریزی میں امتحان، سوٹ اور ٹائیاں، لڑکیاں، موٹریں، شاپنگ۔ تب یہ لوگ خوش نما گلیاروں میں مجھ سے وعدے کرتے ہیں، مسکراتے ہیں، کون ہیں؟ ان کے بارے میں پھر سوچنا پڑے گا اور کافی دیر تک میں پھر سوچنے کی سمت جھٹکتا رہتا ہوں۔ لیکن وہ چپکے مٹا جاتا ہے۔ میں اس کی باہیں پکڑ کر آگے گھسیٹتا ہوں۔ کسی کھڑے ہوئے تیز کی طرح وہ بھی رک رک کر باہر نکلتا ہے۔

میں پھر پانی کے لیے نیچے اترتا ہوں۔ ابا میز پر سر رکھے وہ سو رہے ہیں۔ پروف کا پلندہ سامنے پڑا ہے۔ میں ان کا کندھا پکڑ کر جگا دیتا ہوں۔ اب سو جائیے۔ کل آپ کو سائٹ دیکھنے جانا ہے۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ آتی ہے۔ وہ کل [illegible] کھولنے کی سائٹ دیکھنے جا رہے ہیں۔ اس سے پہلے بھی ہم لوگ کئی سائٹس دیکھ چکے ہیں۔ ڈیڈی صاحب اٹھ کر پانی پیتے ہیں، پھر اپنے پلنگ پر اس طرح گر پڑتے ہیں جیسے رات دعا کی کے پیروں پر پڑے ہوں۔

میں پھر اوپر آ کر لیٹ جاتا ہوں۔ میں نے کالج میں اتنا پڑھا ہی کیوں؟ اتنا اور اتنی کی بات نہیں ہے۔ مجھے کالج میں پڑھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اور اب دو سال تک ڈھائی سو روپے کی نوکری کرتے ہوئے کیا کیا جا سکتا ہے؟ کیوں مسکراتا رہا اور کیوں شانت رہا؟ دو سال سے دوپہر کا کھانا گول کرتے رہنے کے پیچھے کیا تھا؟ نیچے سے میس کے کور کرنے کی آواز آتی ہے۔ ایک جانی پہچانی بو پھیل جاتی ہے۔ اس بو مانوس قصبے کی بو سے میں ایسا کچھ سمجھتا ہوں۔ حساب مجھے بہت سی کم ہو گئی ہیں۔ اس چھوٹے سے سٹیشن پر اگر میں اتروں تو گاڑی چلی جانے کے بعد کئی لوگ مجھے گھور کر دیکھیں گے اور گاؤں کے والے بھی مجھ سے بات کرتے ڈریں گے۔ ان کا ڈر دور کرنے کے لیے مجھے اپنا تعارف کرانا پڑے گا۔ [illegible] باپ کا تعارف کرانا پڑے گا۔ تب ان کے چہرے پر مسکراہٹ آئے گی اور وہ مجھے اپنے یہاں بیٹھنے کے لیے کھینچ لیں گے۔ دس منٹ اگر چلتا رہے گا تو ساری [illegible] ختم ہو جائے گی۔ ان پر کھیت ہیں، جس کا سیدھا مطلب ہے، ان پار غریبی ہے۔ وہ غریبی کے عادی ہیں۔ پولیس ان کے لیے قادر مطلق ہے اور اپنی ہوشیاری میں وہ کافی [illegible] ہیں۔ [illegible] آسمان میں [illegible] ہوئی ہوا کی صاف آواز سنائی دیتی ہے۔ نیچے سڑک پر [illegible] ہیں۔ بڑی موٹی بالو کے اوپر مزدور سو رہے ہیں جو کبھی کہیں کی جانے کا خواب دیکھ بیٹھے ہیں، نئے گاؤں کی بات کرتے ہیں، پیچھے کھیتوں کی بات کرتے ہیں جو کبھی ان کے تھے [illegible] کالونی اور آخر میں [illegible] ہوٹل [illegible] سامنے [illegible] ہوتا ہے اور ریستوران کی [illegible] میں مسلسل [illegible] فٹ پاتھ پر بہت سے [illegible] کالے اور سوکھے آدمی سوتے ہوئے [illegible] آواز [illegible] اوپر [illegible] کی روشنی میں ان کے جسم [illegible] دکھائی پڑتے ہیں۔ میں اکثر حیران رہتا ہوں کہ وہ اس چھوٹے فٹ پاتھ پر

Scanned with CamScanner

چھت کیوں نہیں ڈال دیتے۔ اس کے چاروں طرف پکی سی سی، دیوار تو اٹھائی جا سکتی ہے۔ ان سب باتوں پر سرسری نگاہ ڈالی جائے، جیسا کہ ہماری عادت ہے، تو ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بے وقوفی اور جذباتیت سے بھری باتیں۔ لیکن اگر کوئی اوپر سے کیڑے کی طرح فٹ پاتھ پر ٹپک پڑے تو اس کی سمجھ میں سب کچھ آ جائے گا۔

دن اس طرح گزرتے ہیں جیسے کوئی لنگڑا آدمی چلتا ہے۔ اور جب اس مہانگری میں اپنے بہت عام اور بے سہارا ہونے کا احساس سب کچھ گرا دیتا ہے اور بے معنی، جو اس مہانگر میں لوگ تقریباً کر دیتے ہیں، اب اتنی بری نہیں لگتی جتنی پہلے لگتی تھی۔ آفس میں اہلکاروں کی میز پر تیوری کا سورج کی طرح گڑا ہوا جو ایک ہی وقت میں پکا سماج وادی (سوشلسٹ) بھی ہے اور پروہت بھی۔ اس کی تنگ بشرٹ میں سے جھانکتا ہوا حرام کی کمائی پر پلا تندرست جسم اور اس کی سماج وادی پنسل جو ہر دوسری سطر صرف اس لیے کاٹ دیتی ہے کہ وہ دوسرے کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کا رعب داب، گمبھیر ہنسی، چالاک مسکراہٹ، اور اس کی میز کے سامنے اس کے سامراج میں بیٹھے ہوئے چار کمزور جاندار جو قلم گھسنے کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ ان لوگوں کے چہروں میں تاپ اور ہونٹوں کی تھرتھراہٹ۔ ان سب چیزوں کو مٹھی میں دبا کر کرش کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ بھوک بھی کم بخت لگتی ہے تو اس طرح جیسے سارے شہر کا کھانا کھا کر ہی ختم ہو گی۔ شروع میں پیٹ گڑگڑاتا ہے۔ گر ڈیوڈ صاحب ہوتے تو بات ہنسی سے جھٹک دیتے۔ جی نہیں، بھوک جب زور سے لگتی ہے تو یہ لگتا ہے جیسے آنتیں لڑ رہی ہوں۔ پھر پیٹ میں ہلکا سا درد شروع ہوتا ہے جو پہلے چل بیٹھا لگتا ہے۔ پھر درد تیز ہو جاتا ہے۔ اس وقت اگر آپ تین چار گلاس پانی پی لیں تو پیٹ کچھ دیر کے لیے شانت ہو جائے گا اور آپ دو ایک گھنٹا کوئی بھی کام کر سکتے ہیں۔

اتنا سب کچھ کہنے کے بعد وہ ضرور صلاح دیں گے کہ اس مہانگری میں بھوکوں مرنے سے اچھا ہے کہ میں لوٹ جاؤں۔ اور یہاں سے نکل کر وہاں جانے کا مطلب ہے ایک غریبی اور بھک مری سے نکل کر دوسری بھک مری میں پھنس جانا۔ اسی طرح کی بہت ساری باتیں ایک ساتھ دماغ میں کبڈی کھیلتی رہتی ہیں۔ تنگ آ کر ایسے موقعے پر ڈیوڈ صاحب سے پوچھتا ہوں، "گریٹر کیلاش کی مارکیٹ چل رہے ہیں؟"

وہ مسکراتے ہیں اور کہتے ہیں، "اچھا، تیار ہو جاؤں۔" میں جانتا ہوں ان کے تیار ہونے میں کافی وقت لگے گا، اس لیے میں پرانے سے جوتے پر پالش کرتا ہوں۔ ایک میلا کپڑا لے کر جوتے کی گھسائی کرتا ہوں۔ جوتے میں اپنی شکل دیکھ سکتا ہوں۔ ٹپ ٹاپ ہو کر ڈیوڈ صاحب سے پوچھتا ہوں، "تیار ہیں؟"

ہم دونوں بس سٹاپ کی طرف جاتے ہوئے ایک دوسرے کے جوتوں کو دیکھ کر امنگ بڑھاتے۔ ایک عجیب طرح کی ہمت آ جاتی ہے۔

گریٹر کیلاش کی مارکیٹ کی ہر دکان کا نام ہمیں زبانی یاد ہے۔ بس سے اتر کر ہم دونوں پیشاب خانے میں جا کر اپنے بال ٹھیک کرتے ہیں۔ وہ میری طرف دیکھتے ہیں۔ دو جوڑی چمچماتے جوتے برآمدے میں گھومتے ہیں۔ میں ڈنیر کی دکان کے سامنے رک جاتا ہوں۔ تھوڑی دیر تک دیکھتا رہتا ہوں۔

Scanned with CamScanner

ڈیوڈ صاحب مد بیٹے سے مل گئے ہیں، اور میں ساری ہمت جمع کر کے اندر گھس جاتا ہوں۔ یہاں کے لوگ رستے صورت ہیں۔ سب مصلے ہیں دوبار سر ہوتے ہیں۔ [illegible] ہو کے دکان سے اندر نکلتے ہیں۔ ڈیوڈ صاحب یہاں کھانے کی [illegible] دیتے ہیں، [illegible] اور [illegible] ان چہروں کو [illegible] دیکھتے ہیں جیسے وہ کافی کھنچ [illegible]۔ میں بیٹے ہوئے [illegible] سے متاثر ہو [illegible] کی کوشش کرتا ہوں۔

[illegible] کی دکان سے [illegible] رکھتے ہیں [illegible] سے کچھ ہو گیا ہے۔ یہیں بار میں کہاں وقت سے [illegible] سامان اکھاڑ دی ہے، مٹی کا۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

صدی پیچھے۔ سالا دیکھو [illegible] مسکرا رہا ہے۔

[illegible]؟ ڈیوڈ صاحب پوچھتے ہیں۔ میں آنکھ سے وہاں سے [illegible] کرتا ہوں۔ وہ ایک دم وہاں سے اندر گھس جاتے ہیں۔ میں کچھ [illegible] رہتا ہوں [illegible] جاتا ہوں۔ کپڑے کے جیسا [illegible] صاحب کی [illegible] سے پھرتے ہیں۔ ان کی جیب سے دس پیسے کا [illegible] کا ٹکٹ اور کل [illegible] پیسے نکلتے ہیں۔ [illegible] رہے ہیں۔ ڈیوڈ صاحب سے بیگمات جو [illegible] رکھتے ہیں پڑا اور جاتے۔ میں ہمت کر کے وہاں سے اندر ہوتا ہوں۔ ڈیوڈ صاحب دکان [illegible] کھڑے ہوں رہے ہیں اور وہ بے چارہ [illegible] رہا ہے۔ میں خوش ہو رہا ہوں۔ لو سالے، [illegible] ڈیوڈ صاحب کے ڈنڈا! بہت مسکرا رہے تھے! ڈیوڈ صاحب [illegible] ہیں [illegible] ہیں جس کا [illegible] باپ دادا [illegible] کبھی [illegible] ہوگا۔

[illegible] ڈیوڈ صاحب نے میرے لیے [illegible] کر دی۔

[illegible] کھانے کی [illegible] یہاں سے وہاں تک والے کی کھانے کے ہوتے ہیں۔ مسز ڈی سوزا کا موڈ کچھ [illegible] ہے۔ [illegible] کے [illegible] پیچھے [illegible] نہیں [illegible] پاتا ہوں۔ ایک آدھ [illegible] ہے۔ [illegible] کے [illegible] نہیں لی۔ [illegible] نہیں [illegible] تک آ جاتی ہے۔

بات [illegible] کچھ [illegible] تھی اور جب [illegible] نہیں [illegible] تھی، تو مسز ڈی سوزا نے پوچھا،

آج تم ڈیفنس کالونی جانے والے تھے؟

نہیں جا سکا، ڈیوڈ صاحب نے منہ بنا کر کہا۔

[illegible] کیسے [illegible] گا؟ مسز ڈی سوزا بڑبڑا رہی ہیں۔ [illegible] تمہاری [illegible] کیتھی نے کتنی محنت سے بھیجا ہے۔

محنت سے [illegible] آئی؟ ڈیوڈ صاحب چونکے۔ [illegible] اس کا [illegible] دو [illegible] روپے کما تا ہے۔ [illegible] ایک [illegible] سو روپے کی ایک [illegible] اور دو قمیصیں خریدی ہوں گی۔ اور ڈیڑھ سو کے [illegible] بھجوا دیں۔ اس میں محنت کہاں سے آ گئی؟

"مگر تم انھیں جا کر لے تو آؤ۔"

"ڈینو اس سامان کو یہاں لا سکتا ہے۔"

ڈینو کا ڈیفنس کالونی میں بڑا مکان ہے۔ کار ہے۔ ڈیوڈ صاحب کا بچپن کا دوست ہے۔ وہ اس شکار پارٹی میں بھی تھا جس میں ہاتھی پر بیٹھ کر ڈیوڈ صاحب نے فلائنگ شاٹ میں چار فائر کرائی تھیں۔

"ڈیفنس کالونی سے یہاں آنا دور پڑے گا۔ ورنہ وہ بڑی آدمی ہے۔"

"میں بڑی پروف ریڈر نہیں ہوں؟ وہ بھی۔ وہ تو اپنی کار سے آ سکتا ہے، جبکہ مجھے دو بسیں بدلنی پڑیں گی۔" وہ دال چاول اس طرح کھا رہے تھے جیسے کیک کی یاد میں نشت زنی کر رہے ہوں۔

"جیسی تمھاری مرضی۔"

کھانا ختم ہونے پر کچھ دیر کے لیے محفل جم گئی۔ مسز ڈی سوزا پتا نہیں کہاں سے اس بڑے زمین دار کا ذکر لے بیٹھیں جو جوانی کے دنوں میں ان پر دل و جان سے عاشق تھا اور ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ایک دن پتا لگاتا ہوا دلی میں ان کے گھر آیا تھا۔ وہ بھلا دن تھا جب اس گھر کے سامنے سیکنڈ ہینڈ امپیلا کھڑی ہوئی تھی اور ڈیوڈ صاحب کو کچن میں سونا پڑا تھا۔ اس بڑے زمین دار کا ذکر ڈیوڈ صاحب کو بہت بھاتا ہے۔ میں تو فوراً اس زمین دار کی جگہ اپنے آپ کو فٹ کر کے موقعے کا پورا مزہ لینے لگتا ہوں۔

کچھ دیر بعد اِدھر اُدھر گھوم گھام کر بات پھر کھانوں پر آ گئی۔ ڈیوڈ صاحب سویاں پکانے کی ترکیب بتانے لگے۔ پھر سب نے اپنے اپنے پسندیدہ کھانوں کے بارے میں بات کی۔ سب سے پہلے ڈیوڈ صاحب بولے۔

کھانے کی بات ختم ہوئی تو میں نے دھیرے سے کہا، "یار ڈیوڈ صاحب، اس گاؤں میں کبھی کوئی ایسی لڑکی نظر پڑ جاتی ہے کہ پاؤں کانپنے لگتے ہیں۔"

"کیسی تھی، مجھے بتاؤ۔ چندو کی بہو جو کی یا..."

"بس ڈیوڈ، تم لڑکیوں کی بات نہ کیا کرو۔ میں نے کتنی خوب صورت لڑکی سے تمھارا انگیجمنٹ طے کیا تھا۔"

"کیا خوب صورتی کی بات کرتی ہیں آنٹی! اگر جولی کو آپ نے دیکھا ہوتا..."

"جولی؟ جیسے اس کو تو میں نے نہیں دیکھا۔ تم نے اگر میری لڑکی کو دیکھا ہوتا۔ ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ "اگر وہ جاتی نہ ہے..." کچھ دیر بعد بولیں، "اگر وہ ہوتی تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ میں اس کی شادی کسی ملٹری افسر سے کر دیتی۔ اس سے تو کوئی بھی شادی کر سکتا تھا۔"

"میں شادی کیسے کر لوں آنٹی؟ دو سو پچاس روپے اکیس پیسے سے ایک پیٹ نہیں بھرتا۔ ایک اور لڑکی کی جان لینے سے کیا فائدہ آنٹی؟ میری زندگی تو گزر ہی جائے گی، مگر میں یہ نہیں چاہتا کہ اپنے پیچھے ایک غریب عورت اور دو تین پروف ریڈر چھوڑ کر مر جاؤں جو دن رات مشینوں کی کان پھاڑ دینے والی آوازوں میں بیٹھ کر آنکھیں پھوڑا کریں۔" وہ کچھ رکے۔ "یہی بات میں ان سے کہتا ہوں۔" انھوں نے

Scanned with CamScanner

میری طرف اشارہ کیا۔ اس آدمی کے پاس گاؤں میں تھوڑی سی زمین ہے جہاں گیہوں اور دھان کی فصل ہوتی ہے۔ اس کو چاہیے کہ اپنے قصبے کے پاس ایک کچا گھر بنا لے۔ اس کے سامنے ایک چھپر ڈال لے۔ اس پر لوکی کی بیل چڑھائی جائے گی۔ برسات میں آرام سے ایک بھینس پالی جا سکتی ہے۔ کچھ دنوں بعد مرغی خانہ کھول سکتے ہیں۔ کیا ہے وہ ... کسی کی کوئی فکر نہیں رہ جاتی ہے۔ ٹھاٹھ سے کام کریں اور کھائیں۔

اس نے کہا جب آپ وہاں آ جائیے گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔ بہت سے بڑے لوگ ... میں نے مذاق لیا۔

وہ ایک بابا جیسے لگے، بالکل بچوں کی سی معصومیت تھی۔

* *

## منو بھنڈاری

ہندی سے ترجمہ: ریحانہ علوی

# ترشنکو

گھر کی چار دیواری آدمی کو جہاں حفاظت فراہم کرتی ہے وہاں کچھ حدیں بھی مقرر کر دیتی ہے۔ سکول کالج جہاں انسانی ذہن کو جلا بخشتے ہیں وہیں اصولوں، قاعدوں ضابطوں کے نام پر ذہن کی شخصیت کو محدود بھی کرتے ہیں۔ بات یہ ہے بندھ کر ہر بات کی مخالفت خود اُس کے اندر ہی ہوتی رہتی ہے۔

یہ میں کسی کتاب سے ثبوت کے طور پر نہیں پیش کر رہی۔ ایسی بھاری بھرکم کتابیں پڑھنے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔ یہ تو اُن باتوں اور بحثوں کے ٹکڑے ہیں جو رات دن ہمارے گھر میں ہوا کرتی ہیں۔ ہمارا گھر، یعنی دانشوروں کا اکھاڑا۔ یہاں سگریٹ کے دھوئیں اور چائے کے پیالوں کے بیچ باتوں کے بڑے بڑے طومار باندھے جاتے ہیں، بڑے بڑے لفظی انقلاب برپا کیے جاتے ہیں۔ اس گھر میں کام کم اور باتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تو نہیں، پر اپنے گھر میں دیکھ کر یہ لگتا ضرور ہے کہ دانشوروں کے لیے کام کرنا شاید منع ہے۔ ماں شری ہی تین گھنٹے کی تفریح نما نوکری کے بعد آزاد؛ تھوڑا بہت لکھنے پڑھنے کے بعد جو وقت بچتا ہے وہ یا تو بحث مباحثے میں جاتا ہے یا پھر لوٹ لگاتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ جسم کے آرام پاتے ہی دماغ زیادہ کام تیز کرنے لگتا ہے، اور کیسٹ دن کے چوبیس میں سے بارہ گھنٹے رہتی ہے۔ پتا شری اور بھی دو قدم آگے ہیں۔ اُن کا بس چلے تو وہ نہائیں بھی اسی میز پر ہی۔

جس بات کو ہمارے یہاں زیادہ سے زیادہ زیر بحث لیا جاتا ہے وہ ہے جدیدیت! پر ذرا ٹھہریے، آپ جدیدیت کا غلط مطلب مت لیجیے۔ یہ بال کاٹنے اور چھری کانٹے سے کھانا کھانے والی جدیدیت نہیں

---

ترشنکو: ہندوستانی دیومالا کا ایک کردار، جو دو دنیاؤں کے بیچ میں لٹکا ہوا ہے۔

[illegible] کیا ہو گئی ہے، [illegible] ٹھیک سے [illegible] سنائی دیتی ہے۔ آپ راستا تبدیل کر سکتے ہیں، [illegible] کی شامت!

[illegible]

[illegible] میں نے دیکھا کہ [illegible]

[illegible]

[illegible] بہت مزے لے لے کر اس کا ذکر کیا ہے۔

[illegible] شادی سے پہلے [illegible] شادی [illegible] کیا کرتی ہیں۔ [illegible] کے [illegible] درمیان [illegible] باتوں کا ذکر کرتی ہیں تو [illegible] کے چہرے پر چمک آتی ہے۔

[illegible] اپنے [illegible] ٹھیک سامنے ایک [illegible] طالب علم [illegible] کرتے ہیں۔

چھت پر گھوم گھوم کر پڑھتے ہیں۔ مگر کبھی دھیان ہی نہیں گیا۔ شاید دھیان جانے والی عمر ہی نہیں تھی۔ اس بار دیکھا وہاں دو لڑکے آئے ہیں۔ تھے تو دو ہی، مگر شام تک ان کے دوستوں کا ایک جمگھٹ لگ جاتا تھا اور ساری چھت ہی نہیں سارا محلہ گلزار! ہنسی مذاق، گانا بجانا، اور آس پاس کی جو بھی لڑکیاں ان کی نظر کے دائرے میں آتیں ان پر چوٹیں پھبتیاں۔ ان کی نگاہوں کا اصل نشانہ ہمارا گھر تھا، اور صاف کہوں تو میں ہی تھی۔ برآمدے میں نکل کر میں کچھ بھی کروں، ادھر سے ایک نہ ایک ریمارک ہوا میں اچھلتا ہوا چلا آتا اور میں اندر تک تھرتھرا اٹھتی۔ مجھے پہلی بار لگا کہ میں ہوں، اور صرف ہوں ہی نہیں، کسی کی کشش کا محور اور مرکز بھی ہوں۔ ایمان داری سے کہوں تو اپنے ہونے کا پہلا احساس بڑا رومینٹک سا لگا اور میں اپنی ہی نظروں میں نئی ہو اٹھی --- نئی اور بڑی!

عجیب سی کیفیت تھی۔ جب وہ پھبتیاں کستے تو میں غصے سے بھنا اٹھتی --- حالاں کہ ان کی پھبتیوں میں بے ہودگی بالکل نہیں ہوتی تھی، وہ تو صرف دل میں گدگدی پیدا کرنے والی چہل --- پر جب وہ نہ ہوتے، یا ہو کر بھی آپس میں مشغول ہوتے، تو میں انتظار کرتی رہتی۔ ایک بے نام سی بے چینی اندر ہی اندر کسمساتی رہتی۔ عالم یہ ہوتا کہ دھیان وہیں اٹکا رہتا اور میں کمرہ چھوڑ کر برآمدے ہی میں ٹنگی رہتی۔

پر ان لڑکوں کے اس کھلے کھلے والے بیوہار نے محلے والوں کی نیندیں ضرور حرام کر دی تھیں۔ ہمارا محلہ یعنی باعزت اور خوردہ کے دلالوں کی بستی۔ جن کے گھروں میں جوان لڑکیاں نہیں وہ آستینیں چڑھا کر دانت توڑ دینے کی دھمکیاں دیتے، کیوں کہ سب کو اپنی لڑکیوں کا مستقبل خطرے میں دکھائی پڑ رہا تھا۔ محلے میں اتنی ہلچل، اور میرے پاپا ممی کو کچھ خبر ہی نہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی حالت ایک جزیرے جیسی بنا رکھی ہے --- سب کے درمیان رہ کر بھی سب سے الگ۔

ایک دن میں نے ممی سے کہا، "ممی، یہ جو سامنے لڑکے آئے ہیں، جب دیکھو مجھ پر ریمارک پاس کرتے رہتے ہیں۔ میں چپ چاپ نہیں سنوں گی، میں بھی یہاں سے جواب دوں گی۔"

"کون لڑکے؟" ممی نے تعجب سے پوچھا۔

"کمال ہے، ممی کو کچھ پتا ہی نہیں!" میں نے کچھ کھیج، کچھ خلش اور کچھ الجھن بھرے لہجے میں بات بتائی، پر ممی پر اس بات کا کوئی خاص ردعمل ظاہر نہ ہوا۔

"بتا، کون ہیں یہ لڑکے!" بڑے ٹھنڈے لہجے میں انھوں نے کہا اور پھر پڑھنے میں لگ گئیں۔ ایسا چیپٹر اپنا مجھے جتنا سنسنی خیز لگ رہا تھا، اس پر ماں کی طرف سے یہ رکھائی مجھے اچھی نہیں لگی۔ کوئی اور ماں ہوتی تو گھر سے نکل جاتی اور ان کی سات پشتوں کو تار تار کر دیتی، پر ممی پر جیسے کوئی اثر ہی نہیں۔

دوپہر ڈھلتے لڑکوں کی مجلس چھت پر جمی تو میں نے ممی کو بتایا۔

"دیکھو، یہ لڑکے ہیں جو سارے وقت ادھر دیکھتے رہتے ہیں اور میں کچھ بھی کروں تو اس پر جملے کستے ہیں۔" پتا نہیں میرے کہنے میں ایسا کیا تھا کہ ممی ایک ٹک میری طرف دیکھتی رہیں، پھر دھیرے سے مسکرا دیں۔ تھوڑی دیر تک چھت والے لڑکوں کا معائنہ کرنے کے بعد بولیں:

Scanned with CamScanner

کتنا کے لڑکے معصوم ہوتے ہیں، پر یہ تو ایک دم بچے ہیں!

دل چاہا کہ کہوں، کہ بچے نہیں تو کیا بوڑھے بھیڑیں گے؟ پر ابھی بھی ہو ہیں۔ کل شام کو ان دونوں کو چائے پر بلا رہی ہیں اور تم سے دوستی کرا دیتی ہیں۔

میں تو حیران!

تم نے انہیں چائے پر بلا لیا؟ مجھے جیسے ممی کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

ہاں، کیوں؟ کیا ہوا؟ رہتے یہ تو ہمارے ساتھ ہیں۔ ملاقات کر لی تو کچھ نہیں، بس دور ہی سے مجھے باری باری کے خوش ہو لو۔ اب تو رہ بدل لیا۔

میں تو بس حیران ہی رہ گئی۔ کمال ہے ممی بھی کوئی ونئی چیز ہیں۔ یہ لڑکے ہمارے گھر میں آئیں گے اور مجھ سے دوستی کریں گے! یہ ایک مجھے لگنے لگا کہ میں بہت اکیلی ہوں اور مجھے کسی کی دوستی کی سخت ضرورت ہے۔

اس محلے میں میری کوئی خاص میل جول نہیں، اور گھر میں صرف ممی پاپا کے دوست آتے ہیں۔

دوسرا دن میرا عجیب اوجھل کشمکش میں گزرا۔ پتہ نہیں ممی یہ بات پوری بھی کرتی ہیں یا یوں ہی رو میں کہہ گئیں اور بات ختم! شام کو میں نے یاد دلانے کے لیے کہا:

ممی، تم سچ مچ ان لڑکوں کو بلانے کے لیے کہہ چکی؟ الفاظ تو میرے یہی تھے، ورنہ اندرونی کیفیت تو یہ تھی کہ ممی، بلاؤ، جلدی!

اور ممی سچ مچ ہی بلا لائیں۔ مجھے یاد نہیں کہ دو چار بار سے زیادہ مجھے میں کسی کے یہاں گئی ہوں۔ میں بس دولے گریبان سے ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ ایک عجیب سی تھرکن رگ رگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ کہیں ممی ساتھ ہی بیٹھ گئیں تو؟ کہیں وہ ممی کے ساتھ بد تمیزی سے پیش آئے تو؟ پر نہیں، وہ لوگ ایسے لگتے تو نہیں ہیں۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد ممی لوٹیں۔ بے حد خوش۔

مجھے دیکھتے ہی ان کی خوشی کم ہو گئی۔ انہیں لاؤ، ممی تم تو لوگ بڑی پسلی، ساتھ ہی دانت توڑنے کی دھمکی دیتے ہیں گھر والوں سے ڈرتے رہتے تھے۔ میں بیٹھے بیٹھے گھر کی تہذیب کے ان کی بڑی پسلی ایک کرے اگر یہ تو کسی طرح کی بے جا دھ لے کر لیں۔ رشتے کی ہوسٹ پہلے ہیں۔ باہر سے آئے ہیں، ہوسٹل میں جگہ نہیں ملی اس لیے گھر دے کر رہ رہے ہیں۔ شام کو جب تمہارے پاپا آئیں گے تب بلوا لیں گے۔"

انتظار میں وقت اتنا بوجھل ہو جاتا ہے، یہ بھی میرا پہلا تجربہ تھا۔ پاپا آئے تو ممی نے بڑی امنگ سے ساری بات بتائی۔ سب سے بڑا پہلو یہ ممی کا اطمینان اور فخر ان کے ہر لفظ سے جیسے چھلکتا پڑ رہا تھا۔ پاپا کی نوں بھیجے رہے والے تھے۔ سنوں سے سنا تو وہ بھی بڑے خوش۔

جلدی بلوا لو! رسے کچھ کھانے دو اور مزے کرنے دو۔ بچے ہیں۔ ممی پاپا کو اپنے کو ماڈرن ثابت کرنے کا یہ بہت اچھا موقع مل رہا تھا۔

ہو کر کو بھیج کر انہیں بلوایا گیا تو گھر کی لے سب حاضر امی سے بڑے قاعدے سے تعارف کرایا اور ہیلو ہائے کا تبادلہ ہوا۔

"تو بیٹے، اپنے دوستوں کے لیے چائے بناؤ نا!"

دست تیرے کی! اس کے دوست آئیں تب بھی ہو چائے بنائے اور اس کے دوست آئیں تب بھی۔ پردل مار کر اٹھی۔

چائے پانی ہوتا رہا، خوب ہنسی مذاق بھی۔ وہ صفائی پیش کرتے رہے کہ ملنے والے خواہ مخواہ ہی ان کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ وہ تو ایسا کچھ بھی نہیں کرتے۔ جسٹ فار فن کچھ کہہ دیا، ورنہ ان سب کا کچھ مطلب نہیں۔

پاپا نے بڑھاوا دیتے ہوئے کہا، "ارے اس عمر میں تو یہ سب کرنا ہی چاہیے۔ ہمیں موقع ملے تو آج بھی ایسا کرنے سے باز نہ آئیں!"

ہنسی کی ایک لہر یہاں سے وہاں تک دوڑ گئی۔ کوئی دو گھنٹے بعد وہ چلنے لگے تو امی نے کہا، "دیکھو، اسے اپنا ہی گھر سمجھنا۔ جب جی چاہے چلے آؤ۔ ہماری سو بیٹی کو بھی کمپنی مل جائے گی۔ کبھی تم لوگوں سے کچھ پڑھ بھی لیا کرے گی۔ اور دیکھو، کبھی کچھ کھانے پینے کو دل چاہے تو بتا دیا کرو، تمہارے لیے بنوا دیا کروں گی۔" اور وہ لوگ پاپا کی بے تکلفی اور امی کی اپنائیت پر نثار ہو ہو کر چلے گئے۔ بس جس سے دوستی کرنے کے لیے بلایا تھا اس کی حیثیت صرف تماشا دیکھنے والے کی رہی۔

ان کے جانے کے بعد بڑی دیر تک وہ لوگ موضوعِ گفتگو رہے۔ اپنے گھر کی جوان لڑکی کو چھیڑنے والے لڑکوں کو گھر بلا کر چائے پلائی جائے اور لڑکی سے دوستی کرائی جائے، یہ ساری بات بڑی تھرلنگ اور رومینٹک لگ رہی تھی۔ دوسرے دن سے ہی امی آنے والے سے اس واقعے کا ذکر کرتیں۔ بیان کرنے میں تو امی کا جواب ہی نہیں۔ وہ کبھی پھیکی اور غیر دلچسپ باتوں تک کو اپنے بیان کے جادو سے وہ جان ڈال دیتیں کہ سننے والوں کو مزہ آ جائے۔ اور پھر یہ بات تو تھی ہی دلچسپ۔ جو سنتا وہی کہتا، "واہ، یہ ہوئی نا بات! آپ کا رویہ اور آپ کے نظریات بڑے صحت مندانہ ہیں۔ ورنہ لوگ باتیں تو بڑی بڑی کریں گے، پر بچوں کو گھونٹ کر رکھیں گے، اور ذرا سا شک شبہ ہو جائے تو باقاعدہ جاسوسی کریں گے۔" اور امی اس تعریف سے نہال ہو جاتیں۔ کہتیں، "اور نہیں تو کیا! آزاد رہو اور بچوں کو آزاد رہنے دو۔ ہم لوگوں کو بچپن میں یہ مت کرو، یہاں مت جاؤ، وہاں مت کھڑے ہو کہہ کہہ کر کتنا باندھا گیا تھا۔ ہمارے بچے تو کم سے کم اس گھٹن کا شکار نہ ہوں۔"

پر امی کا بچہ اس وقت ایک دوسری گھٹن کا شکار تھا، اور وہ یہ کہ جس ڈرامے کی ہیروئن اسے بننا تھا اس کی ہیروئن امی ہی بن بیٹھیں۔

خیر، اس سارے واقعے کا انجام تو یہ ہوا کہ ان لڑکوں کا بیوہار ایک دم بدل گیا۔ جس شرافت کو امی نے ان پر لاد دیا تھا، اسی کے مطابق رویہ اختیار کرنا ان کی مجبوری بن گئی۔ اب وہ جب بھی چھت پر

Scanned with CamScanner

ہوتے اور ممی پاپا کو دیکھتے ہوئے سب کے سب ایک ساتھ، اور مجھے دیکھتے تو مسکراہٹوں میں چھپ کر ایک ساتھ نمستے کہہ دیتے۔ بھتیجوں کی طرح باقاعدہ ہماری گفتگو شروع ہو گئی، بہت ہی کھلی اور بے جھجک۔ ہمارے گھر آنے والوں کی جست میں تمام ہی واحد تھی کہ ہر طرح کے لوگوں سے ہر بات چیت کی جا سکتی تھی۔ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ ہماری بات چیت سارا گھر سنتا تھا اور کافی دلچسپی سے سنتا تھا۔ جیسے ہی یہ لوگ شروع ہوتے، پاس پڑوس کی کھڑکیوں پر چار چھ سر ہو جاتے۔ چونکہ بڑے محلوں میں لڑکیوں کے پیار محبت کے قصے معمول، ایسی بات تو تھی نہیں۔ باقاعدہ لڑکیوں کے بھاگنے تک کے واقعات ہو چکے تھے۔ پر وہ سب کچھ بڑے خفیہ طریقے سے ہوتا تھا، اور مجھے وہ لوگ تب بھی ترچھی نظروں سے بھانپ لیتے۔ وہاں اردوں کو جن سے یہ خبریں حاصل ہوتا رہتا تھیں، وہ مونچھوں پر تاؤ دے کر اور عورتیں ہاتھ نچا نچا کر، جوش ملک ملا کر ان واقعات کی تشہیر کرتی تھیں۔ کچھ اسی انداز سے کہ ان سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ ہماری آنکھوں میں کوئی دخول نہیں جھونک سکتا۔ پر یہاں معاملہ ہی الٹ گیا۔ ہماری گفتگو بھی کھلے عام ہوتی تھی اور لوگوں کو کھڑکیوں کی اوٹ میں چھپ چھپ کر سننا پڑتا تھا اور سن کر بھی ان کے ہاتھ بس کچھ نہیں لگتا تھا جس سے ان کے دلوں کو کچھ تقویت پہنچتی۔

یہ بات تو جب تھی اور بات بڑھی۔ ہوا یہ کہ دھیرے دھیرے جست اور محفل میرے چھوٹے کمرے میں جمنے لگی۔ اور نہیں کسی دو دن، کبھی تین چار لڑکے آ کر جم جاتے اور دنیا بھر کا ہنسی مذاق اور گپ شپ چلتی رہتی۔ کاڑھا بھی ہوتا اور چائے پانی بھی۔ شام کو ممی پاپا آتے تو ان لوگوں میں سے کوئی نہ کوئی بیٹھا ہی ہوتا۔ شروع میں تو ان لوگوں سے … اور ممی پاپا اور دوسرے دن کی بڑی طرف داری کی تھی لوگوں نے … کا جو روپ دیکھا تو ان کی آنکھوں میں بھی کچھ عجیب سے شک تیرنے لگے۔ ممی کی ایک آدھ دوست نے دبی زبان سے کہا بھی: تو بہت فاسٹ چل رہی ہے۔ ممی کا پیار سارا جوش ماند پڑ گیا تھا اور وہ بات سے ہٹ کر کچھ … کی طرح کھو چلی تھی۔ اب تو انھیں اس ننگی سچائی کو جھیلنا تھا کہ ان کی … بیٹی … لڑکوں کے بیچ گھری رہتی ہے، اور ممی کی حالت یہ تھی کہ وہ … حالات ہو پوری طرح … نہیں پا رہی تھیں، جھوٹ میں شروع لیے ہوئے ان سب کو قبول کر رہی تھیں۔

آخر ایک دن انھوں نے مجھے اپنے پاس بٹھا کر کہا، "سو چینو، یہ روز روز یہاں آ کر جم جاتے ہیں، تمہاری تو پڑھائی بھی تو ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ اس دوستی کے چکر میں تیری پڑھائی لکھائی سب چوپٹ ہوتی جا رہی ہے۔ اس طرح تو یہ سب چلنے کا نہیں۔"

"رات کو پڑھتی تو ہوں۔"

"خاک پڑھتی ہے رات کو وقت ہی کتنا ملتا ہے؟ ٹھیک ہے، چار چھ دن میں کبھی آ گئے، گپ شپ کر لی، پر یہاں تو ایک نہ ایک روز ہی ڈٹا رہتا ہے۔" ممی کے لہجے میں غصے کی جھلک تیز ہو رہی تھی۔

ممی کی یہ ٹون مجھے اچھی نہیں لگی، مگر میں چپ رہی۔

تو ان سے بہت گھل مل گئی ہے۔ کہہ رہے تھے کہ وہ لوگ بھی بیٹھ کر پڑھیں اور تجھے بھی پڑھنے دیں۔ اور تجھ سے کچھ چاہیے تو میں کہہ دوں گی۔

پڑھائی کے بہانے سے کچھ کہنے کی نوبت نہیں آئی۔ کچھ تو پڑھائی کی مار سے کچھ دن شہر کی دوسری رونقوں سے کھنچے، اور اس طرح سوشل سے جو زندے دفتر آتے تھے ان کا آنا جانا کم ہو گیا۔ پر سامنے کے گھر سے والا شیکھر روز ہی آ جاتا۔ کبھی دوپہر میں آ جاتا [illegible] لوگوں کی موجودگی میں آنا [illegible] بات پر میں نے دھیان نہیں دیا تھا، وہی بات پہلے دن سب سے زیادہ اجاگر ہو کر آئی۔ وہ اتنا کم تھا، پر لفظوں سے پرے بہت کچھ کہنے کی کوشش کرتا تھا، اور یہ ایک ہی میں اس کی ان کہی بولی سمجھنے لگی تھی۔ صرف سمجھنے ہی نہیں لگی تھی بلکہ جواب بھی دینے لگی تھی۔ جلد ہی میری سمجھ میں آ گیا کہ شیکھر کے اور میرے بیچ پریم جیسی کوئی چیز پنپنے لگی ہے۔ یوں تو شاید میں سمجھ نہ پاتی، پر بھری فلمیں دیکھنے کے بعد ان باتوں کو سمجھنے میں کوئی خاص مشکل نہیں ہوئی۔

جب تک ان میں کچھ نہیں تھا سب کچھ بڑا کھلا کھلا تھا، مگر جیسے ہی کچھ ہوا تو اسے دوسروں کی نظر سے بچانے کی خواہش بھی ہوئی۔ جب بھی دوسرے لڑکے آتے تو سیڑھیوں ہی سے شور مچاتے ہوئے آتے، زور زور سے بولتے، لیکن شیکھر جب بھی آتا رینگتا ہوا آتا اور چپکے چپکے باتیں کرتے۔ ویسے باتیں بہت عام سی ہوتی تھیں، اسکول کی، کالج کی، مگر یہ باتیں بھی کانا پھوسی کے انداز میں اچھی لگتی تھیں۔ پریم کو کچھ پراسرار، کچھ گپ چپ ہو تو بڑا مزہ ہوتا ہے ورنہ تو یہ ایک دم سیدھا سپاٹ۔ پر ممی سے پاس گھر اور گھر والوں کے راز کو چھپا لینے کی جو چھٹی حس ہے۔۔ اور جس میں پاپا بھی کافی طاق ہیں۔۔ اس سے انہیں یہ سب سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ شیکھر کتنا ہی لک چھپ کر آتا اور ممی گھر کے کسی بھی کونے میں ہوتیں، جھٹ سے آ موجود ہوتیں یا پھر وہیں سے پوچھتیں، "شیکھر، تمہارے گھر سے ہیں؟"

میں نے دیکھا کہ شیکھر کے یہاں آنے سے ممی کے چہرے پر عجیب سی پریشانی جھلکنے لگی ہے۔ پر ممی اس بات پر یوں پریشان ہو جائیں گی، یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ جس گھر میں دن رات طرح طرح کی محبتوں ہی کا ذکر چھڑا رہتا ہو۔۔ کبوتروں کی محبت، شادی شدہ لوگوں کے افیئر، دو تین برسوں سے ایک ساتھ چلنے والے کیسز۔۔ اس گھر کے لیے تو یہ بات بہت ہی معمولی ہونی چاہیے۔ جب لڑکوں سے دوستی ہوگی تو ایک آدھ سے محبت بھی ہو سکتی ہے۔ ممی نے شاید یہ سمجھ رکھا تھا کہ یہ سب کچھ آرٹ فلموں کی طرح چلے گا۔۔ جن کی وہ صرف قائل ہی نہیں بلکہ داد دہ بھی۔۔ جن میں شروع سے آخر تک کوئی سنسنی خیز واقعہ ہوتا ہی نہیں۔

جو بھی ہو، ممی کی اس پریشانی نے مجھے بھی ہلکا سا بے چین کر دیا۔ ممی میری ماں ہی نہیں، دوست اور ساتھی بھی ہیں۔ وہ گھر سے دوستوں کی طرح ہم دنیا جہان کی باتیں کرتے ہیں، ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ میں چاہتی تھی کہ وہ اس بارے میں بھی کچھ بات کریں، پر انھوں نے کوئی بات نہیں کی۔ بس جب شیکھر

تو وہ بڑی لطافت سے پڑوسی چھوڑ کر بڑی ہوشیاری سے میرے گھر سے نکلے۔ دکاندار سے ملاقی رہتیں۔
ایک دن امی کے ساتھ باہر جانے کے لیے میچ آری تو وہ رہے تھی۔ پڑوس کی ایک شریف
خاتون گھر آئیں۔ بیٹھتے اور حال چال کے تبادلے کے بعد وہ اصل بات پر آگئیں۔
یہ سامنے کی چھت والے لڑکے آپ کے رشتہ دار ہیں کیا؟
نہیں تو۔
جی؟ شام کو دور آپ کے گھر میں بیٹھے رہتے ہیں، تو سوچا آپ کے ضرور کچھ لگتے ہوں گے۔
تو کے دوست ہیں۔ امی نے کچھ ایسی بے ساختگی سے اور بے جھجک انداز میں جواب لا کر
سے پوری تیر اشانے پر۔ لگنے کا غم لیے ہوئے لوٹ گئیں۔
وہ لوٹ گئیں پر مجھے لگا کہ ان بات کا سرا پکڑ کر امی اب ضرور تھوڑی میری دھنائی کر دیں
گی۔ کیسے ولی کا تو کچھ پتہ نہیں، پر میرا جھگڑے کا ستھرا، تو امی نے، تو میں آ ہی گیا۔ بہت دنوں سے ان کے
پنے من میں کچھ کھٹک تو تھی۔ پر امی نے اتنا کہا:
"لوگ تو ایسے ہی ہیں، کوئی دھندا نہیں ہے۔ جب دیکھو دوسروں کے گھر میں جھانک کر کے
بیٹھے رہتے ہیں۔"
مجھے طبیعی سی ہنسی ہو گئی امی کی طرف سے اسے کرنی شتّل سمجھ کر میں نے اپنی رفتار اور تیز کر
دی۔ پر شام کو گیا کہ تیکھے ساتھ تین گھنٹوں میں سے ایک گھنٹا ضرور پڑھائی کرتی۔ وہ ست دن کا
پڑھاتا اور میں سب دن لگا کر پڑھتی۔ ہاں، بیچ بیچ میں وہ کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پرزوں پر کچھ ایسے اشعار
لکھ کر تھما دیتا کہ میں اندر تک سمٹ اٹھتی اور ان کے ایک ایک لفظ کا تاثر میری رگ رگ میں سنسناتا رہتا
اور میں ہفتے تک ڈوبی رہتی۔
میرے اندر اپنی ہی ایک دنیا بنتی جا رہی تھی، بڑی بھری بھری اور بڑی رنگین۔ آج کل مجھے کسی کی
ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ لگتا جیسے میں اپنے آپ میں پوری ہوں۔ ہمیشہ ساتھ رہنے والی امی بھی آؤٹ
ہوتی جا رہی ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ ادھر میں نے امی پر دھیان دینا ہی چھوڑ دیا ہے۔ روزمرہ کی باتیں تو
ہوتی ہیں، پر صرف باتیں ہوتی ہیں، اس کے پرے کہیں کچھ نہیں۔
دن گزرتے جا رہے تھے اور میں اپنے آپ میں ڈوبی اور وہ گہری ترقی چلی جا رہی تھی، باہر کی دنیا سے
ایک طرح بے خبر سی۔
ایک دن اسکول سے لوٹی، کپڑے بدلے، شور شرابے کے ساتھ کھانا مانگا، میں میچ کے ساتھ کھایا،
اور جب کمرے میں داخل ہوئی تو امی نے بیٹھے بیٹھے ہی ٹوکا:
"سنو، ادھر آؤ۔"
پاس گئی تو پہلی بار دیکھا کہ امی کا چہرہ تمتما رہا ہے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ انھوں نے سائیڈ ٹیبل پر سے
ایک کتاب اٹھائی اور اس میں سے کاغذ کے پانچ چھ پرزے نکال کر سامنے کر دیے۔ تو پ! امی سے کچھ پڑھا

تھا۔ سوچتے ہوئے میں نے ہی کتاب دے دی تھی۔ غلطی سے شیکھر کی لکھی پرچیاں اس میں رہ گئی تھیں۔

تو اس طرح چل رہی ہے شیکھر کی اور تمہاری دوستی؟ یہی پڑھائی ہوتی ہے یہاں بیٹھ کر؟ یہی سب کرنے کے لیے آتا ہے وہ یہاں؟

میں چپ۔ جانتی ہوں غصے میں ممی کو جواب دینے سے بڑھ کر کوئی بے وقوفی نہیں ہوگی۔

تم کو چھوٹ دی، آزادی دی، پر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم اس کا ناجائز فائدہ اٹھاؤ!

میں پھر بھی چپ۔

بیتے بھر کی لڑکی اور کرتوت دیکھو اس کے! جتنی چھوٹ دی اتنے ہی پیر پسارتے جا رہے ہیں۔ ایک جھاپڑ دوں گی تو سارا رومانس جھڑ جائے گا دو منٹ میں۔

ان جملوں پر ایک دم تلملا گئی میں! تنک کر نظر اٹھائی اور ممی کی طرف دیکھا۔ پر یہ کیا! یہ تو میری ممی نہیں ہیں۔ نہ یہ تیور ممی کے ہیں، نہ یہ زبان۔ پھر بھی یہ جملے بہت جانے پہچانے لگے۔ کہاں یہ سب میں نے کہیں سنا ہے، اور کھٹاک سے میرے دماغ میں کوندا: نانا! پر نانا کو مرے تو کتنے سال ہو گئے۔ پھر یہ زندہ کیسے ہو گئے؟ اور وہ بھی ممی کے اندر، جو ہوش سنبھالنے کے بعد ہمیشہ ان سے جھگڑتی رہیں، ان کی ہر بات کی مخالفت کرتی رہیں۔

ممی کی ناراضگی بھری گفتگو کافی دیر تک جاری رہی، پر وہ مجھے کہیں سے چھو نہیں رہی تھی۔ بس کوئی بات جھنجھوڑ رہی تھی تو یہی کہ ممی کے اندر نانا کیسے آ بیٹھے!

اور پھر گھر میں ایک عجیب سا تناؤ اور خاموشی چھا گئی، خاص کر میرے اور ممی کے بیچ۔ نہیں، ممی تو کب کہاں بیچ میں تھیں، میرے اور نانا کے درمیان۔ ممی کو میں اپنی بات سمجھا بھی سکتی ہوں، ان کی بات سمجھ بھی سکتی ہوں۔ پر نانا؟ میں تو ان کی زبان سے بھی ناواقف ہوں اور ان کے تیور سے بھی۔ بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا! پاپا ضرور میرے دوست ہیں پر بالکل دوسری طرح کے۔ شطرنج کھیلنا، پیچ لڑانا، اور جو فرمائش ممی پوری نہ کریں، اس سے پوری کروا لینا۔ بچپن میں ان کی پیٹھ پر لدی رہتی تھی اور ہر فرمائش پوری کروا لیتی تھی۔ پر سب سے مائی ڈیر ڈیڈی ہونے کے باوجود اپنی نجی باتیں میں ممی کے ساتھ ہی کرتی آئی ہوں۔ اور وہاں ایک دم سناٹا۔ ممی کو پتہ بھی نہیں کہ نانا پوری طرح ان پر سوار ہو چکے ہیں۔

شیکھر کو میں نے اشارے ہی سے لال جھنڈی دکھا دی تھی؛ وہ بھی نہیں آ رہا تھا، اور شام کا وقت ہے کہ مجھ سے کاٹے نہیں کٹتا۔

کئی بار سوچا کہ ممی سے جا کر بات کروں اور صاف صاف پوچھوں، تم اتنا بگڑ کیوں رہی ہو؟ میری اور شیکھر کی دوستی کے بارے میں تم جانتی تو ہو۔ میں نے تو کبھی کچھ چھپایا نہیں۔ اور دوستی سے تو یہ سب تو ہوتا ہی۔ تم کیا سمجھ رہی تھیں کہ ہم لوگ بھائی بہن کی طرح--- پر یہی خیال آتا، ممی میں ہی کہاں ہو جائے گی کیوں یہ سب؟

بارہ دن ہو گئے میں نے شیکھر کی صورت تک نہیں دیکھی۔ میرے ہلکے سے اشارے ہی سے اس

Scanned with CamScanner

سے جانے سے کہہ تو دیا، چھت پر بھی آنا چھوڑ دیا۔ ہوسٹل میں رہنے والے ممی نے ساتھی کی چھت پر نہیں دیکھی تھی۔ پھر کبھی ہی آتے۔ کوئی آتا تو کہہ رکھا تھا کہ ان کا حال ہی پوچھ لیتی۔ میں جانتی ہوں، وہ خوف کی بات لگتی ہے۔ اسے تو ٹھیک سے یہ بھی نہیں معلوم کہ آخر یہاں ہو کیا رہا ہے۔ کتنا ہے ان لوگوں نے ممی کے رویے کو بھانپ لیا۔

ویسے کل سے ممی نے چہرے کا تناؤ کچھ ڈھیلا ضرور ہوا ہے۔ تبھی ان سے ممی ہونی ختم جیسے مکمل ہی ہو رہی ہیں سے ملنے ارادہ کہ بات سے ممی کی کریں گی۔

صبح ساڑھے سات میں دروازے کے پیچھے چپکی ہوئی بیٹھی پاپا کی باتیں سن رہی تھی۔ ممی چائے ساری ختم کر چکی تھیں اور پاپا اخبار میں سر گڑائے بیٹھے تھے۔ ممی کو شاید معلوم ہی نہیں ہو کہ میں کب سارا کام نکل آئی۔ وہ پاپا سے بولیں:

جانے ہوسٹل رات کو کیا ہوا؟ تب سے طبیعت عجیب سی ہو رہی ہے۔ میں تو رات بھر سوئی نہیں سکی۔

ممی نے کہنی کو دبانے سے میں نے تو حال کا تناؤ کم کر کے کان باہر لگا رکھے۔

آدھی رات کے وقت میں باتھ روم جانے کے لیے گئی۔ سامنے چھت پر گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ یکایک ایک ذرا سا چمک اٹھا میں چونکی۔ غور سے دیکھا تو اندھیرے حصے سے ایک سایہ سا نظر آیا۔ شاید چھت پر کوئی سگریٹ پی رہا تھا۔ میں چپ چاپ لوٹ آئی۔ کوئی دو گھنٹے بعد پھر گئی تو دیکھا وہ ویسے ہی چھت پر ٹہل رہا تھا بے چارہ۔ میرا دل جانے کیسا ہو گیا۔ تو ہی کیسی مجھی رہتی ہے۔ پھر بیچ میں دو دن کار کی ہوئی ہوتیں، پہلے تو چھوٹ دو، اور جب آئے تو انہیں تو بیچ کر چاروں شانے چت دو۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی بھلا!

ممی کا یہ کہنا سن کر میرے اندر سے نکل پڑا جیسے کیسے یہ بات مجھے کہنی چاہ رہی دوڑ کر ممی سے لپٹ جاؤں۔ لگا جیسے عرصے کے بعد میری ممی لوٹ کر آئی ہوں۔ پر میں نے کچھ نہیں کہا۔ بس سوچتی رہی، کیسی بات کروں گی۔ پاپا ان سے جانے کیسے کیسے سوال دریافت کر رہے تھے۔ اب لگا، اب تو ممی جیسی کی گر سے کہیں سے تو سب کچھ صاف ہوتا ہے۔

پر کہتے ہیں کہ دیکھی تو میری انگلیاں تشبیہوں پر سر تا ہے کرسی پر بیٹھے سے ورکی کی نرمی سے مجھے پر مسکرائیں ہی بیٹھ کر اور پھر سلاد ہی میں۔ مجھے دیکھتے ہی بڑے میٹھے انداز میں بولیں:

دیکھو ان بچے کو، چاروں سے یہ صاحب کل سے نہیں سے ہیں۔ کچھ کھایا پیا ہے۔ پہلے تو اس کا بھی کھانا ہوتا۔

اور پھر ممی نے خود بیٹھ کر بڑے پیار بھرے انداز میں ان کو کھانا کھلایا۔ کھانے کے بعد رونے پر بھی شاید نہیں تھیں۔ ممی نے نہیں احسان مندی کے بوجھ سے جھکا جھکا سی وہ لوٹ گیا اور میرے اندر خوشی کا ایسا ہو رہا تھا کہ اب تک کے اٹھے سارے سوال اسی میں بہہ گئے۔

سارے حالات کو قابو میں آنے میں وقت تو لگا، پر آ گئے۔ شنکر نے بھی اب یکدم دل چھوڑ کر آنا شروع کر دیا، ورنہ آتا بھی تو زیادہ تر پڑھائی لکھائی کی ہی بات کرتے۔ اپنے کیے پر شرمندگی ظاہر کرتے ہوئے انہوں نے ممی سے وعدہ کیا تھا کہ اب کوئی ایسا کام نہیں کریں گے جس سے ممی کو شکایت ہو۔ جس دن وہ نہ آتا، میں تھوڑی دیر کے لیے چھت پر جا کر اس سے بات کر لیا کرتی۔ گھر کی حالت اور دو سے ہر جانے چھپنے والے پیار کے اس کھیل میں محلے والوں کے لیے بھی کچھ نہیں رہ گیا تھا اور انہوں نے اس جان لیوا زمانے پر دو چار لعنتیں بھیج کر، کوئی نئی گھٹنے تک کے لیے اپنی دلچسپی کو ملتوی کر دیا تھا۔

لیکن ایک بات میں نے ضرور دیکھی۔ جب بھی شنکر شام کو کچھ زیادہ دیر بیٹھ جاتا یا دوپہر میں بھی آتا تو ممی کے اندر بار بار کسمسانے لگتے۔ کوشش کر کے ممی پاپا کو بولنے تو نہ دیتیں، پر انہیں پوری طرح مٹا دینا بھی شاید ممی کے بس میں نہیں تھا۔

ہاں، یہ میرے اور ممی کے بیچ اب روز مرہ کی بات چیت کا موضوع ضرور بن گیا تھا۔ کبھی وہ مذاق میں کہتیں، "یہ خوب صورت شنکر ہے تا بڑا لمبا سا لڑکا ہے۔ اس عمر کے لڑکوں کو چاہیے، گھومیں پھریں، موج کریں۔ یہ کیا کر کے یہ ہی صورت بنائے مجنوں کی طرح چھت پر ٹنگا سارے وقت ادھر ہی تاکتا رہتا ہے!"

میں صرف ہنس دیتی۔

کبھی بڑی جذباتی ہو کر کہتیں، "تو کیوں نہیں سمجھتی بیٹے، کہ تجھ سے کتنی امیدیں لگا رکھی ہیں میں نے۔ تیرے مستقبل کے لیے کتنے خواب دیکھے ہیں!"

تب میں کہتی، "ممی، تم بھی کمال کرتی ہو! اپنی زندگی کے بارے میں بھی تم خواب دیکھو اور میری زندگی کے خواب بھی تمہیں دیکھ ڈالو۔ کچھ خواب میرے لیے بھی چھوڑ دو نا!"

کبھی وہ سمجھانے والے لہجے میں کہتیں، "دیکھو تنو، ابھی تم بہت چھوٹی ہو۔ اپنا سارا دھیان لکھنے پڑھنے میں لگاؤ اور دماغ سے یہ الٹے سیدھے فتور نکال ڈالو۔ ٹھیک ہے، بڑی ہو جاؤ تو پریم بھی کرنا اور شادی بھی۔ ویسے بھی میں تو تمہارے لیے لڑکا ڈھونڈنے والی ہوں نہیں۔ اپنے آپ ہی ڈھونڈنا، پر اتنی عقل تو آ جائے کہ ڈھنگ کا انتخاب کر سکو۔"

اپنے انتخاب کے ریفرنس کو میں سمجھ جاتی اور پوچھتی، "اچھا ممی، بتاؤ جب تم نے پاپا کو چنا تو یہ بات نانا کو پسند تھی؟"

"میرا انتخاب! اپنی ساری پڑھائی لکھائی ختم کر کے پچیس سال کی عمر میں انتخاب کیا تھا میں نے۔ خوب سوچ سمجھ کر اور عقل کے ساتھ۔ سمجھیں؟" ممی اپنی بوکھلاہٹ کو غصے میں چھپا کر کہتیں۔ عمر اور پڑھائی لکھائی، یہی دو تو ہتھیار ہیں، جن پر ممی مجھے جب تب ڈانٹتی رہتی ہیں۔ پڑھنے لکھنے میں میں اچھی تھی اور عمر کا سوال تو اس کے لیے جی چاہتا کہ کہوں: ممی، تمہاری پیڑھی جو کام پچیس سال کی عمر میں کرتی تھی، ہماری پیڑھی اسے پندرہ سال ہی کی عمر میں کرے گی۔ یہ تم کیوں نہیں سمجھتیں؟ پر چپ رہ جاتی۔

Scanned with CamScanner

نا کا ڈر تو چل ہی پڑا ہے، کہیں وہ بھی چاٹ گئے تو؟

ہاف ایرلی کا وقت قریب آ گیا تھا اور میں نے سارا دھیان پڑھنے میں لگا دیا تھا۔ سب کا آنا جانا اور کانا پھوسی، ایک دم بند! ان دنوں میں نے جی بھر کر پڑھائی کی کہ ممی کا جی خوش ہو گیا۔ شاید کچھ مطمئن بھی۔ آخری پیپر دینے کے بعد لگ رہا تھا کہ ایک بوجھ تھا جو ہٹ گیا۔ بس ہلکا ہو کر کچھ موج مزے کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ میں نے ممی سے پوچھا:

ممی، کل دیپک اور شیکھا پکچر جا رہے ہیں۔ میں بھی ساتھ چلی جاؤں؟ آج تک میں ان لوگوں کے ساتھ گھومنے نہیں گئی تھی، پر اب تو پڑھائی کر لی ہے، یہ چھوٹ تو ملنی ہی چاہیے تھی

ممی ایک پل میرا چہرہ دیکھتی رہیں۔ پھر بولیں، ادھر آ، یہاں بیٹھ۔ تجھ سے کچھ بات کرنی ہے۔

میں جا کر بیٹھ گئی، پر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں بات کرنے والی کیا چیز ہے۔ ہاں کہو یا نہ۔ لیکن ممی کو بات کرنے کا مرض جو ہے۔ ان کی ہاں یا نا بھی پانچ سات جملوں میں لپیٹے بغیر نہیں نکل سکتی۔

تیرے امتحان ختم ہو گئے، میں تو خود پکچر کا پروگرام بنا رہی تھی۔ کون سی پکچر دیکھنا چاہتی ہے؟

کیوں؟ ان لوگوں کے ساتھ جانے میں کیا ہے؟ میرے لہجے میں اتنی جھنجھلاہٹ بھری ہوئی تھی کہ ممی ایک ٹک میرا چہرہ ہی دیکھتی رہ گئیں۔

سنو، تجھے پوری چھوٹ دے رکھی ہے بیٹے، پر اتنا ہی تیرا چل کہ میں بھی تیرے ساتھ چل سکوں۔

تم صاف کہو نا کہ جانے دو گی یا نہیں؟ بے کار کی باتیں! میں بھی ساتھ چل سکوں! تمہارے ساتھ چل سکنے کی بات کہاں سے آ گئی؟

ممی نے میری پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا، ساتھ تو چلنا ہی پڑے گا۔ کسی دن منہ کی کھائی تو اٹھانے والا بھی تو ہونا چاہیے نا!

میں سمجھ گئی کہ ممی نہیں جانے دیں گی۔ پر اس طرح پیار سے منع کرتی ہیں تو جھگڑا بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔ منع کرنے کا سیدھا سا مطلب ہے کہ ان کا بگھارا ہوا فلسفہ سنو۔ یعنی پچاس منٹ کی ایک کلاس۔ پر میں قطعی نہیں سمجھ پائی کہ جانے میں آخر حرج کیا ہے۔ ہر بات میں انکار! کبھی تو کہتی تھیں کہ بچپن میں بہت روک ٹوک رہی، یہاں مت جاؤ، وہ مت کرو کہہ کر ہم کو بہت ڈانٹ کی تھی، اور اب خود ہی سب کر رہی ہیں۔ دیکھ لیا ان کی بڑی بڑی باتوں کو۔ میں بھی ... ہاں، ایک عقل ضرور تم آ گئی کہ جو چلے گا وہ گرے گا بھی، اور جو گرے گا وہ اٹھے گا بھی، اور خود ہی اٹھے گا، اسے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔"

پتا نہیں میری اس بات کا ان پر کیا اثر ہوا یا خود بخود، نہیں احساس ہوا کہ انھوں نے شیکھا اور دیپک کے گھر جا کے ... ہوئے تینوں چاروں لڑکوں کو بلا کر میرے ہی کمرے میں محفل جمائی اور خوب گرم گرم کھایا، کھلایا۔ کچھ ایسا رنگ جما کہ وہ پہلے والا سارا غبار دھل گیا۔

امتحان ختم ہو گئے تھے اور موسم سہانا تھا۔ ممی کا رویہ بھی نارمل تھا تو دوستی کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر شروع ہو گیا، اور آج کل تو جیسے اس کے سوا کچھ رہ ہی نہیں گیا تھا۔ پر پھر ایک جھٹکا!

اس دن میں پچھلی گلی کے گھر سے لوٹی تو ممی کی سخت آواز سنائی دی:

"تنو، ادھر آؤ تو!"

آواز سے لگا کہ یہ خطرے کا سگنل ہے۔ ایک پل کو تو میں ٹھٹک گئی۔ پاس گئی تو چہرہ پہلے کی طرح سخت۔

"تم شیکھر کے کمرے میں جاتی ہو؟" ممی نے بندوق داغی۔ سمجھ گئی کہ پچھلی گلی میں سے کسی نے اپنا کرتب کر دکھایا۔

"کب سے جاتی ہو؟"

دل تو چاہا کہ کہوں، جس نے جانے کی خبر دی ہے اس نے باقی ساری باتیں بھی بتا دی ہوں گی -- کچھ جوڑ توڑ کر ہی بتایا ہوگا۔ پر ممی جس طرح بھبک رہی تھیں، اسے دیکھ کر چپ ہی رہنا بہتر سمجھا۔ ویسے مجھے ممی کے اس غصے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ دو تین بار اگر میں تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے شیکھر کے کمرے پر چلی گئی تو ایسا کیا گناہ ہو گیا۔ پر ممی کی ہر بات کی کوئی وجہ تو ہوتی نہیں، بس موڈ پر چلتی ہیں۔

عجیب مصیبت تھی! غصے میں ممی سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، اور میری چپ ان کے غصے کو اور بھڑکا رہی تھی۔

"یاد نہیں ہے، میں نے شروع ہی میں منع کر دیا تھا کہ تم اس کے کمرے پر کبھی نہیں جاؤ گی۔ تین تین گھنٹے وہاں دھونی رما کر بیٹھتا ہے، اس میں جی بھرا نہیں تمہارا؟"

وہم، غصے اور دہشت کی پرتیں ان کے چہرے پر گہری ہوتی جا رہی تھیں اور میں سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی کہ کیسے انہیں ساری کیفیت سمجھاؤں۔

"وہ تو بے چاری سامنے والی نے مجھے بلا کر آگاہ کر دیا۔ جانتی ہو، یہ سر آج تک کسی کے سامنے نہیں جھکا، پر وہاں مجھ سے آنکھ نہیں اٹھائی گئی۔ منہ دکھانے لائق مت رکھنا ہم کو کہیں بھی۔ ساری گلی میں تھو تھو ہو رہی ہے۔ ناک کٹا کر رکھ دی!"

غضب! اس بار تو سارا محلہ ہی بولنے لگا ممی کے اندر سے! تعجب ہے ممی آج تک اپنے آس پاس سے بالکل کٹی رہیں، جس کا مذاق اڑایا کرتی تھیں، آج کیسے اس کے سُر میں سُر ملا کر بول رہی ہیں۔

ممی کی تقریر بدستور جاری رہی، پر میں نے تو اپنے کانوں کے سوئچ ہی آف کر لیے۔ جب غصہ ٹھنڈا ہو گا، ممی اپنے میں لوٹ آئیں گی، تب سمجھا دوں گی: ممی، اس چھوٹی سی بات کو تم ناحق اتنا طول دے رہی ہو!

پر جانے کیسی ڈوز لے کر آئی ہیں اس بار، کہ ان کا غصہ ٹھنڈا ہی نہیں ہو رہا ہے، اور ہوا یہ کہ سب

Scanned with CamScanner

اُن کے غصے سے مجھے حد چڑھنے لگا۔

پھر گھر میں ایک عجیب سا تناؤ بڑھ گیا۔ اس بار ممی نے شاید پاپا کو بھی سب کچھ بتا دیا۔ کہا تو انھوں نے کچھ نہیں — وہ شروع ہی سے اس سارے معاملے سے کٹے کٹے سے ہی رہتے تھے — مگر اس بار ان کے چہرے پر بھی ایک ان کہا سا تناؤ کئی دن ضرور دکھائی دیتا رہا۔

کوئی دو مہینے پہلے جب اس طرح کا واقعہ ہوا تھا تو میں اندر تک سہم گئی تھی، پر اس بار میں نے طے کر لیا ہے کہ اس سارے معاملے میں ممی کو اگر نارمل برتاؤ کرنا ہے تو مجھے بھی پھر کسی کی طرح سوچنا ہو گا ان سے، اور میں ضرور لڑوں گی۔ دکھ تو دوں گی میں تب۔ بیٹی ہی بیٹی ہوں اور تمھارے ہی نقشِ قدم پر چلی ہوں۔ خود تو ایک سے ایک زہریلی تھیں، ساری زندگی اس بات کی گھٹی پلاتی رہیں، پر میں نے جیسے ہی پہلا پیر آگے دھرا، گھسیٹ کر مجھے اپنی ہی گھسیٹی ہوئی لیک پر سے ہی دوڑ دھوپ کرنے لگیں۔

میں نے دل میں سیکڑوں ہی دلائل سوچ ڈالے کہ ایک دن ممی سے باقاعدہ بحث کروں گی۔ صاف صاف کہوں گی کہ ممی، اتنے ہی سدھ بدھ لگا کر رکھنا تھا تو شروع سے ویسے پالتیں۔ کیوں جھوٹ موٹ آزادی دے کر یہ باتیں کرائی سکھاتی رہیں؟ پر اس بار میرا ممی سے کٹ کر اس طرح رہنا کچھ ہو گیا تھا کہ میں گم سم سی بیٹھی کمرے میں پڑی رہتی۔ جی بہت بھر آتا تو رو لیتی۔ گھر میں سارا سارا دن ہنسنے کھلکھلانے والی میں یک دم چپ ہو کر اپنے ہی میں سمٹ گئی تھی۔ بس، ایک جملہ ضرور بار بار دہرا رہی تھی: ممی، تم اچھی طرح سمجھ لو کہ میں بھی ایسی ہی مستی کروں گی! حالاں کہ میرے من میں کیا ہے، اس کا کوئی بھی پلان میرے سامنے نہ تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ ان تین چار دنوں میں باہر کیا ہوا۔ گھر اور باہر کی دنیا سے کٹی، اپنے ہی کمرے میں بند، میں ممی سے مورچہ لینے کے داؤں پیچ سوچ رہی تھی۔

پر آج دوپہر مجھے اپنے کانوں پر قطعی قطعی یقین نہیں آیا جب میں نے ممی کو اپنے برآمدے ہی سے چلاتے ہوئے سنا:

شیکھر، کل تو تم لوگ چھٹیوں میں اپنے گھر چلے جاؤ گے۔ آج شام اپنے دوستوں کے ساتھ کھانا یہیں کھانا!

نہیں معلوم کس ڈھب سے کر کرا کے یہ حیثیت لوٹ چکی ہوں گی۔

رات کو شیکھر، دیپک اور دوستوں کے ساتھ کھانے کی میز پر ڈٹے ہوئے تھے۔ ممی اتنی ہی محبت سے کھلا رہی تھیں، پاپا اپنے ہی ڈھنگ سے مذاق کر رہے تھے، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ عل بغل کی کھڑکیوں میں دو چار سر چپکے ہوئے تھے۔ سب کچھ پہلے کی طرح جانا پہچانا ہو اٹھا تھا۔

صرف میں ہی اس سارے حالات سے یک دم کٹی کٹی ہو کر یہی سوچ رہی تھی کہ ماں، پوری طرح ماں نے، سو فی صد! اور اس سے ممی کے لیے لڑنا کتنا آسان ہو گیا ہو گا۔ پر ان ممی سے لڑ بھی کیسے پاتی جو ایک پل ماں ہو کر جیتی ہیں اور دوسرے پل ممی ہو کر۔

* *

# راجی سیٹھ

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

## آمنے سامنے

کل شام ہی سے وہ سینے، ہونٹوں پر کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ صبح سے تو اس نے ایک طرح سے بھوک ہڑتال سی کر رکھی تھی۔ چائے پانی کچھ نہیں۔ ناشتہ بنایا، لگا دیا۔ بچوں کو اسکول بھیجا، آنند کو آفس۔

پھر میرے کمرے کے دروازے سے لگ کر آ کھڑا ہوا۔ "آج جوس نکال کر تھرمس میں رکھ دوں؟"

پھر دانتوں میں ہتھیلی کے نیچے دبے کاغذ سے کاربن کے کھسک جانے کے اندیشے سے میں نے سر اٹھانے کا جوکھم نہیں لیا۔ کچھ تکلیفوں کی ایک بو ہوتی ہے، دیوار پر دھوئیں کی طرح چپکی، جنھیں چہروں سے ٹھیک نہیں کیا جا سکتا، اور ٹالا بھی نہیں جا سکتا۔

مسکراہٹ، گر دیکھنے پر کچھ ویسی ہی بہ دیکھنے میں آیا جو میرے تصور میں تھا: بے چین اور باغی۔

یوں وہ ایک خوش مزاج لڑکا ہے۔ کچھ ہنسی مذاق کرنے والا بھی، سیر چشم بھی۔ بس بے چینی کے موڑ جیسے پڑے جو آدمی کو اندر سے ثابت نہیں رہنے دیتی۔ ثابت رہنا اچھا ہے یا بے چین رہنا، یہ ایک شخصی قسم کا فیصلہ ہے۔ بے چینی نہ ہو تو کوئی آگے ہی نہ بڑھے، اپنے ثابت احساس میں بت بنا بیٹھا رہے۔

اصولی طور پر میں خود بھی اس بے چینی کی قائل ہوں۔ اسی بے چینی نے مجھے بھی کسی نہ کسی قسم کے تصادم کی مار سے بچایا تھا۔ تب، جب مجھے لگتا تھا میرے جوڑوں ہی میں نہیں میری ہڈیوں میں بھی زنگ لگ چلا ہے۔ میری کھال کے نیچے ربر کے غبارے میں بھرے ہوئے پانی کی طرح قید ایک تھل تھل کرتا سا وہ جو ادھر سے ادھر لڑھکتا ہے، کسی سمت کا تعین نہیں بنتا

Scanned with CamScanner

اس نے چینی کا کنارہ پکڑ کر جب شروع کرنے پر وجود پر جمی کائی ایسے ڈگمگائی تھی جیسے بچپن سے سوچوں کے تختے پر دھری پرانی برسوں سے سوئی مٹی اور مٹی کی پرتیں۔ یہی وجہ تھی چینی تعلیم کو پورا کرنے کا اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ حالاں کہ احمد کو یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔ ست کرتے تھے اسے بڑھاپے کے یہ بچگانہ آثار۔

میرے اس طرح یکایک وہاں پر کھڑے ہونے پر ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ نے مجھے گھورا تھا۔ میرا بچہ تل تل جسم جس کے پاس نرم سے گوشت کی پرتیں، کہنی سے اوپر آستینوں کے مضبوط سے باہر سونی بانہوں کی کھال، آنکھوں پر موٹا چشمہ اور ہونٹوں پر چڑھی نیل پالش کو کوروں پر سے جھلملاتے چکنائی کے داغ۔ ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ کی جائزہ لیتی نظر نے میری نظر کو بھی پر گاڑ دیا تھا، کچھ دوسری طرح سے۔ میں کچھ پریشان ہو گئی --- پانی پانی۔

نوکری؟ وہ پھر ٹوک کر تھوڑا پرے پر چونکا۔

نوکری نہیں --- مجھے داخلہ چاہیے۔

یہیں --- یعنی کہ --- کس میں؟

ایم اے میں

یہی نگاہ کو میز تک واپس لے جاتے ہوئے انھوں نے مجھے ایک بار پھر چونکا۔ بیٹھ جائیے۔

تب مجھے یہ دعوت دیا یاد رہی ان دونوں کے وزن سے بھاری ہو جانے والے میرے کرخت وجود کو دی گئی تھی۔ سامنے بیٹھتے ہوئے میں نے دھیان دیا تھا کہ ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ عمر میں مجھ سے کافی چھوٹا تھا، کچھ کچھ میرے چھوٹے بھائی جیسا۔ میرے اس کے سامنے اس طرح کھڑے رہنے کی بے آرامی کو اس کا چہرہ اب تک قبول نہیں کر سکا تھا۔

وجہ؟ اس نے یوں ہی کھنکار کر کہا تھا۔ آپ؟ --- میرا مطلب ہے اس ---

ہاں ہاں ہاں! داخلے کا ہی ہے --- کسی کی ---

نہیں، میرا مطلب ہے --- سب ٹھیک ٹھاک تو ہے نا؟

مجھے خود کوئی جواب نہ سوجھا۔ سب ٹھیک ٹھاک ہے، پر باہر بہتر کچھ بھی نہیں۔ میاں کی اونچی نوکری، ایک عدد گھر، دو اچھے بچے، بڑھیا اسکول، وہ سب جسے کیا کہتے ہیں اچھی حیثیت، سیکڑوں ساڑیاں، درجنوں جوتے، سر سے روپہلے آتے --- مگر اندر کہیں کوئی چیز سب کو فالتو کر دیتی ہے، یکایک۔

آپ سے پہلے بھی کہیں ملا ہوں --- نہیں؟

ہاں، مہرونزا کی پارٹی میں۔ اسے بھی یاد آ گیا تھا۔

پڑھنے کی عادت چھوٹ نہیں جاتی اتنے دنوں میں؟ اس نے پھر جانچنا چاہا تھا۔ مائی وائف سیم لیس لیسے گزری تو سیٹ اپ ہوم ---"

Scanned with CamScanner

ٹھیک کہتی ہیں آپ کی بیٹی۔ میری اس بات پر وہ چہرہ پھر پُرسکون ہو گیا، جیسے یہ پڑھنے اور پھر نوکری کرنا چاہنے کی مجبوریاں کو کچھ نہ [illegible] ہیں وہ سمجھتا ہے، اچھی طرح۔

کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا زندگی کے بارے میں--- ایک دلچسپی، غیر یقینی سی بڑبڑاہٹ انھوں نے سرکائی اور پھر چونک کر اپنے سامنے رکھی گھنٹی ٹھنٹھنا دی۔ پھر سنجیدگی سے سکڑتے ہوئے بولے، ون شڈ آلویز بی پریپیئرڈ--- کبھی بھی، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

کچھ ہونے کا ذکر اس وقت بڑا بدحواس کرنے والا تھا۔ ان واقعوں حادثوں کا کیا ہو جو ہو رہے ہوں، جو ہوں پر نہیں۔ کئی واقعات سے خالی، سنسان، اندھیرے میں پیش آتے ہیں۔ ایک مسلسل ورق ہوش احساس کی طرح۔ کہیں کچھ بھی نہیں ہوتا، پھر بھی ہوتا رہتا ہے۔ کوئی چیز اندر ہی اندر، دھیرے دھیرے، بے دیکھے جانے مرتی رہتی ہے۔ پہلے روح کی حس جیسا کچھ، پھر خاموشی، پھر سب کچھ سُن سُن--- رگوں میں بہتا گرم لہو پانی کی تاثیر سے بہتا ہے، اور اپنے سے اپنا رشتہ دو ٹوک ہو جاتا ہے۔ ہنسی کی نظروں میں بس قدر گھٹ جانے کی وہ گھڑی ٹھیک سامنے آ کھڑی ہوتی ہے--- بھونچکی، ساکت اور بدحواس۔ تب کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو ہو چکا ہے وہ کیوں ہوا تھا اور اب آگے کیا ہو گا۔

میں بھول گئی تھی کہ وہ کچھ پوچھتا دروازے پر کھڑا ہے۔ میں کسی دوسرے سمے کے دور میں تھی جو اس سے الگ کر شروع تو ہوتا ہے پر اس میں اس کے لیے کچھ نہیں تھا، صرف بلندیوں پر لگے معنی کے حصول کے اپنے احساس کے سوا۔

"کیا کہہ رہے تھے تم؟"

"آج تھرمس میں رکھ دوں آپ کا جوس؟"

"رکھ دو۔"

میں نے دیکھا وہ جواب سن کر بھی گیا نہیں، وہیں کھڑا رہا۔

"کیوں؟"

"آپ بھی کہہ رہی ہیں تو... مجھے کہیں جانا ہے، لوٹنے میں دیر ہو سکتی ہے۔"

"کہاں جانا ہے؟"

وہ چپ رہا، میرے اٹھے ہوئے سوالیہ چہرے کو نظرانداز کرتا۔

"کہاں جا رہے؟" اب تک میرے اندر ایک چالاک بزدل پنجوں کے بل کھڑا ہو چکا تھا۔

وہ پہلے تو چپ سادھے رہا، پھر بولا۔ "مجھے جانا ہے... سیٹھ نے بلایا ہے... ساڑھے گیارہ بجے--- پھر چھٹی---"

"کون سا سیٹھ؟"

"وہی فیکٹری والا۔ اس کے یہاں ایک ڈرائیور کی جگہ خالی ہے--- شروع میں پانچ سو دینے کو کہتا

ہے۔۔۔

تمہیں معلوم ہے وہاں دن رات کی جاگری۔۔۔ دالان کو کٹتے گئے میرے اپنے لفظ میرے سامنے ہی کھوکھلے ہوئے تھے۔ وہاں یا کہیں بھی، کوئی دن یا کوئی رات تو ہوتی ہوگی۔ یہاں تو۔۔۔ پارٹیوں کے دور سے دن چلتے ہیں، اور رات کے کسی نہ ختم ہونے کا بوجھ پوٹھوں پر چپکا ملتا ہے۔

وہ سب ٹھیک ہے پر۔۔۔ اس نے نرمی سی برتی۔

پندرہ یا بیس دن پہلے یہ ذکر چھڑا تھا اور فیصلہ ہوا تھا کہ جب ہم نے تین سو روپے ڈپو کرا کے ڈرائیور کی ٹریننگ دلوائی ہے پر وہ ابھی کہیں بھی ڈرائیور کی نوکری نہیں ڈھونڈے گا۔ اس کی چل چل جو کسی ہوتی ہوئی حیثیت چپ چاپ ہمارے فیصلوں کا انتظار کرے گی۔ وہ فی الحال کچھ نہیں کرے گا جس سے چٹان کی نوک پر ٹکی ہماری گرہستی کا پیر پھسل جائے۔

دراصل اسد کی ڈرائیونگ کی ٹریننگ ٹرپ طے ہوئی تھی۔ بچوں کے امتحان تھے۔ میرا ماؤں بیچ میں کہیں لٹک رہا تھا۔ یہ ذمے داری میں ہی اٹھا سکتی تھی، ایسی یا پہلے بچوں کی بھی۔ سب کی مہارت اور نرمی سے دھوتے تھے۔ بچوں کو اچھے شہری بنانے اور مجھے جمالیاتک بہار سے دینے کی مہم میں وہ ایک ضروری رشتہ تھا۔ ہمارے خوابوں اور ارادوں کو ہمارے قریب سے قریب تر رکھنے میں اس کا حصہ سب سے بڑا تھا۔ وہ ایک ان گڑھ پتھر تھا، ہم نے ان تمام برسوں میں جسے تراشنے میں کامیاب ہو چکے تھے، جسے ہم ہیرے کی سی تراش خراش دے رہے تھے، ترقی دے رہے تھے، اس کو اعلیٰ کی چوٹی تک لے جا کر۔

وہ بات ہم نے تمہیں سمجھا نہیں دی ایک بار؟

ہم نے اسے سمجھایا تھا کہ ہم اسے یہ ہر سکھ بھی دیں گے اور سو روپے بڑھا کر اپنے ہی سے مثال گھر میں کھپا بھی لیں گے۔

اس سوال کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تاثرات سے بس اتنا جتا دیا کہ یہ بات وہ سمجھانے نہ سمجھا پائے گا۔ اس کے کھڑے ہونے کے تناؤ میں ایک رونی سی ہوئی، ضد بھری ڈھٹائی تھی۔

ابھی جاؤ۔۔۔ پھر کبھی اطمینان سے سوچ دیکھیں گے۔

وہیں بجے رہنا اس بات کا جواب دے گیا، بغیر بولے۔

میں نے کہا، پھر دیکھیں گے۔ میں گھبرائی نہیں تھی۔ مجھے بھروسہ تھا کہ جو کچھ اب تک ہوا ہے اب بھی ہو سکے گا۔ وہ ٹل جائے گا کیوں کہ اب تک وہ خاصا پالتو ہو چکا ہے۔ ہم اس کی وفاداری کو ایک طرح سے خرید چکے ہیں۔ سائیکل سیکھتے وقت پیر میں آئی چوٹ میں اس کی دیکھ بھال کر کے، اس کے باپ کی بیماری میں دوا دارو کے لیے بیشتر روپے کا منی آرڈر بھجوا کر۔ ہم اسے یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ اس کی ماں کو اس وقت دوا کی نہیں ان پیسوں کی زیادہ ضرورت ہے۔ ہمیں یقین تھا ہم نے اسے خرید لیا ہے، کچھ بھٹی پرانی پینٹوں اور قمیصوں کے ذریعے سفید پوشی کا رتبہ دے کر، چاہے وہ

Scanned with CamScanner

رتبہ دے سکتا ہمیں بھی ایک سوچی مار کر، تو سمجھیے دوری کی مدد سے حاصل ہو پایا ہو۔ ہمارے خیال میں سب وہ پوری طرح ہمارا ہو گیا تھا--- ہمارا پنٹو--- پھر کیوں یہ---

ان کا وہ انداز--- یقیناً وہ کپڑے پر جمتی برف کی پھوار کی طرح نہیں تھی کہ اٹھا کر جھاڑ دیا جائے۔ آس پاس کہیں کچھ سخت جان سا مدد سے ٹھوس، میان میں چھپی تلوار کی طرح چمک دار اور چست۔

اس دن آپ ہی نے تو کہا تھا--- اس کی آواز ایک دم رومانسی سی ہو گئی تھی۔
کیا کہا تھا میں نے؟ میں پتا نہیں کیوں چونک گئی، پہلے ہی سے دھیانی میں کہے لفظوں کی قید سے بچنے کے لیے چوکنی۔
آپ نے کہا نہیں تھا کہ کسی کو بھی اپنے سے تسلی کر کے بیٹھ نہیں جانا چاہیے--- پنکی دیدی کو آپ---

بیج جو ہم نے بکھیرے تھے ان میں انکھوے پھوٹ آئے تھے۔ شام کو پودوں سے بتیاتے وقت وہ بھی مسرت کے پاس کہیں زمین پر بیٹھ جایا کرتا تھا، یا نہ بیٹھ پاتا تو کام کی رفتار ایک دم دھیمی کر دیتا--- اس کا کال دھرنا ہماری نظر میں غلط تھا پر صحیح غلط کے بیچ ڈولتی ہماری روشن خیالی سے جھٹک دینے میں سدا ناکام رہتی تھی۔

اس دن تنے ہوئے تیوروں کا عادی اس کا چہرہ کچا سا پڑ گیا تھا۔ تنے پٹھے سے نقوش اور بے مطلب لمبائی۔ بیس سال کی عمر میں بھی تنتے ہوئے بھولپن کو جتاتے اس کے موٹے ہونٹ۔ اس وقت وہ ایسے کھٹل بچے کی تصویر لگ رہا تھا جس کی ضد تو ہوتی ہے پر اس ضد کو سہہ جانے والا کوئی گھر نہیں ہوتا۔
اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے مجھے اس کے کپڑے اچانک بے حد گندے اور بد تر دکھنے لگے۔

"وہ جو کپڑے سلوا کر دیے تھے، وہ کیوں نہیں پہنتا؟
ایک عجیب قسم کی بے چینی اس کے رونگٹے پن سے آچپکی۔ اسے شاید پچھلی باتوں اور ان باتوں میں کوئی رشتہ نظر نہیں آیا تھا۔
گھر میں ہی ٹھیک ہیں، اس نے اپنی سلیٹی ملیشیا کی کھردری قمیص کو ذرا نیچے کھینچتے ہوئے کہا۔
ڈرائنگ سکول میں جانے کے لیے بھی پینٹ قمیص چاہیے ہوتی ہے۔ اس کی آواز ٹھٹکتے ہوئے پلٹ کر پھر اپنے ٹھکانے پر لوٹ آئی تھی۔
"پنکی دیدی کو آپ---"
کیا دیدی دیدی لگا رکھی ہے، میں جھلا گئی۔ پتا نہیں کتنی سمتوں سے آتی ہوا مجھے میرے سامنے بے بس کر رہی تھی۔ میں کیا چاہتی تھی--- اپنا حساب، اپنے کو اپنے آگے کی سیڑھی پار کر لینے

Scanned with CamScanner

کی کمزور مگر حقیقی کوشش۔۔۔ میری ہی باتوں کا جواب دے رہی۔۔۔ مجھے رلا رہی ہے۔۔۔ مجھے کھوکھلا کر رہی ہیں تھی۔۔۔ جب میں نے بھی آمد سے آخر اس نے ہاتھ بڑھا کر میری طرف ایک دل کا کنارہ پکڑ لیا۔۔۔

میں صاحب سے بات کروں گی۔ پتہ نہیں میں سے [illegible] جا رہا [illegible] [illegible] سی گئی تھی۔

نہیں، نہیں۔۔۔ صاحب سے نہیں۔۔۔ وہ [illegible] [illegible] جھٹکا سا تھا۔ [illegible] [illegible] سے نہیں۔ وہ نہیں جانے دیں گے۔۔۔ [illegible] نہیں۔ جب تک آپ [illegible] نہیں۔۔۔

[illegible] کی آنکھوں میں ایک عجیب جھلملاہٹ اتر آئی تھی۔ [illegible] کیا ہمیشہ۔۔۔ [illegible] نہیں۔۔۔ اسی طرح۔۔۔

اس نے اپنا سر دونوں ہتھیلیوں میں لے لیا تھا۔

تو کیا نوکری چھوڑنا چاہتا ہے۔۔۔ میرا مطلب ہے یہی نوکری؟

مجھے یقین تھا وہ ابھی [illegible] [illegible] کر دے گا۔ ایسی عزت والی نوکری اسے کہیں اور نہیں مل سکتی تھی جہاں بچوں کی طرح [illegible] کا واسطہ دے کر اسے کتنی ہی کمزور لمحوں میں جھکا دیا جاتا تھا۔

ہاں! اگر آپ غلط نہ سمجھیں۔۔۔ میں سچ کہتا ہوں، میں آپ سے سب پیسے چکا دوں گا۔۔۔ ایک ایک۔۔۔ جتنا بھی آپ نے میرے اوپر خرچ۔۔۔

اس کے کندھوں پر بھی گرمستی کا احساس مجھے [illegible] ایک سے نہیں کر لیا۔ پر جو جھلک مجھے سامنے دکھائی دی وہ دھوپ تھی۔ وہ کوئی کونپل نہیں تھی۔ ایک کھردری، [illegible] اور جڑ تھی۔۔۔ بہت اندر۔۔۔ تہہ سے جاتی ہی نہیں، پھیلتی ہی تھی۔ مٹی کے نیچے چپ چاپ [illegible] [illegible] رہتی ہے، پھر کسی بھی [illegible] مٹی کے نظام کو توڑ کر باہر نکلتی ہے۔

مجھے لگا جیسے میں [illegible] [illegible] تو کسی [illegible] [illegible] سمجھ رہی ہے۔ مگر [illegible] کی کیسے؟ میرے سامنے [illegible] [illegible] رنگ اڑے لگی نہیں اور [illegible] [illegible] سے اٹھتا، دم گھونٹتا ہوا دھواں۔۔۔ میں نے [illegible] [illegible] کو [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] نے کی کوشش کی تھی کہ [illegible] وجود [illegible] ہوتا ہے۔ حالات، مقام [illegible] [illegible] مطلب نہیں رکھتے۔ [illegible] [illegible] غریب ہے [illegible] قد کا وہی [illegible] رکھنے کی کوشش کی جائے۔ نہیں تو [illegible] بھی دیا ہیں۔ [illegible] کوئی حیثیت نہیں تھی۔۔۔ [illegible] بھی نہیں۔ جب شوہر ہو تو بھی نہیں (اس نے پنکی کو خاص طور پر سمجھایا تھا)۔ جب کہ [illegible] دوست ہو تو بھی نہیں۔۔۔

حیثیت [illegible] [illegible] سے کیا ہوتی ہے؟ پنکی نے کہتے ہوئے پوچھا تھا۔

[illegible] پر پانی [illegible] بیٹھے، [illegible] کو نہالے، [illegible] کی آنکھیں ایک دم چمک اٹھی تھیں۔

اپنے [illegible] [illegible] کیا [illegible] ہیں۔۔۔ کچھ کرتے ہیں۔۔۔ [illegible] صاحب؟

ہاں! میرا [illegible] پوری طرح اس کی طرف نہیں تھا۔ [illegible] [illegible] کی چمک کی جڑ کو میں نے ضرور

Scanned with CamScanner

دیکھ لیا ہوتا۔

میں تو کب کا سمجھ گیا۔ میری باہر جاتی پیٹھ سے کھلکھلاتے غرور سے کہے گئے یہ الفاظ ٹکرائے ضرور تھے، پر بجے نہیں تھے۔

دیکھا جائے تو وہ کچھ غلط نہیں سمجھ رہا تھا۔ مگر اس کا یہ سب سمجھ جانا ہی اس وقت میرے دماغ کو سن کر گیا تھا۔ اس وقت میں ریس سے نکل جانے اونچی حیثیت کے بارے میں نہیں، گھر کے ڈانواڈول ہوتے ہوئے توازن کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اپنے آدھے لکھے ناول کے بارے میں، بچی ببلو کے امتحانوں کے بارے میں، دیوالی پر پٹنہ سے آنے والے مہمانوں کے بارے میں۔۔۔

اس نے کتنے ہلکے سے جھٹکے سے میری محنت سے حاصل کی ہوئی حیثیت کو ہلا دیا تھا۔ کیا نام اس حیثیت اور ہستی کا ہے جو دوسروں کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر چلتی ہے اور اپنے ہی بنائے پنجروں میں خود قید ہوتی ہے۔۔۔

اس کا چہرہ اب تک بجھ گیا تھا۔۔۔ کچھ کچھ مایوس اور بے جواب۔

"تو آخر کیا چاہتا ہے؟" میری بے بسی اس پر جھنجلاہٹ بن کر اتری۔

وہ لمحہ بھر کو جھجکا۔ "آپ ہی بتا دیجیے نا، آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟"

یہ ایک طرح کا آمنا سامنا تھا۔ تنگ جنگ غیر متوقع، دیتا ہو سکنے کی حماقت سے بھرپور۔ دیکھا جائے تو حیثیت کا سوال یہیں طے ہو گیا تھا۔ جس کی کچھ حیثیت ہوتی ہے وہی دیتا ہے، دے پاتا ہے۔ حیثیت کے کنگال سے یہ امید ہی کہاں ہوتی ہے؟

"میں چاہتی ہوں، تو تھوڑے دن اور رک جا۔۔۔ تھوڑا ادھر سدھ جائے اور۔۔۔ اور۔۔۔ تب تک یہاں بھی۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ کوئی اور انتظام بھی ہو جائے گا۔۔۔ نہیں؟"

اس سوالیہ "نہیں؟" کی نوک پر میری ساری حیثیت اس وقت سمٹ کر بیٹھ گئی تھی، تھرتھراتی ہوئی۔

وہ بنا کچھ کہے باہر چلا گیا، پیر پٹکتا سا۔ میرے کان اس کے قدموں کی آہٹ کا پیچھا کر رہے تھے۔ ہاتھ کاغذ سرکا کر چپ بیٹھے تھے اپنے آپ۔

لمحے بھر میں رسوئی گھر میں برتنوں کی کھٹ پٹ سنائی دینے لگی تھی۔ مجھ سے پوچھے بنا تھوڑی ہی دیر میں وہ کافی کا کپ بنا کر میری ٹیبل پر رکھ گیا تھا۔

"سنو۔۔۔ ایک دو بسکٹ دے جاؤ۔" میں نے اس کے تیزی سے لوٹتے قدموں کی بے دلی کو سہج انداز سے کریدنا چاہا۔

بسکٹ لے کر حاضر ہوا تو میں نے اس کا چہرہ ٹٹولنا چاہا۔ پر وہ چہرہ سدھا تھا، ان بوجھا اور اداس۔

Scanned with CamScanner

دن دیر میں رسوئی گھر کا ڈش دھلنے کی آواز آنے لگی، پھر جھاڑو لگنے کی۔ پھر کھانا بنانے لگنے کی۔ دوپہر تک وہ مجھے کافی پرسکون دکھنے لگا، تک بھگت کر۔

شام کو بچوں کے سیشن میں وہ بیچ پر بیٹھ، دور دور سے تک ٹک کر دیکھتا رہا۔ کئی بار اس کے اندر سے کچھ بولنے کا ارادہ سا لگا، مگر روز کی طرح کوئی سوال سامنے نہ آیا۔ سوال کرنے میں وہ روز ہی زیادہ شوق دکھاتا تھا۔ کلاس میں پڑھنے والے بچے تو ہمیشہ پیچھے ہی رہ کر، مسکرا کر بیٹھے رہتے تھے۔

مجھے شک رہا تھا وہ کسی نہ کسی طرح کچھ پھر اگر یہ بات ضرور پوچھے گا کہ وہی بات وشکی کے لیے، بھو کے لیے، میرے لیے، ہر کسی کے لیے ضروری اور اس کے لیے غیر ضروری کیوں ہے۔ پر۔۔۔

پر یہ تو اچھا ہی تھا کہ وہ سب کچھ گم ہو کر دیکھ رہا تھا اور سوال پوچھنے کے شوق سے پوری طرح خالی لگ رہا تھا۔

**

# سودیش دیپک

ہندی سے ترجمہ: ازہا علوی

## تماشا

وہ ادھیڑ عمر آدمی بڑی دیر سے کسی سایہ دار پیڑ کی تلاش میں ہے۔ اس کا آٹھ سال کا لڑکا بڑے ہلکے ہلکے قدموں سے باپ کے پیچھے چل رہا ہے۔ اس کے گلے میں ایک چھوٹا سا ڈھول پڑا ہوا ہے جسے وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہتھیلیوں سے پیٹتا ہے۔ جب بھی کوئی پیڑ نظر آتا ہے، وہ بڑی ترستی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا ہے: شاید باپو اس کے نیچے ٹھہر جائے۔ لیکن نہیں، پیڑ بڑا ہے تو سایہ دار نہیں۔ اگر سایہ دار ہے تو چھوٹا ہے، مجمع لگانے لائق نہیں۔ باپ نے سر پر بڑی سی پگڑی باندھ رکھی ہے۔ اس کے لٹکتے ہوئے سرے سے وہ بار بار منھ اور گردن پونچھتا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے لڑکوں کا ایک جھنڈ چلا آ رہا ہے۔ باپ بار بار پیچھا کرتے لڑکوں کو دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ کھیل تماشا دیکھنے والے یہ چھوٹے چھوٹے تماشائی ہی بھیڑ بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔

ابھی صبح کے دس ہی بجے ہیں، لیکن سورج، گرمیوں کا سورج، فوج کے کسی ہراول دستے کے سپہ سالار کی طرح اوپر چھلانگ لگا کر چڑھ آیا ہے۔ سورج چاروں طرف بڑی دیر سے تیکھی اور گرم کرنوں کی برچھیاں اور کرچیں برسا رہا ہے۔ چھوٹے لڑکے کے گلے میں پڑی ڈھول کی رسی پسینے سے بھیگ گئی ہے اور اس کی گردن میں اور سینے میں خارش پیدا کر رہی ہے۔ اس کے گال پچکے ہوئے ہیں اور سر کے باریک، مشین کے کٹے، چھوٹے چھوٹے بال خاردار جھاڑیوں کی طرح کھڑے ہیں۔ سورج کی بے رحم گرمی نے اسے بھون ڈالا ہے، جھلس ڈالا ہے۔ پچھلے کئی منٹوں سے اس نے ڈھول پر تھاپ نہیں دی ہے۔ باپ کسی جنگلی سور کی طرح گردن کو تھوڑا ٹیڑھا کرتا ہے اور تیکھی آواز میں کہتا ہے: ڈھول تیرا باپ بجائے گا کیا؟

بڑی مشینی حرکت سے لڑکا دونوں ہاتھوں سے ڈھول کو پیٹنا شروع کر دیتا ہے۔ سپہ سالار سورج

Scanned with CamScanner

اس چھوٹے سے مقام سے ہی تو وار سہہ کر تھوڑا اور اوپر اٹھ آتا ہے، حملہ آور کی طرح، لڑکے کے چہرے کے بال سامنے، تیز، چمک دار، دہکتے ہوئے شعلوں کی طرح۔

سامنے پیپل کا ایک بڑا سا پیڑ ہے۔ اس کے آس پاس کچھ ریڑھی والے ہیں، کچھ کھوکھے اور چند پکی دکانیں۔ باپ کے قدموں کو اس طرف بڑھتا دیکھ کر لڑکے کی بجھتی ہوئی سی آنکھیں آخری فیصلہ کرتی ہیں اور وہ چھوٹی سی دوڑ لگا کر باپ سے آگے نکل جاتا ہے۔ پیڑ کے نیچے پہنچتے پہنچتے وہ گلے میں پڑا ڈھول اتار دیتا ہے اور پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر تیزی سے جلدی جلدی سانس لیتا ہے۔ پیچھے آتا بچوں کا غول اب اس کے آس پاس گھیرا ڈال کر کھڑا ہے۔ لیکن وہ کسی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ یہ تو اس کی زندگی میں روز ہی ہوتا ہے۔ آنے والے تماشے کے سارے منظر اور ان کے کٹے ہوئے ٹکڑے اس کے دماغ میں پہلے ہی سے موجود ہیں، اس لیے وہ دوسرے لڑکوں کی طرح سے اس تماشے کے لیے کوئی بے تابی ہے اور نہ اس میں کوئی لطف ہے۔ اب وہ پپڑی جمے ہونٹوں پر بار بار زبان پھیر رہا ہے اور کسی ڈرے ہوئے چوہے کی طرح گردن موڑ کر ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ کہیں کوئی نل یا پمپ دکھائی نہیں دیتا۔ باپ کی طرف دیکھتا ہے؛ وہ ریڑھی کی گٹھری کو کھول رہا ہے، تماشے کا سامان باہر نکالتا ہے۔ باپ سے پانی کے لیے کہے یا نہ کہے۔ پھر وہ باپ سے کچھ نہ کہنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ چولہے میں جلتی لکڑی، باپ کا اسے کھینچ کر مارنا تھا، اور ہوا میں اپنے بچاؤ کے لیے اٹھے ہوئے ماں کے دونوں ہاتھ — یہ سارے کے سارے نظارے منظر اس کے ذہن پر نقش ہیں اور اسے خوف زدہ کر دیتے ہیں۔

باپ نے پیڑ کے نیچے سفید چادر بچھا دی ہے۔ لڑکے کی طرف اس کی پیٹھ ہے لیکن اسے صاف محسوس ہوتا ہے کہ دو بھوری چھوٹی آنکھیں اس کی پیٹھ میں سوراخ کیے ڈال رہی ہیں۔ کسی جانور کی طرح آس پاس سے خطرے کا عادی ہونے، کسی کی موجودگی کو محسوس ہونے کی صلاحیت، اس کی گردن کو لڑکے کی طرف موڑ دیتی ہے۔

کیسے گدھوں کی طرح بیٹھا ہے۔ باپ دہاڑ رہا ہے کیا؟ ہیں؟ تو اسے ان چادر پر بٹھا!

اس کی تیز آواز سن کر آس پاس کھڑے لڑکے سہم کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

پا...نی پینا ہے۔ (پانی پینا ہے۔)

تو جا، جا کر پی لے۔ کسی ریڑھی والے سے مانگ لے۔ تیرا باپ کنواں کھدوا گیا ہے؟ حرام زادی ماں کی طرح نخرے کیا دکھاتا ہے؟

لڑکا کسی ذلیل کتے کی طرح کمر کا سارا زور ٹانگوں پر ڈالتا ہے۔ دھیرے دھیرے چلتی کسی قیدی کی طرح اس کا [illegible] گڈوں میں ہلتا ہے اور وہ پاس کھڑی کلیوں پھولوں کی ریڑھی کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ اسے یاد آتا ہے کہ ماں نے یہ بجتے پانچ روپے میں پیتل کا یہ [illegible] بوڑھے مداری سے خریدا تھا۔ بار بار ہاتھ لگنے سے اس کے [illegible] بال جھڑتے ہیں، سوکھے ہوئے جبڑوں میں سے تیر جیسے دانت باہر نکل آئے ہیں، آنکھوں کی جگہ بیج بو رہے ہیں جو ایک عجیب سی بیماری سے اسے گھور رہے ہیں۔ پیتل کا ادھ منہ کھلا

Scanned with CamScanner

ہے۔ اُس کی نگاہ اس اندھیری وادی کی طرف اٹھ جاتی ہے اور گھروالی کا بیمار لیکن غصے سے بھرا ہوا چہرہ غراتا ہے، دبا بیٹھا ہے اور اُس کی طرف جھپٹ پڑنے کے لیے چھلانگ لگاتا ہے۔ وہ ڈر گیا ہے۔ جھٹکے کے ساتھ مرے ہوئے سر کو سفید چادر کے نیچے رکھ دیتا ہے۔ چولہے میں سے کھینچی ہوئی جلتی لمبی لکڑی اور اپنے بچاؤ کے لیے اٹھتے گھروالی کے دونوں ہاتھ چیتے کے منھ سے نکل کر اُس پر حملہ کر دیتے ہیں۔

اس شہر میں آئے ہوئے انھیں تین دن ہو گئے ہیں۔ شہر سے باہر بڑی سڑک کے کنارے اُس نے اپنا تمبو تانا۔ چھوٹا لڑکا آس پاس گھوم کر سوکھی ٹہنیاں چن لایا تھا۔ گھروالی چار اینٹوں کا چولہا تمبو کے باہر بنا لیتی ہے۔ وہ بیٹھا چلم پی کر تھکن اتارتا ہے۔ گھر کی کل کائنات۔۔۔ لوہے کا بڑا سا ٹرنک، تماشا دکھانے کا سامان اور جانوروں کے کٹے ہوئے سر۔۔۔ یہ سب کچھ اٹھا کر اسے پیدل چلنا ہوتا ہے۔ اس لیے تمبو تاننے کے بعد وہ دوسرا کوئی کام نہیں کرتا۔ گھر کے تینوں افراد کا کام بٹا ہوا ہے۔

اُس کی، اُس کے لڑکے اور گھروالی کی زندگی شہر شہر پھیری لگاتے ہوئے بیتی جا رہی ہے۔

مختلف شہروں میں تین چار بار تماشا دکھانے کے بعد انھیں اگلے سفر پر روانہ ہونا ہوتا ہے، کیوں کہ تماشائی بہت جلد ختم ہو جاتے ہیں۔ پچھلے کئی برسوں سے گھنٹوں گلا پھاڑنے کے باوجود، چھوٹے چھوٹے کرتب دکھانے کے بعد بھی، تینوں آدمیوں کا پیٹ بھرنا دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ لوگ شاید تماشا دیکھنے ہی کے لیے جیب میں ایک نیا پیسہ ڈال کر لاتے ہیں۔ اور پھر بھیڑ کو بھی گزرتے وقت نے چالاک اور زمانہ شناس بنا ڈالا ہے۔ سانپ اور نیولے کی لڑائی کے آخری منظر کے ساتھ تماشا ختم ہونا ہوتا ہے، لوگ اس موقعے کے آتے ہی دھیرے دھیرے کھسکنا شروع کر دیتے ہیں۔ بچے ہوئے چند لوگ بڑی بے دلی سے چند سکے پھینک کر اپنی راہ لیتے ہیں۔ اور اگلے دن کی بھوک کا دیو اُس کی گردن کو چابکوں کے بیچ دبوچ کر بیٹھ جاتا ہے۔ شہر شہر، بھوک اور خالی پیٹ کا سفر۔ بھوک کا یہ عفریت کسی بھی شہر میں دم نہیں لینے دیتا، کسی گھڑسوار کی طرح لوہے کے نوک دار جوتے سے مسلسل ایڑ لگاتا رہتا ہے۔

پہلی شام گھروالی نے لوہے کا ٹرنک کھولا۔ چھوٹی سی پوٹلی باہر نکالی۔ اسے کھولا تو صرف پاؤ بھر آٹا نکلا۔ دو دو روٹیاں اُن کے حصے میں آئیں اور ایک لڑکے کے۔ اُس نے چار نوالوں میں روٹی ختم کر دی، ماں کو گھور کر دیکھا اور بولا:

"روٹی اور دے!"

"بس ختم۔ اپنے حصے کی تو نے کھا لی۔"

"نہیں ابھی بھوکا ہوں۔ اور کھاؤں گا۔"

"بک بک مت کر۔ سنتا نہیں؟ روٹی ختم ہے۔"

لڑکا ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کوئی چیز اٹھا کر ماں کو مارنا چاہتا تھا، لیکن باپ کی گھورتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر اُس نے ارادہ بدل دیا۔ وہ تمبو کے باہر آ گیا۔ اناج کی خوشبو پا کر ایک مریل سا کتا منتظر آنکھیں لیے تمبو کے ساتھ آ بیٹھا۔ لڑکا دبے پاؤں کتے کے پاس سے گزرا۔ تھوڑی دور جا کر اُس نے پلٹ

کا ایک چوکور ٹکڑا تلاش کر لیا۔ تو ہوا میں لہرا کر وہ بار نشانہ لگایا، پھر پوری طاقت سے اینٹ کا ٹکڑا کتے کی گردن پر دے مارا۔ بچپن بچپن کی آواز کے ساتھ کتا چھٹتا ہوا وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ دور جا کر بھی اس کی طرف منہ کر کے، ماحول کو بوجھل کرتا رہا۔ لڑکے کا غصہ اور بھوک دونوں ختم ہو گئے ہیں۔ اُن کے شعور میں اس وقت نہ کتا ہے، نہ وہ جس کی گردن پر روٹی ... دیے کے ترحم میں بدل جاتا ہے۔

صبح ہونے پر گھر والی نے ٹرنک کے کونے سے ایک میلا کچیلا نوٹ نکال کر اسے دیا۔ آٹا لانے کو کہا۔ وہ شہر کی طرف چل پڑا۔ کیسے دن آ گئے ہیں! وہ چھوٹا تھا تو گھوڑا [illegible] کر کے مداری باپ کے ساتھ جایا کرتا تھا، تماشا دکھاتے۔ لوگ تماشا دیکھتے تھے اور بڑھی [illegible] کے سکے پھینکتے تھے۔ اُسے آج بھی یاد ہے، سفید چادر [illegible] سکوں سے مٹ جایا کرتی تھی۔ وہ بھی پر باپ اسے [illegible] نئی روٹیاں خرید کر دیا کرتا تھا اور خود شراب پی کر بستی کے [illegible] میں ایک [illegible] دکان پر [illegible] کر [illegible] گایا کرتا تھا۔ اور اب؟ آٹے کے لیے پیسے پورے نہیں پڑتے، لڑکا اور روٹی مانگتا ہے، گھر والی طعنے دیتی ہے، گالیاں دیتی ہے اور وہ اسے پیٹتا ہے۔

بازار میں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ سارے شہر کی ساری دکانیں خالی پڑی ہیں۔ کہیں کوئی گاہک دکھائی نہیں دیتا۔ خریدنے کے لیے لوگوں کے پاس کچھ بچتا ہی نہیں۔ پھٹے میلے کپڑوں، تیل چپڑے بالوں اور پچکے گالوں ہونے کی وجہ سے اسے ہمیشہ دکانوں میں گھسنے سے ڈر لگتا ہے۔ وہ اب تک بازار کے تین چکر کاٹ چکا ہے۔ کسی سے آٹے کی دکان کا پتا پوچھتے ہوئے ڈر رہا ہے۔ آخر ہمت کر کے ایک رکشہ والے کے پاس ٹھہرتا ہے۔

آٹا کہاں ملے گا؟

کیا کہا، آٹا؟ تو سالی، اپنا راستہ پکڑ! کیوں سویرے سویرے نحوست کرتا ہے

اسے بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ آٹا خریدنے کی بات کو یہ آدمی نحوست کیوں کہہ رہا ہے؟ لوگوں کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟ رکشہ والا بجھی ہوئی بیڑی کو پھر سے جلاتا ہے، اُس کے چہرے پر چھائی پریشانی اور بدحواسی کو دیکھتے ہوئے وہ دھوئیں سے بیڑی کا ایک سرا کاٹ کر رکھتا ہے: اس شہر میں آٹا نہیں ملتا۔ اب وہ سخت گھبرا کر رکشہ والے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ سوچ رہا ہے، کیا ہو گیا ہے۔ غریب کی غربت کا مذاق اُڑانے کا مزہ ہے اور وہ ہاں گیا۔ سر جھکائے کھڑا ہو رہا۔ رکشہ والا جھٹکے سے بیڑی سڑک کے بیچ پھینک کر کہتا ہے:

سالی، میں سچ کہہ رہا ہوں ... تمہیں کسی بھی دکان پر آٹا نہیں مل سکتا۔ آٹا، چینی اور گیہوں خریدنے کا کام اب سرکار کے ہاتھوں میں ہے۔ ہاں، اگلی گلی کے اندر مڑ جاؤ۔ سرکاری راشن کی دکان ہے۔ قسمت ہوگی تو مل جائے گا۔'

وہ بے کوئی جواب دیے سیدھا گلی کے اندر مڑ جاتا ہے۔ دکان سامنے ہی ہے، لیکن بہت لمبی لائن ہے۔ وہ بھی لائن میں لگ جاتا ہے۔ لوگوں کے چہروں پر، تپتی گرمی میں انتظار کرنے پر بھی کہیں غصہ یا

Scanned with CamScanner

بے چینی نہیں۔ صبر اور اطمینان تو غریب لوگوں کا گن ہی ہے۔ لگ بھگ دو گھنٹے بعد وہ دکان کی دہلیز پر پاؤں رکھ پاتا ہے۔ دکان دار اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہتا ہے: "کارڈ؟"

وہ چونک پڑتا ہے۔ خوف زدہ ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ پھر روپے کا نوٹ نکال کر آگے بڑھاتا ہے۔

"او بے پہلے کارڈ دے!"

"کارڈ؟ کارڈ؟ میرے پاس نہیں۔"

دکان دار پہلے ہی سے جھلایا بیٹھا ہے۔ تیکھی آواز میں کہتا ہے: "چل ہٹ، نکل باہر! سرکاری دکان ہے سرکاری!" جانے میں منہ اٹھائے۔ پرے ہٹ، اوروں کو آنے دے۔ یہاں آٹا واٹا نہیں ہے۔

اس کے پیچھے لائن میں لگے لوگ بے چین ہو رہے ہیں۔ وہ نظر گھما کر چاروں طرف مدد کے لیے دیکھتا ہے، لیکن اس کی نظر پڑتے ہی لوگ دوسری طرف منہ پھیر لیتے ہیں، جیسے انھیں پتا ہو کہ وہ سب کوئی پاپ کر رہے ہیں۔ اور تب اسے اپنی گھروالی اور لڑکے کے خالی پیٹ کا دھیان آیا۔ امید ٹوٹ جانے تو خوف بھی جاتا رہتا ہے۔ وہ ویسے بھی غصیلی طبیعت کا آدمی ہے۔ اب وہ سورج کی تیز گرمی، دو گھنٹے کے انتظار، سرکاری راشن کی دکان، ان سب سے بدمزہ ہو کر لڑنے پر اتر آیا ہے۔ تماشا کرنے میں لگاتار ہونے کی وجہ سے ویسے بھی اس کی آواز اونچی ہے۔ وہ ہاتھ جھٹکا کر کہتا ہے:

"نہیں دے گا؟ کیسے نہیں دے گا؟ تیرے باپ کی دکان ہے کیا؟ سالے، سرکاری دکان ہے! سرکار کس کی ہے؟ تیرے باپ دادا کی؟ ایک روپے کا آٹا تول دے۔ نہیں تو لو اسپتال بھیجے گا اور نہیں جیل۔"

دکان دار سکڑ کر پیچھے ہو گیا ہے۔ لوگ اب اس کی مدد کو بڑھ آئے ہیں۔ کسی ہمدردی کی وجہ سے نہیں، اس ڈر سے کہ کہیں جھگڑا بڑھ گیا، دکان بند ہو گئی تو انھیں آج راشن نہیں ملے گا۔ ملی جلی آوازیں آتی ہیں:

"دے بھائی، تھوڑا سا آٹا دے دو۔ یہ بڑھو گنوار ہے، اسے کارڈ کا کیا پتا۔ لگتا ہے کئی دنوں کا بھوکا ہے۔ غریب کو کھانے کو دے تو تنگ آکر دنگا کرے گا۔ جی ہاں، خون خرابا کرے گا..."

دکان دار نے روپیہ لے کر اسے تھوڑا سا آٹا دے دیا۔ وہ دوپہر بعد گھر پہنچا۔ گھر والی نے روٹیاں بنائیں، تینوں نے چپ چاپ کھا لیں۔ اگلے دن کی بھوک کا دیو پیچھے کی طرف سے چھلانگ لگا کر پھر اس کی گردن پر سوار ہو گیا۔ صبح اٹھ کر اس نے بجانے کا سارا سامان اکٹھا کر، شروع کر دیا۔ لڑکا چپ لیٹا باپ کو کام کرتے دیکھ رہا ہے۔ کبھی کبھی وہ ٹھنڈے چولہے کی طرف بھی دیکھ لیتا ہے۔ ماں اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھ جاتی ہے۔ ٹرنک کے کونے سے دو کاغذ کی پڑیاں نکالتی ہے۔ ایک میں چینی ہے اور دوسری میں تھوڑی سی چائے کی پتی۔ وہ چولہا جلا کر بے چینی کی چائے بناتی ہے اور پیتل کے گلاسوں میں ڈال کر

Scanned with CamScanner

باپ بیٹے کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ باپ گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرنا شروع کر دیتا ہے۔ بیٹا گلاس کی طرف ہاتھ تک نہیں بڑھاتا۔

"اب کیا منتر پڑھ رہا ہے؟ چائے پی۔ کام پر چلنا ہے۔"

"نہیں جاؤں ہے۔ میں روٹی کھا ری ہے۔ (نہیں جانا ہے مجھے روٹی کھانی ہے۔)"

"تو سیدھی طرح اٹھتا ہے کہ کروں چھترول؟"

"نہیں جاتا۔ نہیں جاتا۔" اور لڑکے نے ہاتھ مار کر چائے نیچے گرا دی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر لڑکے کے گلے میں پھندا پھنسا دیا اور دوسرے ہاتھ سے اُسے بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا۔ گھر والی نے جھپٹ کر اُسے دھکا دیا اور لڑکے کو اپنی پیٹھ کے پیچھے کر لیا۔

"کسی نے کو روٹی نہیں رکھتا اور اوپر سے قسائیوں کی طرح لڑکے کو پیٹ رہا ہے۔ اتنا ہی شیر ہے تو ڈال کہیں ڈاکا۔ کاٹ لے کسی کی گردن۔ دے دے ہم دونوں کو زہر۔"

"میں کہتا ہوں پرے ہٹ جا! میں اس حرام کے بیج کی ساری اکڑ نکال دوں گا۔ دیکھوں کیسے نہیں جاتا کام پر۔"

"نہیں جاتی، نہیں جاتی۔ کر لے جو کرنا ہے۔"

اور پھر ہوتے ہوتے بیٹے کے سر سے جیسے بیچ کا منظر نظر آیا۔ جلتا چولہا، جلتی ہوئی لکڑی کو کھینچتا ہوا اس کا ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ گھر والی نے دونوں ہاتھ روکنے کے لیے اوپر اٹھا دیے۔ ہاتھوں کے گھیرے کو توڑ کر گھر والی کے ماتھے یا گال پر لکڑی کا وار۔ لمبی چیخ۔ لڑکے کا چپ چاپ کام کے لیے ساتھ نکل پڑنا۔ بھیڑ کا گھیرا، آس پاس کھڑی ہوئی بھیڑ اور گھومتا ہوا وہ بھیڑیے کا سر۔

اب تک بیاسی سات آدمی گھیرا ڈال کر کھڑے ہو چکے ہیں۔ اس نے زمین میں ایک لمبی سی کیل گاڑ کر ٹوکری میں سے نیولا نکال کر رسی سے کیل کے ساتھ باندھ دیا۔ نیولا چھوٹے سے دائرے میں گھومتا ہے۔ پھر کر سب طرف گھور گھور دیکھتا ہے۔ آگے بیٹھے لڑکوں میں سے کوئی شی کی آواز کرتا ہے اور نیولا پھر چھوٹے سے دائرے میں بے تحاشا گھومنا شروع کر دیتا ہے۔ لوگ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ دوسری چھوٹی ٹوکری میں سانپ بند ہے۔ ان کے چہروں پر موہوم سی خوشی کی جھلک دوڑ جاتی ہے۔ تو سانپ نیولے کی لڑائی دیکھنے کو ملے گی۔

لیکن تماشا شروع ہونے سے پہلے ایک سپاہی بھیڑ کو چیرتا ہوا اُس کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔

"چل اُٹھا یہاں سے اپنا ڈنڈا! سالے، باپ کی سڑک سمجھ رکھی ہے کیا؟ سارا ٹریفک روک رکھا ہے۔"

بھیڑ سے طرح طرح کی آوازیں آتی ہیں:

"ابی غریب آدمی ہے۔ چھوڑ دو۔ بچارے کو روٹی کے لیے پیسہ کما لینے دو!"

پولیس والے کا مجمع لگانے سے روکنا اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ وہ بھیڑ کے شور شرابے

Scanned with CamScanner

کے بیچ ایک روپے میں سپاہی سے سودا پٹا لیتا ہے۔ سپاہی سب سے آگے وی آئی پی کی جگہ حاصل کر کے کھڑا ہو جاتا ہے۔

وہ اپنی جیب سے میلا تاش نکال کر پتا چھپانے اور بتانے کا کھیل شروع کرتا ہے، لیکن لوگ اس کھیل کو دیکھنے میں کسی دلچسپی اور شوق کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ ایک موٹی آواز چیختی ہے: "استاد، چھوڑ یہ چالاکیاں! تیرے سے اچھا تاش کا کھیل میں دکھا سکتا ہوں۔ کوئی نیا جوش پیدا کر، نیا!"

اس کا لڑکا بھی ڈھول پیٹ کر، کبھی سر کے بل زمین پر کھڑا ہو کر، لمبی لمبی چھلانگیں لگاتے ہوئے، بھیڑ کے لیے زیادہ تفریح کا سامان پیدا کر رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بھیڑ کے لیے ان پرانے کھیلوں میں اب کوئی کشش نہیں ہے۔ سب لوگ تھوڑا سا خون بہتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک کہیں کہیں کرتی بانسری نما آواز گونجتی ہے:

"استاد، لڑائی دکھا دے۔ دیکھ، شام ڈھل رہی ہے۔ چھوٹے چھوٹے چٹکلے چھوڑ!"

وہ سانپ والی ٹوکری پر سے ڈھکن اٹھاتا ہے۔ سانپ پھر بھی ہلتا نہیں۔ وہ لمبی سی چھڑی کا ٹہوکا مار کر سانپ کو ہلاتا ہے۔ سانپ دھیرے دھیرے رینگ کر ٹوکری سے باہر آ گیا ہے۔ وہ آواز لگاتا ہے:

"مائی باپ، اب میں آپ لوگوں کو سانپ نیولے کی لڑائی دکھاتا ہوں! مائی باپ، بھگوان سب کچھ کر سکتا ہے۔ مائی باپ، دیکھنا دونوں کیسے ایک دوسرے کو نگلیں گے۔ مائی باپ، بولو ایک بار سب مل کر۔۔۔ جے شنکر کی!"

بھیڑ نے ایک آواز میں جواب دیا: "جے شنکر کی!"

سانپ نیولے کے پاس جانے سے گھبرا رہا ہے۔ نیولا بھی اچھل کر رسی تڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔ آواز ابھرتی ہے:

"سالا ڈرتا ہے!"

"ابھی جان کسی کو پیاری نہیں ہوتی!"

"ارے بھائی، سانپ کو ذرا آگے کھسکاؤ نا!"

وہ چھڑی سے سانپ کو اور آگے کرتا ہے۔ اس وقت اسے بڑی پھرتی سے کام لینا ہے۔ نیولے کا منہ سانپ پر پڑتے ہی ان دونوں کو الگ کر دینا ہے۔ ورنہ نیولا سانپ کو مار ڈالے گا، اور نیا سانپ خریدنے کے پیسے اس کے پاس نہیں ہیں۔ نیولے نے چھوٹا سا منہ کھول کر سانپ کی دُم میں دانت گڑو دیے ہیں۔ سانپ تڑپ رہا ہے۔ وہ نیولے کی پیٹھ پر چھڑی مار کر دونوں کو الگ کر دیتا ہے۔

بھیڑ میں شور مچ جاتا ہے: "یہ چالاکی ہے! ابھی ان کی لڑائی شروع نہیں ہوئی۔ سانپ کو پھر سے نیولے کے پاس چھوڑو!"

"ہمارا پیسا کوئی حرام کا نہیں!"

"استاد، پوری لڑائی ہونے دو۔ میں ایک روپیا دوں گا۔"

Scanned with CamScanner

اس نے سوچیں ادوی تھا، ہاتھ اوپر، ہاتھ میں پکڑا نوٹ دیکھ لیا ہے۔ وہ مجمع کے موڈ کو سمجھ رہا ہے۔ یہ لوگ پیسہ بھی آسانی سے دینے والے نہیں۔ اس نے سانپ کو نیولے کے پاس پھینک دیا۔ اس بار نیولے نے پہلے ہی جھٹکے میں سانپ کا منہ پکڑ لیا ہے۔ خون کی چھوٹی چھوٹی بوندیں سانپ کے منہ پر چمک اٹھی ہیں۔ سانپ تڑپ رہا ہے۔

نیولا لگاتار ایک دائرے میں دوڑ رہا ہے۔ وہ سانپ کو چھڑانے کے لیے نیولے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ مجمع جوش میں آگیا ہے۔

مر گیا!

نیولا سالا غضب کا ہے!

دیکھو کیسے سانپ کی گردن پکڑ رکھی ہے!

استاد چھڑا دو، نہیں تو سانپ گیا تمہارا!

اس نے ہاتھ اوپر اٹھایا۔ نیولے کی گردن پر چھڑی ماری۔ لیکن نہیں، مجمع میں نیولا تھوڑا آگے نکل چکا ہے۔ چھڑی زور سے نیولے کی کمر پر پڑی ہے۔ چٹاخ کی آواز کے ساتھ اس کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ نیولا تین چار بار تڑپا اور پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ مرنے کے بعد اس کے دانت ابھی بھی سانپ کی گردن پر کسے ہیں۔ اب سانپ نے بھی تڑپنا بند کر دیا ہے۔ ہوا میں ایک روپے کے نوٹ کے ساتھ ہاتھ ہوا میں ہل رہا تھا۔ اب مجمع بے تاب ہو چکا ہے۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیچ بیٹھا ہے۔ مجمع نے تھوڑے سے سکے چادر پر پھینک دیے ہیں۔ اس کی نگاہ سپاہی پر پڑتی ہے۔ سپاہی کی آنکھیں چادر پر پڑی ریزگاری کو گن کر ایک روپے کے نوٹ میں بدل رہی ہیں۔ وہ ہاتھ بڑھا لیتا ہے۔ اس کے حصے میں سپاہی کو پیسے دینے کے بعد آٹھ آنا شاید ہی پڑے۔

مہربان، قدر دان! یہ مال کا کمال اپنی جگہ ہے۔ لیکن اصلی کھیل باقی ہے!

وہ پیٹی کمر میں محسوس ہوتا چاقو باہر نکال لیتا ہے۔ سورج کی روشنی میں چار انچ لمبا پھل چمک اٹھتا ہے۔ وہ جمل قمیص ... ڈال رہا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو پیٹنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کا پیٹ کسی خالی گھڑے کی طرح گڑ گڑ کی آواز کے ساتھ بج رہا ہے۔

مائی باپ، پیٹ کا سوال ہے! اب میں اپنے لڑکے، اپنے لڑکے کے پیٹ میں جا کر گھونپ دوں گا۔ مائی باپ، کوئی بڑی بات نہیں؟ مائی باپ، میرے لڑکے کی زندگی کا سوال ہے۔ آپ بیٹھے تو دم ماریے گا۔ میں منتر سے ہی کالی کو تیار کروں گا۔ آپ دیکھیں گے۔ لڑکے کے پیٹ سے خون کے فوارے نکلیں گے۔ لیکن کالی کی کرپا سے وہ مرے گا نہیں۔ کوئی مرے، نہیں تو میرے لڑکے کا خون اس کی گردن پر ہوگا۔

اب مجمع ڈر گیا ہے۔ وہ جے ماتا کی، جے ماتا کی کہتا ہوا گول دائرے میں دوڑ رہا ہے۔

لڑکا کہاں گیا؟ لڑکا کہاں گیا؟"

اب بھیڑ دھیان دیتی ہے کہ اس کا لڑکا وہاں سے کھسک گیا ہے۔ لیکن وہ جانتا ہے کہ لڑکا اس وقت ایک چھوٹی سی ٹنکی میں لال پانی بھر [illegible] ہے۔ پھر وہ اس لال پانی سے بھرے ہوئے غبارے کو پیٹ کے ساتھ باندھ لے گا۔ وہ چاقو کا ترچھا وار کرے گا۔ چاقو لال پانی سے بھرے غبارے میں کھب جائے گا۔ لوگ اس پانی کو خون سمجھ لیں گے۔ لڑکا ہمیشہ اس موقعے پر غائب ہو جاتا ہے۔ بھیڑ کے تناؤ اور خوف کو ٹوٹنے کی حد تک بڑھا دیتا ہے۔

لڑکا بھیڑ میں سے راستا بنا کر دائرے کے اندر آ گیا ہے۔ وہ لال رنگ کی قلفی چوس رہا ہے۔ چادر سے کچھ پیسے چپکے سے اٹھا کر قلفی خرید لایا ہے۔

لڑکا باپ کے ہاتھ میں چمکتا چاقو دیکھ کر بجائے کھڑا ہوتا ہے۔ باپ اس کی طرف جھپٹتا ہے۔ لڑکا چیختا ہے۔ باپ خوش ہو رہا ہے۔ آج لڑکا پورے دل کے ساتھ کھیل میں حصہ لے رہا ہے۔ خوب پیسے آئیں گے۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے۔ لڑکا اب بھی چیخ رہا ہے۔ بھاگ رہا ہے۔

ہے کالی ماتا کی! مائی باپ، جان کس کو پیاری نہیں ہوتی۔ مائی باپ، پیٹ کا سوال ہے، پاپی پیٹ کا۔ ورنہ کون باپ اپنے بیٹے کو چاقو سے پھاڑے گا۔

اب وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے پیٹ کو پیٹتا ہوا لڑکے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ چادر پر پیسے گرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ آوازیں آتی ہیں، ڈری ہوئی اور دہشت زدہ سی:

ارے چھوڑ دو، مت مارو! دیکھو بچارا کیسے چیخ رہا ہے۔

لیکن پیسے گرتے دیکھ کر جوش اور بڑھ گیا ہے۔ کھیل شروع ہونے سے پہلے لوگ پیسے پھینک رہے ہیں، ختم ہونے پر کم سے کم دس روپے تو ملیں گے۔

اب اس نے ایک لمبی چھلانگ لگا کر لڑکے کو گردن سے پکڑ لیا ہے۔ دھکا دے کر اسے زمین پر گرا دیا ہے۔ وہ لڑکے کی چھاتی کو گھٹنوں سے دبا کر اس پر سوار ہو گیا ہے۔ لڑکا کسی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح میں میں کر رہا ہے، تڑپ رہا ہے۔ اس کے ہاتھوں سے قلفی چھوٹ کر دور جا گری ہے۔ وہ چیخ مارتا ہے:

باپو مت مار، باپو چھوڑ دے!"

اس کا ہاتھ ہوا میں اوپر اٹھتا ہے۔ چاقو سورج کی روشنی میں چمکتا ہے اور ترچھا ہو کر لڑکے کے پیٹ کی طرف بالکل پسلیوں کے نیچے گوشت کی تہ میں گھس جاتا ہے۔

پہلے لال رنگ کی کچھ بوندیں چاقو لگنے سے پھٹی ہوئی قمیص پر ابھرتی ہیں۔ پھر یہ بوندیں ایک پتلی دھار میں بدل جاتی ہیں۔ لڑکا چھٹپٹا رہا ہے۔ سفید چادر پر سکے گر رہے ہیں۔

اب پتلی دھار ایک چھوٹے سے فوارے کی طرح باہر اچھلتی ہے۔ وہ چاقو باہر کھینچتا ہے۔ رود کیوں لگ رہا ہے؟ ربڑ کے غبارے سے تو چاقو بغیر زور لگائے باہر نکل آتا ہے۔ لڑکے کے حلق سے زور زور کی چیخیں ابھر رہی ہیں۔

Scanned with CamScanner

باہر گیا!

وہ لڑکے کی قمیص تک پر دیکھتا ہے۔ لیکن وہ اس کا شور و بند جاتا نہیں ہے۔ اس کا قلعی کیا ہے سر سے باہر نکل آتی ہے۔ وہاں پانی سے جو اخبار دہشت پر بادشاہ بھون گیا ہے۔ وہ چیل کر لڑکے کی چھاتی پر سے گر آتا ہے۔ لڑکے کا جسم کسی گردن کٹے جانور کی طرح زمین پر اچھل رہا ہے۔

مائی باپ، دہشت کا روپ ہے۔ پانی دہشت کا اثر ہے لڑکے کا خون کر دیتا ہے!

میرے لڑکے نے دہشت سے کسی وجہ سے نکلتے اصلی خون کو دیکھ لیا ہے۔ لوگ تیزی سے وہاں سے بھاگ رہے ہیں۔ پولیس کا سپاہی سب سے پہلے وہاں سے غائب ہو گیا ہے۔

لڑکے کا جسم تڑپ کر اچھل رہا ہے۔ جب وہ چیتے کی طرح وہ کھوپڑی سے ٹکرا گیا ہے۔ کھوپڑی دہشت پر سے بچ کر جا گری ہے۔ چیتے نے بے تکلف دانت خون سے رنگ لیے ہیں۔ سورج خون دیکھ کر جلدی سے بادل کے پیچھے دبک گیا ہے۔

چیتے کا اکیلا بدن کھوپڑی میں پڑا ہے۔ اب لڑکے کا جسم رہ رہ کر تڑپ رہا ہے۔ پھر ایک لمبی چیخ کے ساتھ وہ ساکت ہو جاتا ہے۔ خون کا چھوٹا سا سست سا دریا دھرتی پر دھیرے دھیرے پھیل رہا ہے۔

وہ دوسرے چیتے کی کھوپڑی کے منہ میں جھانکتا ہے۔ اس کی گھروالی اسے بچاؤ کے لیے دونوں ہاتھ اوپر کرتی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں چوبے سے باہر کھینچی ہوئی جلتی لکڑی ہے۔ اور اس کے ساتھ دوسرا منظر جڑ جاتا ہے۔ چمکدار چاقو ہوا میں تھامے اس کا ہاتھ، لڑکے کے جگر میں گھستا چاقو، ایک لمبی چیخ، اور آس پاس دھیرے دھیرے پھیلتا خون کا دریا۔

**

# گووند مشر

ہندی سے ترجمہ: نزہت علوی


## پھانس

رات بہت نہیں ہوئی تھی۔ پوس کی اندھیری گاؤں کے اوپر اتر آئی تھی، نچلی تہہ میں جمے ہوئے دھوئیں کی سیلی سیلی چادر۔ آج رام پور کی بازار تھی۔ آج کے روز اس گاؤں اور آس پاس کے دوسرے گاؤوں کے لوگ بیچتے بھرنی خرید و فروخت کے لیے رام پور نکل جاتے اور پھر سانجھ ہوتے ہوتے گاؤں لوٹتے تھے، پیدل، سائیکل یا بیل گاڑی پر۔

وہ دو تھے۔ لڑکی، پھر تیتے ہوں۔ اندر شاید ہی شاہیں کرتا تھا، بے چینی جیسے سعوں سے ایسے باندھ لیا تو جیسے پھر پھر کے رستے کو باندھ دیتے ہیں، ایک دم کس کے۔ وہ دروازے پر کھڑے ہوئے پھر نڈھے ہوئے ہاتھوں سے باہر کی زنجیر کھٹکھٹائی اور اندر کی طرف کان لگا دیے۔ ان کا اندازہ صحیح تھا، گھر میں صرف پنٹو اور اس کی ماں تھی۔ پنٹو کی ماں کی آواز گھر کے اندر کے کسی کونے سے اٹھی اور ان تک بڑھتی ہوئی سنائی دی۔

ستائی باپ نے کچھ نام نہیں رکھو کا، جو بتاوت نائیں سُنت۔۔۔ (ماں باپ نے کوئی نام نہیں رکھا کیا جو بتانے سے نہیں بن رہا ہے؟) پنٹو کی ماں جھنجھنا رہی تھی۔

بھوجی، ہم ہیں جگو۔ پنٹو کے دوا بابت (بارہ) ہیں سے تھے۔ بولے گھر پہ ہو وہ پیچھے پیچھے آتے ہیں۔ کچھ ضروری بات کرنا ہے ان سے۔"

پنٹو کی ماں جب ایک دم دروازے تک آ گئی تب ان سے کھڑکیاں ڈالنے کے لیے کہا۔ پنٹو کی ماں نے کواڑ کھول دیے اور اندر جا کر ان کے لیے دالان میں کھڑی کھٹیا ڈال دی۔ پھر نہیں بیٹھتے دیکھتی رہی۔

کا ہے صاب کہاں سے آئے ہو؟ پہلے کبھوں نہیں دیکھو؟ (کیوں صاحب، کہاں سے آئے ہو؟ پہلے کبھی نہیں دیکھا۔)

ہم دونوں شہر میں رہتے ہیں۔

بہت عموماً نہیں تھا۔ وہ کام کی تلاش میں بہت عرصہ پہلے شہر چلے گئے تھے۔ کام تو شہر نے دیا نہیں، سینما وغیرہ دکھا کر تھوڑی بہت مزدوری ہاتھوں میں تھما دی جس کے سہارے وہ خواب دیکھ سکتے تھے۔ اس صدی کا خواب رہتی ہے نا۔ بہت پہلے شہر آ تو گیا، وہ اب بھی نہیں آ پائے تھے۔

شہری صاب ہو! اب صاب پہلے تو پینٹ پہنوں، سب سے تنگ ہات تھے، اب تو جینز ڈیکھو پینٹ ڈاٹ پہ بہت رہت۔۔۔ جی صاب، ہم لوگ بیٹھو، ہم دو تو چھو بات۔۔۔ (شہری ہو۔ پہلے تو پینٹ وغیرہ پہننے والے تنگ مہری والی لیے جاتے تھے، اب تو جینز ڈیکھو پینٹ پہنے گھومتے ہے۔ اچھا صاب، ہم لوگ بیٹھو، ہمارا اچھا چل رہا ہے۔)

پنٹو کی ماں کے رسوئی گھر میں گھستے ہی وہ چست ہو گئے۔ اس نے اپنے ساتھی کو فوراً اشارہ کیا۔ وہ بڑی ٹھنڈ ہے۔ بڑی ٹھنڈ ہے۔ کہتا ہوا گیا وہ باہر سے دروازے کی زنجیر اندر سے بند کر آیا۔ پھر چولہوں کو تیزی سے ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ یہ بہانہ ہو سکتا ہے رسوئی گھر کی دہلیز پر پہنچ گیا۔

صاب جی، زری انگیٹھی کہاں ہے؟ تھوڑا تاپ لیتے۔ بہت جاڑ ہے۔ ہم بس بتا دو، ہم اٹھا لیں گے اور سلگا بھی لیں گے۔

انگنیا کے پاس دھری۔ ابھی کیا دھرے۔ آگ کی کھدو سے دیکھو، ماچس تو ہے لے آؤ، ایک دو انگارے ہم دھر دیں۔ (انگنیا کے پاس رکھی ہے۔ وہیں اپلے بھی رکھے ہیں۔ آگ کرید کر دیکھو، نہیں تو ادھر لے آؤ، ایک دو انگارے ہم دے دیں گے۔)

وہ دوڑ کر گئے، انگیٹھی، پھر دوبارہ اپنے رسوئی کی دہلیز پر لے آیا اور پھر وہیں بیٹھ کر اپلے توڑ توڑ انگیٹھی پر رکھنے لگا۔ رکھ کے چپ بھی آ گئی۔ اپلے کے ٹکڑوں کو پکڑتے ہی دھواں چھوڑنے لگی۔ رسوئی اور آنگن کے بیچ دھوئیں کا ایک پردہ سا کھنچنے لگا۔ وہ بیٹھ بھی اس طرح کر گئے کہ اس کا ساتھی بھی دوسری طرف بیٹھا تاپ رہا ہے، جب کہ دراصل اس کی ساری پکڑ میں اب تک اندر کی کوٹھریاں آ چکی تھیں اور وہ پہلے اندر داخل ہو چکا تھا۔

اب بار بار اندر دھواں نہیں جو پہلے تھی، اس نے ہتھیلیوں کو ہتھیلی سے سہلاتے ہوئے کہا، جیسے انھیں آگ کی سینک دے رہا ہو۔

اب صیا! مہنگائی تو کی آگ کی ہوسے کسی کو نہیں کا کھائے، کا پیئے اور کا پہنے۔ ہمارے دو مرن کے دن میں بھی ہم کر دو تھو، سال سالیاں بچھوں کی خوشی پر تر سے بند بھی ضرور ہے دکھ ہے۔۔۔ (اب بہن، مہنگائی تو آگ ہے کہ آدمی کیا کھائے، کیا پیئے اور کیا پہنے۔ ہمارے دادا پردادا کے دنوں میں تو ایسا تھا کہ دو چار سال بعد ایک ہی بیٹوں کی جوڑی چڑھاتے پر ضرور بندھی ہوتی تھی۔)

اُس نے جاتی سردی تھی ور اب پلٹو کی ماں چلی جا رہی تھی پٹری پر۔ وہ یہی کام کر رہا تھا جیسے سے تاپنے کے سوا دنیا میں دوسرا کام ہی نہ ہو۔ پلٹو کی ماں یہی کام کرتی جاتی اور بولتی جاتی تھی۔ بیچ بیچ میں چولہے کے سامنے بیٹھے روٹی کھاتے پلٹو سے بھی باتیں کرتی جا رہی تھی۔

چولہے کے اندر جلتی لکڑیاں چٹر چٹر جل رہی تھیں۔ گرم راکھ کے ذرے اِدھر اُدھر اڑتے ہوئے انگیٹھی پر جمع ہو رہے تھے۔ اپلے سلگ چکے تھے۔ کٹے ہوئے اپلے کے حصے سے آنچ کی ایک ہلکی سی لپٹ اٹھتی، پھر گم ہو جاتی۔ وقت رینگ رہا تھا۔ یہی وقت ہے گاؤں میں۔ شہر ہو تو بیتتا ہی۔ بیتتا یہاں وقت کم بہت ماتھے پر چڑھ جاتا ہے اور پھر وہیں جم کر بیٹھ جاتا ہے۔ پلٹو کی ماں کب تک ایسے بولتی رہے گی۔ اس سے بات کرتے رہنے کے لیے بھی باتیں چاہییں نہیں۔ وہ کہاں تھیں اس کے پاس؟

بھوجی، تم کس گاؤں کی ہو؟ پلٹو کی ماں کے تھمتے ہی اس نے سوال ٹھونک دیا۔

برورا۔ او تم بھیا؟

میں۔۔۔ میں بھی برورا کا ہوں۔

ارے۔۔۔ تب تو تم ہمرے بھیّا لگت ہو۔ پہلیں بتا دیتے۔ اور دیکھو اب ہم تمہیں تمانی بھی اور تم بھوجی بھوجی لگائے رہے ہو۔ پلٹو دیکھو کو آئے بیٹھیں، تمارے ممان۔ (ارے، تب تو تم واقعی بھائی لگتے ہو۔ پہلے بتا دیتے۔ اور دیکھو، ہم ہیں تمہاری بہن اور تم بھوجی بھوجی لگائے رہے ہو۔ پلٹو دیکھو، کون آئے بیٹھے ہیں، تمہارے ماموں۔)

اس نے ہلکی سی پھریری اپنے اندر اٹھتی محسوس کی، لیکن وہ جانتا تھا کہ ان گاؤوں میں تو ہر کوئی ہر کسی کا ماما، چاچا، موسی، کاکی یا کاکا ہے۔ یہاں تک کہ ہریجن (اچھوت) بھی ایسے ہی رشتوں سے پکارے جاتے ہیں۔ اس گاؤں کی لڑکی دوسرے گاؤں میں گئی ہو تو یہاں کے بڑے بوڑھے اس گاؤں کے کنویں کا پانی تک نہیں پیتے۔ پورا گاؤں ہی لڑکے کا گھر ہو گیا۔ اسے یہ سب ناٹک بازی لگتا ہے۔ ہریجنوں کو ماما موسی کہتے ہیں ان کے ساتھ بیٹھ کر بھوجن تو کرے کوئی!

تو بھیا برورا میں کی کے گھر کے ہو؟ (تو بھیا، برورا میں کس کے گھر کے ہو؟)

جیسے گانے کے بیچ ایک لات ماری اور اسے گھر آ لگا۔ وہ گڑبڑا گیا۔ جھگڑے میں کہہ گیا تھا، لیکن یہ تو مصیبت میں پھنسنے والی بات ہو گئی۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی۔

اب یہ مجھے کیا معلوم؟ ہمارے پردادا گاؤں چھوڑ کر کانپور چلے آئے تھے۔ پھر پشت در پشت رہتے چلے آئے کہ اصل میں ہم برورا ہی کے ہیں۔"

تو کا بھائی، اب ہم کنوں کے کنوں چلے جا بسیں پے کہیں تو برورا کیسی۔ جی کہو ہمیں۔ ور ہم ناٹی پڑسیں دیت۔ جتنے جسیں لیو۔ ما سسرے میں بہنا کا کھواوے کو سکت روں روٹی ملت کا؟ (تو کیا ہوا بھائی، اب ہم کہیں سے کہیں جا بسیں، پر کہلائیں گے تو برورا ہی کے۔ بس کہو ہمیں۔ ہم تمہارے لیے کھانا لا رہے ہیں۔ خوب پیٹ بھر کر کھاؤ۔ سسرال میں بھائی کو کھلانے کا سکھ روز روز تھوڑی ملتا ہے۔)

Scanned with CamScanner

جالی ہی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اس کے گلے میں اٹکا اور پھر کھسکتا ہوا کہیں نیچے دھنستا چلا گیا۔ ایک عجیب سی ہوائی سی محسوس ہو رہی تھی۔ باتیں یا نہ جانے کیا سمجھ آ رہا تھا، لیکن یہ صاف لگ رہا تھا کہ وہ یہاں حتما دھنسا ہوا چلا جائے گا۔ پنٹو کی ماں کی کچھ باتوں میں کچھ تھا جو کڑی سے جانے کی طرح بار بار ایک طرف کھنچا چلا جاتا تھا۔ اسے اس دنیا سے دور رہنا چاہیے۔ خلافت کام کیا اور سر سے باہر پنٹو کی ماں کو دیکھ کر بھی ایسے لگتا تھا جیسے سب کچھ یہاں میں ہو، لیکن ایک خوف کی ایک کھسکن بھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ سب ہی لوگ ٹھیک چل رہا ہے تو پھر وہ کس بات کی فکر میں تھا۔ وہ نیا نیا سا لگ رہا تھا۔ باہر گلی سے لوگوں کی چہل پہل اور باتوں کے ٹکڑے اس کے کانوں تک آ رہے تھے۔ سب میں کچھ عجیب اور انجانی سی زندگی۔ وہ سب باتیں سے وابستہ رہتے تھے۔ پنٹو کا دادا کسی بھی وقت آ سکتا تھا۔ کوئی دوسرا ملنے والا بھی دھمک سکتا تھا۔

تو وہ سب بیٹھیں نا؟ (یعنی ہم سب کہاں بیٹھیں؟)

ارے، ابھی جلدی کیا ہے؟

کھانے کا کیا ہے۔ سب ساتھ کھائیں گے؟ (تو کیا اپنے سونی کے ساتھ بیٹھ کر کھائیں گے؟)

ہاں۔

ان کو ہم دو ہی سے کہو تو بابوجی آ سکتے ہیں اور کہو تو وہ رات تک نہ آئیں۔ (ان کا انتظار مت کرو۔ ہو سکتا ہے ابھی آ جائیں اور ہو سکتا ہے آدھی رات تک نہ آئیں۔)

بات یہ ہے کہ ماشی بیں ہم پیٹ بھر کے کھا آئے تھے۔

اس نے بات کو بیچ میں ہی کاٹ دیا جیسے چھوٹے کی انگلی پکڑ (یعنی) کو بچا رہا ہو۔ پنٹو کی ماں کی مٹھی کھسکی سی ہو رہی تھی۔ تب سے پہلے ہاتھی کے ساتھ محسوس ہوئی۔ کمرے کی کوٹھری میں کتنا کچھ تھا، اور سب یہ جیسے ملے ہوئے یہاں سے آئے۔ پنٹو کی ماں نے موقع میں کیا کہ یہ سب نہیں ہے، یہ سب وہ جانتی ہے کہ اس نے چولہے سے لکڑیاں کی ہیں اور یہ پانی چڑھا رہی تھی۔ سب چپ اور دونوں مل کر اوپر اٹھ رہے تھے۔ پنٹو کا ماتھا گرم کر چکا تھا۔

وہ دیر سے کہہ رہا تھا کہ ہاتھی کو جلدی کا اشارہ دے رہے ہیں۔ پنٹو کی ماں اب کسی بھی کے ہونی سے ڈر گئی تھی۔ ادھر وہ دن کی ادھر کسے کو ہونی۔ یہ ایک اور ہونی سے تو زندہ کر دے گا اور باہر سے بھی بچا دے گا۔ پنٹو کی ماں چلانے کی سر اور اس کا بچہ پنٹو کی گود میں، ان سے پہلے کہیں ما پیتے ہیں۔ پنٹو کی ماں باہر آ گئی اور اس نے صحن کو ایک دیکھ لیا تو یہ خبر نہیں یہاں کی عورتیں باتیں کر رہی تھیں۔ دیر سے کوئی آئی ہیں یہ سب سے رات کے اندھیرے میں لپٹے ڈنڈے لیے ہوئے کو کھڑے کی دو بڑی تھیں۔

پنٹو کی ماں نے ایک طرف سمیٹ دیے اور جو بچے ان کی دوسری طرف سرکا دیے۔ پھر پنٹو کو گود میں لیا اور دوسرے ہاتھ میں رسی پکڑ کر باہر کی طرف آنے لگی۔ یہی موقع تھا، جھپٹ کر اندر کی

Scanned with CamScanner

دبوچ سکے۔ ماں بیٹے دونوں کا منہ توپ دے۔ باندھ دے اور پھر رسوئی گھر کی کنڈی باہر سے مار دے۔ چھٹی۔ اگر نہیں تو تھوڑا وقت اور چاہیے ہوگا تو وہ بھی مل جائے گا۔ لیکن وہ بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔ وہ اندر سے کچھ پست ہو گیا تھا، جیسے یہ سب وہ پلٹو کی ماں کے ساتھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس عورت میں کچھ تھا کہ کسی طرح کی زبردستی کرنے کا خیال پاس بھی نہیں پا رہا تھا۔ وہ سوچنے لگ جاتا تھا اور سوچتے ہی سوچتے اس کا حوصلہ ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔ اسے لگا وہ اپنے ساتھی کے ساتھ دغا کر رہا ہے۔ اسے پریشانی میں ڈال دے گا۔ پلٹو کی ماں کو گھیرے رہنے کی ذمہ داری اس کی تھی۔ کیا وہ اسے مستعدی سے سنبھال رہا تھا؟ پر اس کا ساتھی بھی تو سالا کب سے گھس گھس کیے جا رہا تھا، یہ نہیں کہ ترت پھرت... اس کا جی چاہا وہ بڑبڑائے، غصہ کرے۔ غصہ کچھ اس صورت حال پر تھا اور کچھ اپنی لاچاری پر۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ اور کچھ نہیں تو پلٹو کی ماں کو ویسے ہی گھیرے رہے، جو اب تک کر رہا ہے۔

پلٹو کی ماں دالان میں پہنچ گئی تھی۔ انگیٹھی ٹھائے وہ بھی پہنچا، چپکے چپکے، تقریباً دوڑتا ہوا۔

"آؤ جی، ہاتھ پاؤں سینکیں۔"

"وہ دوسرے بھیا کہاں گئے؟"

"اسے سوری (تمباکو) کی طلب ہو رہی تھی۔ وہ لینے گیا ہے۔"

ہارے... مورے بھیا، جاہے کے پہلے کچھو بتاتے تو۔ گھر ہی میں سورتی دھری۔ پلٹو کے دادا کا نا ہیں دیکھوں بھر پھانکت رہت۔ (واہ رے میرے بھیا، جانے سے پہلے بتاتے تو کچھ۔ تمباکو تو گھر ہی میں رکھی ہے۔ پلٹو کے دادا کو نہیں دیکھا، دن بھر پھانکا کرتے ہیں۔)

پلٹو کی ماں نے رضائیں نیچے رکھی، پلٹو کو نیچے اتار کر انگیٹھی کے پاس بٹھا دیا، پر خود نہیں بیٹھی۔ رضائیں اٹھائیں اور رسوئی کی طرف بڑھ گئی۔

کلوئی بلیا گھسی ہے۔ تنا ٹکو ہکی ناہیں کہ پٹ سے بھرائی جوں بھیتر سرک گئیں اور پھر کھائے نا ہیں اسے سبے ہاتھ مارے... (ایک کالی بلی بیٹھی ہے۔ ذرا آنکھ بچی تو یہ ہماری جھٹ سے اندر گھس جائے گی۔ کچھ کھائے گی کیا، برباد کرے گی۔)

بڑبڑاتی ہوئی وہ رسوئی کے اندر، گویا کونا ٹٹول رہی تھی۔ پتا نہیں کالی بلی کس کونے میں دبکی بیٹھی ہو، کس برتن کے پیچھے چھپی ہو۔ آخری موقع تھا۔ رسوئی میں گھس کر پلٹو کی ماں کو باندھ دے، پھر پلٹو کو بھیتر ڈال دے۔ وہ رو دے گا، بچے کے لیے عورت بالکل اشیرنی ہو جائے گی۔ پھر سوچ... وہ اتنی کب سے سوچنے لگ گیا؟

تب ہی اس کا ساتھی مریل چال چلتا ہوا آیا اور اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ کوٹھری سے باہر ہوتے ہی ایک ایک بات اس کے کانوں تک آ رہی تھی، جیسے کھولتے تیل کی بوند کی طرح۔ اس نے اب دونوں ہاتھ انگیٹھی کے سامنے کر دیے تھے، قریب قریب جھنجھلاہٹ کے ساتھ۔

"کیوں بے؟" وہ دھیرے سے پھسپھسایا۔ اس کا ساتھی کچھ نہیں بولا۔ اس کے چہرے پر بالکل ہی ٹھنڈ

Scanned with CamScanner

جی۔

کچھ نہیں؟

اس نے یہ کہہ کر [illegible] کی آنکھیں [illegible] تھیں۔ چہرے پر [illegible] سی

چپکی [illegible] جانے [illegible] میں [illegible] آئے پانی [illegible] لگا۔

دونوں رپورٹر تھک گئے تھے۔ [illegible] کیا تھا۔ [illegible] میں نہیں آ رہا تھا۔ انھوں نے جو طریقہ بنایا تھا وہ شہر میں ہر [illegible] گھس جاتے۔۔ لوگوں کی آنکھوں میں [illegible] اور دروازہ [illegible] کھولتے۔۔ لیکن جہاں سے [illegible] کامیابی کی پوری امید تھی۔ [illegible] ایک [illegible] قسم کی مصیبت میں آ پھنسے۔ کہیں کوئی [illegible] کاوش نہیں جو دکھائی دے اور [illegible] کر دیا جائے۔ [illegible] آنے والا کوئی خط [illegible] سے عجیب [illegible] چھپتے [illegible] تک [illegible] چلا گیا۔

جی۔۔۔ [illegible] نہیں گئے، پلٹو کی ماں کے آتے ہی اس نے کہا۔

[illegible] تک ہے؟

ہاں جی بچو۔

کچھ پتا ہے [illegible] کا؟ [illegible] ہو تو بتاؤ۔ [illegible] شہر میں کیوں چوری [illegible]۔۔۔

([illegible] سارے [illegible] کا ہو تو بتاؤ۔ سارے شہر میں کسی چوری [illegible] نہیں پڑتا۔)

اور [illegible] تھے۔ [illegible] ہوئے۔ [illegible] اس نے اپنی جیب سے پانچ کا نوٹ نکالا اور پلٹو کی ماں کو پکڑا دیا۔

بھئی، ہماری طرف سے پلٹو کو مٹھائی کھلوا دینا۔"

پلٹو اور پلٹو کی ماں انھیں باہر تک چھوڑنے آئے۔

[illegible] بہت [illegible] کب [illegible]؟ (پلٹو پوچھ [illegible] دونوں [illegible] آ گئے۔)

[illegible] دونوں کی [illegible] تھیں۔ انھیں [illegible] ہوئے وہ [illegible] اور پھر دھیرے دھیرے اندھیرے میں کھو گئے۔

• •

# عبدل بسم اللہ

ہندی سے ترجمہ: عطا صدیقی

## رہائی

ابھی گھاس کی اوس بھی نہیں سوکھی تھی کہ منگلی ٹپک پڑی۔ گھٹنوں تک دھوتی چڑھائے، ننگے پیروں میں مٹی اور گھاس پھوس بھرے، سر پر گٹھری اٹھائے، ٹھٹھرتی ہوئی۔

"ٹھنڈ میں جان دینی ہے کیا رے منگلی؟"

الاؤ میں، ہاتھ سینکتے ہوئے میں نے پوچھا تو منگلی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بھی گٹھری ایک طرف رکھ کر الاؤ کے پاس بیٹھ گئی اور بجھتی ہوئی آگ کو سلگا رکھنے کے لیے اس میں پتیاں ڈالنے لگی۔

اتنے سویرے آنے کی کیا ضرورت تھی؟ اطمینان سے کھا پی کر آ جاتی تو بہتر تھا

میں نے کہنے کو ہی کہنے کے انداز میں یہ بات کہی، لیکن منگلی کو ٹالا کیسے جا سکتا تھا۔ شاید اسی لیے وہ میرا منہ تکنے لگی اور ڈرتے ڈرتے ہی اس کے منہ سے کچھ نکل ہی گیا۔

کورٹ کچہری کا معاملہ ہے سرکار، آپ نے ہی کہا تھا کہ سویرے جلدی تیار ہو جانا۔

اس کی بات سے میں نے اس کی حالت کا اندازہ آسانی سے لگا لیا۔ یہ سمجھنے میں مجھے دقت نہیں ہوئی کہ منگلی جمعدار سے ملنے کے لیے بے چین ہو رہی ہے۔

میں نے سن رکھا ہے کہ منگلی اور جمعدار کا ساتھ بچپن کا ہے۔ منگلی کے باپ فوجدار سنگھ کے کوئی بیٹا نہیں تھا، اس لیے وہ جمعدار ہی کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ جمعدار کے باپ کے کئی بیٹے تھے، اس لیے اس نے جمعدار کو فوجدار سنگھ کے سپرد کر دیا تھا۔ فوجدار سنگھ جمعدار اور منگلی کو لے کر اپنے دھندے پر جایا کرتا تھا۔ تب وہ چھوٹے تھے اور آپس میں بھائی بہن جیسا ہی رشتہ رکھتے تھے۔ لیکن بڑے ہونے پر ان میں دوسری

Scanned with CamScanner

طرف کا رشتہ ہو گیا۔ تب خود ... نے محمد ... و شمی کا بیاہ کر دیا۔

لڑکپنے میں ... شمی اپنے ... کی سمت خوب صورت لڑکی تھی۔ خاص طور پر اس کی کھلی ناک اور چہرے کی کاٹھی پر ... دیکھنے والے ... تھے۔ مگر وہ ... کو شیشا نہیں سمجھتی تھی۔ ... سے ایک بار کسی ... نے اسے کچھ کہہ دیا تھا تو شمی نے وہ منہ کھینچ ... کہ اس کی ... پھوٹے پیک، اور گالیاں تو بے شمار دے ڈالیں۔

اس واقعے کے بعد پھر شمی ... کی سمت کسی نے نہیں کی اور اس کا راستہ صاف ہو گیا۔

اب وہ محمد ... سے ... خوب ... زندگی گزارنے لگی۔

... ہوئی تھی ... تھوڑا ... اسی میں دونوں خوش تھے۔ ایک سب خوش ہونے کے باوجود ان کے ہاں کوئی بیٹا نہیں ہوا۔ ایک بیٹی تھی، جو جوان ہوئی تو بیاہ دی گئی۔ اب پھر وہ اکیلے ہو گئے۔ اس پر بھی محمد ... امید نہیں ہوئے تھے۔ انہیں پوری امید تھی کہ ان کے ہاں کوئی بیٹا ضرور ہوگا، کیوں کہ ایک نجومی نے انہیں بتایا تھا کہ ان کی قسمت میں بیٹے کا سکھ لکھا ہے۔ لیکن ان کی امید اس وقت ختم ہو گئی جب ایک دن ... ان کی ... بند کر دی گئی۔

تب سے ان کی صحت خراب رہنے لگی اور انہیں یہ یقین ہو گیا کہ اب وہ نہیں بچیں گے۔ جہاں چ آخری عمر میں بیٹی سے ملنے ... سے ... کی ... اور ایک دن گھر سے چل پڑے۔

لیکن وہ کیا جانتے تھے کہ ایسا ہو جائے گا۔

... کہ جو ... کہ ایسا ہو جائے گا تو گھر کا ... کو جانے دیتے۔ شمی آدھا کر کہتی ہے ... جانتی ہے۔ ... اسے بیٹے ... دوں؟ سوچتا ہوں اور سوچتا ہی رہ جاتا ہوں۔

ایک دن شام کو شمی کو خبر ملی کہ محمد ... شہر میں ... کے جرم میں گرفتار ہو گئے ہیں اور جیل میں بند ہیں۔

شمی کو اس بات پر اعتبار ہی نہیں آیا۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتے۔ ان کو کس چیز کی کمی ہے جو ... نہیں ہے؟ ... ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں، ... وہ ... پیچھے رہتے ہیں، ہو سکتا ہے ان لیے ... ہو گیا ہو ... اور شمی ... بیٹھ کر شہر چلی گئی۔

لیکن شہر کچھ ... نہیں تھی۔ ... میں ... اب وہ کیا کرے؟ عورت ذات، ... کچھ ... تو ... کسی سے بات ہی آگے نہیں بڑھتی۔ شمی لاچار ہو کر چلی آئی۔

لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری ہے۔ محمد ... کو جیل سے چھڑا کر رہے گی۔ اس نے ایسا ارادہ ... کر دیا ... سے مدد مانگی۔ مگر شمی کا ساتھ کوئی کس امید پر دیتا؟ جو لوگ کبھی شمی کی گالیاں کھا ... ہو جاتے ... ہوں گے، آج وہ اس کا ... پولیس ... کر جاتے ہیں۔ شمی اب ... شمی ... ہے۔

Scanned with CamScanner

پھر بھی کیا کہ تیور وہی ہیں۔ مگر وقت کی بات ہے! یہ وقت تیور دکھانے کا نہیں ہے۔ اسی لیے شاید جب پہلی بار سنگی مجھ سے ملنے آئی تھی تو اس کے تنے ہوئے چہرے سے بھی عاجزی ٹپکی پڑتی تھی۔

"سرکار اب آپ ہی سہارا ہیں نا۔۔۔"

کہتے کہتے سنگی غیر متوقع طور پر رو پڑی تھی۔ جانے زمانے میں کسی کو کچھ نہ سمجھنے والی ایک عورت میرے سامنے گڑگڑا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر میں بہت زیادہ مضطرب ہو گیا اور کسی بھی طرح جمعدار کو چھڑانے کا میں نے عزم کر لیا۔

جب ہم شہر پہنچے، دوپہر ہو گئی تھی۔ کچھ وقت ضروری مصروفیت میں نکل گیا اور درخواست پر جب بھکشک کرم شالا (محتاج خانہ) اور بندی شالا (جیل) کے نگراں سے ہم رپورٹ لکھوانے گئے تو تقریباً شام ہو چکی تھی۔ نگراں محترم نے اپنا کام کل پر ٹال دیا اور ہم رات گزارنے کی تدبیر سوچنے لگے۔

"تو کہاں رہے گی رے سنگی؟"

میرا ٹھکانا تو ایک دوست کے ہاں تھا، لیکن سنگی کے بارے میں پوچھ دیا میں نے پتہ نہیں کیوں۔ ویسے میں ڈر رہا تھا کہ کہیں یہ میرے ساتھ ہی چلنے کی ضد نہ کرے ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

"ہمارے لیے آپ فکر نہ کریں۔"

اس نے اس طرح حل پیش کیا کہ میں بالکل بے فکر ہو گیا۔ صبح، سٹیشن کے مسافر خانے میں اس نے ملنے کا وعدہ کیا۔

دوسرے دن صبح صبح میں سٹیشن پہنچ گیا اور یہ دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا کہ سنگی مسافر خانے کی ایک دیوار سے لگ کر ایک بوریا بچھائے اور ایک گدڑی اوڑھے دبکی پڑی تھی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر مجھے یقین ہی نہیں ہوا کہ یہ عورت جب سج دھج کر محلے ٹولے میں نکلتی، بھی ہوگی تو اس پر لوگوں کے کلیجے جل جاتے رہے ہوں گے۔ مگر اس بے یقینی کے ساتھ اس کی ہمت کے لیے میرے دل میں احترام بھی پیدا ہو گیا کہ اپنے بوڑھے شوہر کو جیل سے رہا کرانے کے لیے یہ کیسی تکلیف سہہ رہی ہے۔

مجھے دیکھتے ہی سنگی اپنا بستر لپیٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"چلیں۔"

اس نے پہلے انداز میں مجھ سے چلنے کے لیے کہا گویا وہ بہت پہلے سے چلنے کا انتظار کر رہی ہے اور چلنے ہی کے لیے شہر آئی ہے۔

"جمعدار ولد سنگی، یہی کیس ہے نا؟"

کلرک نے مجھ سے پوچھا تو میں نے ہامی بھر دی۔

[illegible] صاحب نے [illegible] میں رپورٹ [illegible] ہے کہ یہ آدمی [illegible] ہوئے پکڑا گیا ہے اس لیے [illegible] ہے۔ [illegible] میں یہ جھوٹ نہیں [illegible]۔

[illegible] لکھوں گا کہ جمعدار جھوٹ نہیں بکتے۔

[illegible] گنے والے ہی سمجھ سکتے تھے۔ [illegible] پھر بھی اپنے عزم کو پورا کرنے کے لیے میں نے [illegible] دیا

ٹھیک ہے۔ [illegible] تیار رکھیے۔ کام ہو جائے گا۔

[illegible] ہونے لگی۔

[illegible] تقریباً گڑگڑاتے ہوئے پوچھا [illegible] کر دیا اور دوسری فائل دیکھنے لگا۔ میں باہر آ گئی۔

ضمانت؟

[illegible] ضمانت؟ [illegible] تیرے گا۔

[illegible] گا۔

[illegible] کر دیا۔

[illegible]؟

کچھ دے دلا کر نہیں ہو سکتی؟

کوئی بھی وکیل [illegible] کم پر تیار نہیں ہو گا۔

[illegible] کے پاس گیا [illegible] ہوئے [illegible] تقریباً کانپ رہی تھی۔

تمہارے پاس کتنے پیسے ہوں گے؟"

[illegible] وقت [illegible] پچھلی تفصیل [illegible]۔

[illegible]

[illegible]

بھگوان سے پرشد کر ہوں گے۔"

میں نے یہ بات اتنی عاجزی کے ساتھ کہی کہ مرز نے کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا اور سب کچھ اس نے ٹھیک کر دیا۔

جمعدار کو ضمانت پر رہا کرانے کا کام سکشنگ کرم شالا کے نگراں کے پاس پہنچ چکا ہے۔ میں پیڑ کے نیچے کرسی پر بیٹھا وہاں کا حال دیکھ رہا ہوں۔ سنگنی کو اندر نہیں جانے دیا گیا ہے، اس لیے وہ گیٹ کے باہر کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھی ہوئی ہے۔ نگراں صاحب نے ابھی کاغذ پر دستخط نہیں کیے ہیں۔ دوسرے کاموں میں مصروف ہیں۔

اچانک کچھ اور بھکاری وہاں گرفتار ہو کر آ گئے ہیں۔ ان کے سامان کی تلاشی لی جا رہی ہے۔ ان میں ایک بوٹ پالش والا اور دو مزدور بھی ہیں۔ ان لوگوں کو چھوڑ دیا جائے، میں مشورہ دیتا ہوں تو مجھے سمجھایا جاتا ہے کہ یہ ساتھ بار ہیں، ان جیسے ہی یہ جیب کاٹتے ہیں۔ اسی وقت ایک پرانا بھکاری قیدی مجھے دھیرے سے بتاتا ہے کہ معائنہ ہونے والا ہے، کوٹہ بھی تو پورا کرنا ہے۔ نئے بھکاریوں میں ایک جوڑا بھی ہے۔ ان میں شوہر کا وارنٹ جاری ہوا ہے اور بیوی کا نہیں، اس لیے بیوی کو گیٹ کے باہر کر دیا گیا ہے۔ وہ باہر رو رہی ہے، شوہر اندر رو رہا ہے۔ ویسے تو سارے قیدی چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں کے اندر تالے میں بند ہیں، مگر جو کام کاج کے لیے کھلے ہوئے ہیں وہ تماشا دیکھنے پہنچ جاتے ہیں۔

جمعدار آج چھوٹ رہے ہیں، یہ خبر سنتے ہی ان کے کئی ساتھی میرے پاس آ گئے ہیں۔ ان میں وہاں کے چپراسی میاں بیوی بھی ہیں۔ جمعدار تو کل ہی سے بخار میں پڑے ہیں، چپراسی کی بیوی مجھے بتاتی ہے۔

جمعدار کو دیکھے بہت دن ہو گئے ہیں، اس لیے دیکھنے کی خواہش شدید ہو گئی ہے۔ تالا کھلتا ہے تو ایک دوسرا قیدی نکلنے کی کوشش کرتا ہے، جس کو تیزی سے اندر دھکیل دیا جاتا ہے۔ تب جمعدار نکلتے ہیں۔ دیکھ کر کسی کھیت میں کھڑی اس لکڑی کی یاد آ جاتی ہے جسے کرتا پہنا دیا جاتا ہے اور [illegible] بنا کر اوپر ہانڈی رکھ دی جاتی ہے۔

بدن پر خاکی قمیص ہے اور مٹ میلا پاجامہ۔ سر پر پھٹا پرانا انگوچھا بندھا ہے، پیروں میں ربر کے بے حد ٹوٹے ہوئے جوتے۔ وہ لنگڑاتے ہوئے چل رہے ہیں۔ جمعدار کی آنکھیں پھاٹک کی طرف لگی ہیں جس کے باہر سنگنی بیٹھی ہے جس کے دل میں پتا نہیں کیا کیا بھرا ہے۔

جاؤ جمعدار، اب ایسا کام مت کرنا۔ اور یہاں کے کپڑے اتار دو۔

اچانک وہاں کے رجسٹر کے جاننے والے ایک صاحب حکم دیتے ہیں اور جمعدار فوجی جوان کی طرح حکم بجا لانے کے لیے مستعد ہو جاتے ہیں۔ وہ پہلے قمیص اتارتے ہیں۔ میں ان کی ننگی پیٹھ دیکھتا ہوں اور نظر ان پر گاڑ دیتا ہوں۔ پھر وہ پاجامہ کھولنے لگتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

پہنتے کیا جمعدار؟"

ماسٹر پوچھتے ہیں تو جمعدار سر پر بندھے انگوچھے کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ بولتے کچھ نہیں۔ صرف زبان منہ میں لٹکی پلٹتی رہتی ہے۔ وہ پاجامہ اتار کر انگوچھ لپیٹ لیتے ہیں جس سے چھیدوں میں سے ان کا انگ انگ جھلکتا رہتا ہے۔ میری نظریں پھر زمین پر گڑ جاتی ہیں۔

"چلیں بابوجی!

جمعدار کہتے ہیں تو میں چونکتا ہوں۔

"ہیں، کہا سنا معاف کرنا۔"

جمعدار جیلر کی بیوی سے کہتے ہیں تو وہ پھوٹ پڑتی ہے۔ آنسو جمعدار کی آنکھوں سے بھی نکل پڑتے ہیں۔

آگے جمعدار چل رہے ہیں، کسی چیتھڑا چادر، انگوچھا لپیٹے، تھرتھراتے ہوئے۔ پیچھے میں۔

تمہارے اپنے کپڑے کیا ہوئے جمعدار؟"

میں پوچھتا ہوں تو وہ بتاتے ہیں کہ سب چھین لیا گیا تھا۔ چلتے وقت صرف ایک جوڑا دیا گیا تھا جس میں کیا کیا تھا میں نہیں دیکھ سکا تھا۔

جمعدار گیٹ سے باہر ہوئے تو تھانیدار نے اپنا عہدہ پورا کر دیا تھا اور یہ بات جمعدار سے کہہ بھی دی۔

جمعدار، اب تو تم رہا ہو گئے۔'

کیسی رہائی بابوجی؟"

یہ بات تڑاق سے میری کنپٹی پر لگی اور میں تلملا اٹھا۔ جمعدار نے اس رہائی کو رہائی کی شکل میں قبول نہیں کیا، یہ جان کر میرے ہوش اڑ گئے۔

میں دیر تک اس پھاٹک کی طرف دیکھتا رہا جس کے اندر کوئی پچیس برس تک جمعدار بند تھے۔ مڑ کر دیکھا کہ وہ سسکی سے لپٹ کر رو رہے ہیں۔

ایک بار پھر چھیدوں والے انگوچھے کے اوپر نکلی جمعدار کی ننگی پیٹھ اور سسکی کہ میری آنکھوں میں پھر سی گھومنے لگی۔ پیچھے لے کر شاید پیدل گھر تک پہنچیں گے اور وہاں رہائی کے بیس برس لمبے لمبے دنوں کو ڈھوتے رہیں گے اور جنگ جیتنے کی ہڑبڑاہٹ میں شکست ہو جاتی ہے۔

اور تھانیدار سامنے جیل کا ایک اور گیٹ تیزی سے بند ہو رہا ہے جس کے تالوں سے رہا ہونا جمعدار جیسی مخلوق کے لیے آسان نہیں ہے۔

**

# عبدل بسم اللہ

ہندی سے ترجمہ: رفیق احمد نقش

## آدھا پھول، آدھا شو*

حافظ جی کھانا کھانے بیٹھے تو گوشت میں اُنھیں نمک کچھ زیادہ ہی تیز لگا اور انھوں نے کھانا چھوڑ دیا۔

گھر والوں کو حیرت ہوئی۔ نمک چاہے تیز ہو یا کم، حافظ جی کھانا تو کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔ ہاں تو تھوڑا ڈانٹ ڈپٹ دیتے تھے، اور جیسے ہی اُن کے سامنے تازے تمباکو کا حقہ آتا تو خوش باش ہو اٹھتے۔ لیکن اُس روز ایسا نہیں ہوا۔ حافظ جی چوکی پر سے اُٹھ گئے اور پلنگ پر جا بیٹھے۔

اگر اُن کا گھوڑا مارنے کے چکر میں نہ پڑتے ہم تو مات نہ ہوتی--- حافظ جی سوچنے لگے۔ بجائے پیادہ چلنے کے اگر ہم اپنا ہاتھی چل دیتے تو کھیل کا نقشہ دوسرا ہی ہوتا---

حافظ جی اُس روز ہار گئے تھے بُری طرح۔ اور رائے صاحب ٹھٹھا مار کر ہنس پڑے تھے۔

یہ کربلا کی لڑائی نہیں ہے حافظ جی، شطرنج ہے! رائے صاحب نے چٹکی لی تھی اور حافظ جی کٹ کر رہ گئے تھے۔

جیسے جیسے رات گہری ہو رہی تھی، حافظ جی کا دماغ اور زیادہ اُبل رہا تھا۔

ایک ایک کر کے رائے صاحب کی ساری چالاکیاں اُن کے سامنے اُجاگر ہو رہی تھیں۔ بازار کی وصولی، تالاب کی نیلامی، چک بندی میں کھیتوں کا جھگڑا۔ سب جگہ رائے صاحب بازی مار لے گئے تھے اور حافظ جی دوستانہ مروت میں پڑ کر خاموش رہ گئے تھے۔ مگر دھیرے دھیرے اب اُن کی سمجھ میں آنے لگا تھا کہ یہ رائے صاحب کی محض کامیابیاں نہیں تھیں، اُن کے پیچھے شطرنج کی چال کی گہری چالاکیاں چھپی ہوئی

---

* شو: لاش، میت یا جنازہ۔

Scanned with CamScanner

تھیں۔

حافظ جی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ شاید ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اندر کے کمرے سے بیٹے کی ہنسی اور بہو کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ نہیں سنائی پڑی تھی۔ ورنہ کھانا کھا کر اور حقے کا دم لگا کر جب وہ بستر پر پڑتے تو فوراً گہری نیند میں ڈوب جاتے تھے۔

مگر آج تو بار بار ماسٹر صاحب کا دوہا، آدمی کا گوشت کہنے والا:

یکے مرغ دیدم نہ پاؤ نہ پر

نہ از شکم مادر نہ پشتِ پدر

نہ بر آسماں ہے نہ بر زمیں

ہمیشہ خورد گوشت ہے آدمی

ایک پرندہ دیکھا جس کے نہ پاؤں ہیں نہ پر۔ وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے نہ باپ کی قوت سے۔ نہ آسمان میں رہتا ہے نہ زمین پہ بسے۔ آدمی کا گوشت ہی اس کی خوراک ہے۔

اردو والے صاحب کا کھوپڑا ... رہتے تو بات سمجھ میں آتی ہی۔ لیکن اس دن وہ شہر سے چلے گئے ہوتے تو بار بار ہی وصولی کا معمہ انہیں حل کیا ہوتا۔ مگر ایک بار جب پہیلی وہ اور بڑھا دیتے تو اتنے بڑے سوالات کے جواب آنکھ دونوں ہوتے۔ ان کے ایک ہندی افسر سے ہوا ہوگا جھگڑا۔ کہتے تو جو کہیں ارے صاحب تو سے وہ نہیں لوٹے۔۔۔

ککڑوں کوں۔

گھر کا مرغا کافی جاگتے ہوئے سے بول رہا، حافظ جی چونک اٹھے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور دیر تک ٹکٹکی ٹک ٹک کر کھڑکی کی طرف دیکھتے رہے۔ صبح ہوتی تو تھی جا پائیں گی۔ گھر بیٹا اسے لایا تھا جیوں کو ... سے۔ اس لیے حافظ جی نے اس کا نام ... کھونٹی کے روپ میں دیا تھا۔ اس میں ساڑھے تین بج رہے تھے۔

صبح ہو رہی ہیں ... ارے صاحب سے۔ دیکھتے ہیں آج کیسے جیتتے ہیں وہ!

اللہ اکبر۔۔۔

حافظ جی نے ... جوتیاں ڈالیں اور تکیے کے نیچے سے ٹوپی نکال کر مسجد کی طرف چل پڑے۔

اس وقت مسجد میں صرف تین چار نمازی تھے اور وہ وضو بنا رہے تھے۔ حافظ جی بھی ایک طرف بیٹھ کر بدھنے میں پانی لے کر وضو بنانے لگے۔

اردو والے ماسٹر صاحب کا کھوپڑا مارنے والے نے پہیلی میں ... پڑھتے وہ تو مرغ کی بات ... سوچی۔۔۔ وضو بناتے وقت بھی حافظ جی کل رات کی اسی بات ہی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ اچھا آج دیکھتے ہیں۔۔۔

ساتھ ہی وہ ابھی ہونے والی چالیں ہی سوچ رہے تھے کہ اچانک دو تین نمازی اور آ گئے۔ وہ لوگ کسی اہم بات چیت میں مشغول تھے جو ان کے مسجد میں گھستے ہی موقوف ہو گئی۔

نماز جب ختم ہوئی تو صبح کی ریکھائیں کافی واضح ہو چکی تھیں اور چاروں طرف اجالا پھیل گیا تھا۔ حافظ جی کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ نماز کے بعد کوئی بھی نمازی باہر نہیں گیا تھا۔ سب لوگ مسجد کے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے اور پیش امام کی طرف مشتاق نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ حافظ جی چونکے: بات کیا ہے صاحب؟

دیکھا آپ لوگوں نے؟ ہم کہہ رہے تھے نا کہ حافظ جی جان بوجھ کر انجان بنتے ہیں۔ پیش امام نے بڑے طنزیہ لہجے میں یہ بات کہی اور سارے نمازیوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

حافظ جی ناراض ہو کر بولے: دیکھیے صاحب، میں اشارے کنائے کی باتیں پسند نہیں کرتا۔ جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہیے۔

ارے کا صاف صاف کہیں حافظ جی۔ آپ تو دونوں کے پورے جوڑی دار ہیں۔ جیسے وہ ہندوؤں کا فیور کرتے ہیں ویسے ہی آپ بھی۔ آپ کو پتا نہیں ہے کہ قبرستان کی زمین پر ہندوؤں نے اپنے گھر بنا لیے ہیں؟ اور اب رام داس رستوگی کے اشارے پر آگے کی تیاری ہو رہی ہے۔ اور یہ تو آپ کا جگری دوست ہے!

قصبے کے منہ پھٹ قسم کے قادری اسماعیل نے یہ بات کچھ اس انداز میں کہی کہ مسجد کے صحن میں اچانک ایک عجیب سا اشتعال چولہوں کے دھوئیں کی طرح بھر گیا۔

حافظ جی سمجھ گئے کہ بات کیا ہے۔ وہ کھڑے ہو گئے۔

دیکھیے صاحب، رام داس صاحب ہمارے دوست ہیں، یہ ٹھیک ہے۔ لیکن دینِ اسلام کسی بھی دوستی سے اوپر ہے۔ ہم اپنے قبرستان پر ہندوؤں کا قبضہ نہیں دیکھ سکتے۔۔۔ کسی بھی قیمت پر نہیں۔ آپ لوگ پروگرام بنائیے۔ ہمیں آپ سب سے آگے پائیں گے۔

اتنا کہہ کر حافظ جی مسجد سے باہر نکل آئے۔

اب دیکھتے ہیں رستوگی صاحب کون سی چال چلتے ہیں۔ یہ شطرنج کی بازی نہیں ہے، اس ملک کی اقلیت کا جذبہ ہے۔۔۔ اب بازار کی وصولی اور تالاب کی نیلامی کا معاملہ نہیں ہے، معاملہ ہے ہمارے آباؤ اجداد کی روایاتِ پاک کا۔۔۔ حافظ جی جتنی تیزی کے ساتھ سڑک پر چل رہے تھے، اس سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ خیالات ان کے دماغ میں چل رہے تھے۔ اتنی تیزی کے ساتھ کہ راستے میں اسلامیہ اسکول کے ایک بچے نے جب انھیں السلام علیکم حافظ جی کہا تو حافظ جی کو وہ آواز سنائی ہی نہیں پڑی اور وہ ویسے ہی کسی کھدیڑے ہوئے ٹٹو کی طرح بگٹٹ بھاگتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

یہ پڈرونا ہے۔ یو پی اتر پردیش میں دیوریا ضلعے کا ایک بڑا قصبہ۔ بڑا اس لیے کہ یہاں کی آبادی

Scanned with CamScanner

گھستی ہے۔ بڑا اس لیے بھی کہ یہاں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے، جس کا اندازہ اور کسی مہینے میں تو کم ہے کہ محرم میں تو ہو ہی جاتا ہے جب تعزیے کا جلوس یہاں کی سڑکوں پر اپنے پورے تام جھام کے ساتھ نکلتا ہے۔ یہ قصبہ اس لیے بھی بڑا ہے کہ کئی اسکولوں کے ساتھ ساتھ یہاں ایک کالج بھی ہے اور اس کالج کے پرنسپل دیش کی ایک بڑی ہستی ہیں۔ بڑی ہستی اس لیے نہیں کہ وہ ہندی میں ایم اے اور پی ایچ ڈی ہیں، بلکہ اس لیے کہ وہ ہندی کے ایک مشہور کوی ہیں۔ ابھی، حال ہی میں ان کا ایک شعری مجموعہ شائع ہوا ہے جس کا ہندی دنیا میں کافی ذکر ہے۔

پڈرونا کالج کے پرنسپل، یعنی کوی، یعنی بابو صاحب--- درمیانہ قد، دبلی پتلی کاٹھی، گورا رنگ، پتلی پتلی مخروطی انگلیاں، گول چہرہ، چھوٹی چھوٹی گھنی مونچھیں، آنکھوں میں چھوٹی چھوٹی بے شمار کویتاؤں کے گہرے عکس، عکسوں میں تہیں، تہوں میں تہہ در تہہ سنجیدگی کی سطح، سطح میں مدھم گیت، گیتوں میں بنارس کے موسم کی ندی کا سا بہاؤ---

بابو صاحب اصل میں بنارس کے رہنے والے ہیں اور بنارس میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی ہے۔ بنارس ان کی رگوں میں سمایا ہوا ہے۔ وہاں کے مندر، وہاں کی مسجدیں، وہاں کے گھاٹ، وہاں کی یونیورسٹی--- بنارس شہر کا سمپورن جیون! پڈرونا میں بابو صاحب کو آئے ٹھیک ٹھیک سات برس ہوئے۔ ان سات برسوں میں انھوں نے پڈرونا کو کسی مدرسے کی طرح جیا ہے۔ بابو صاحب سماجی میل جول میں پیچھے ہیں اور الگ تھلگ سے رہتے ہیں۔ انھیں ایسا لگتا ہے۔ پھر بھی انھیں سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں اور وہ بھی یہاں کے لوگوں کو پوری طرح پہچانتے ہیں۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ لوگوں کی پہچان ان کی اولاد سے ہوتی ہے، اور ظاہر ہے کہ پڈرونا کی اولاد کے وہ استاد ہیں!

اس روز بابو صاحب کالج کے کیمپس میں داخل ہوئے تو بہت خوش تھے۔ اپنے بنارس کے دنوں کو یاد کرتے ہوئے انھی دنوں انھوں نے ایک کویتا لکھی تھی اور اس کویتا سے وہ خوب مطمئن تھے۔ یہ شہر آدھا پھول میں ہے آدھا شو میں، آدھا جل میں ہے آدھا منتر میں--- نظم کی یہ سطریں ان کے ذہن میں مسلسل گونج رہی تھیں---

لیکن دوپہر ختم ہوتے ہوتے کالج کا ماحول بدل گیا۔ اپنوں کا جو دھواں صبح صبح مسجد میں اٹھا تھا، اب تک پورے قصبے میں پھیل چکا تھا۔ قبرستان کے پاس ایک ہوٹل بھسم ہو چکی تھی اور دھوئیں کا اژدہا پچھلے کئی گھنٹوں سے پھنکارتا ہوا کالج کی دیواریں پھلانگ کر اندر کلاسوں میں گھس آیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کالج خالی ہو گیا تھا۔ بابو صاحب اپنی کویتا کی سطریں بھول گئے تھے اور اپنے دو چپراسیوں کے ساتھ اپنے گھر کی طرف چل پڑے تھے۔ اداس اور خاموش---

قصبے کے ایک چھور پر بابو صاحب کا گھر اور دوسرے چھور پر وہ قبرستان: آم اور نیم کے دس بارہ گھنے درخت اور ان کی چھاؤں میں ڈوبی ہوئی کچی پکی قبریں۔ وہیں ایک طرف چار پانچ چھوٹے چھوٹے گھر اور سامنے تھوڑی دور پر کانٹے دار تاروں کی ایک باڑھ۔ تاروں کی یہ گھیر ابھی حال ہی میں کھینچی گئی ہے

Scanned with CamScanner

اور گھروں کے سامنے چند کیاریاں اُبھر آئی ہیں۔۔۔

یہ گھر اُجاڑے جائیں اور یہ کیاریاں تباہ کی جائیں!

پنڈروہ کے مسلمانوں کا یہ خاص معاملہ ہے۔ ان کا دعوا ہے کہ یہ زمین قبرستان کی ہے۔

ہندوؤں کا کہنا ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ جس زمین پر مکان اور کیاریاں ہیں وہ قبرستان سے باہر ہے۔

قبرستان کے پاس ہوئی ہی ہوئی ہیں۔ ایک پھیلی ہوئی انسانی بھیڑ۔ ہندو اور مسلمان۔ پنڈت اور حافظ، دکان دار اور نوکری پیشہ، بے روزگار جوان اور طلبا۔ سبھی طرح کے لوگ۔ بیڑیوں کا دھواں قصبے کے اس چھور پر کچھ زیادہ ہی گھنا ہو گیا ہے۔

"کہیے حافظ جی، اب یہی سب ہوگا؟"

بھیڑ میں سے رائے صاحب باہر نکلتے ہیں اور پیتل کی موٹھ والی لاٹھی زمین میں دھنسا دیتے ہیں۔ سفید دھوتی اور کھنی کرتے میں بھی ایک بھاری بھرکم پہلوانی ڈیل سامنے آتی ہے۔ حافظ جی چونک اُٹھتے ہیں۔ اُنہیں لگتا ہے، ابھی دو روز پہلے یہی ڈیل ایک کالے گھوڑے پر سوار تھی جسے اُنھوں نے مار گرایا تھا، اور بدلے میں یہ اُس کے سوچے وجود پر چڑھ بیٹھی تھی۔۔۔ ایک ساتھ دو دو سفید ہاتھیوں کی راہ!

"دیکھیے رائے صاحب، دوستی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ شہ پر شہ دیتے جائیں اور ہم صرف اپنا بچاؤ کرتے رہیں۔ آخر آپ لوگ چاہتے کیا ہیں، کہ اس ملک میں ہمارا کوئی قبرستان بھی نہ رہے؟"

اور بات بڑھنے لگی۔ دھوئیں کے بیچ چنگاریاں سی چمکنے لگیں۔ لگا قبرستان کے مُردے ڈھانچوں میں شیطانی ہتھیار چھپائے باہر آ گئے ہیں۔۔۔

تبھی قصبے کا داروغہ بھی موٹر سائیکل پھٹپھٹاتا موقعے پر حاضر ہو گیا۔ پیچھے پیچھے پولیس سے بھری ایک جیپ۔

اور بھیڑ کی آنکھوں میں ہندوستان کے تمام فسادات کی تصویریں ایک ساتھ ناچنے لگیں: گرفتاریاں، لوٹ مار، آگ زنی، عورتوں کی بے حرمتی، چھتوں پر پولیس کا پہرا، سڑکوں پر پولیس کا گشت، فضا میں پولیس کی سیٹی۔۔۔ بھیڑ کانپ اُٹھی۔

چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ دھوئیں کا سیلاب تھم گیا۔ فضا میں صرف بس کی گڑگڑاہٹ باقی رہی۔

"میرا مشورہ ہے کہ آپ لوگ اس معاملے کو آپسی فیصلے سے رفع دفع کر لیں، ورنہ مجھے قانونی کارروائی کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑے گا۔ اور آپ لوگ کان کھول کر سن لیجیے کہ اگر کوئی آدمی قانون کو چنے، تو بیچنے کی کوشش کرے گا تو میں اُسے چھوڑوں گا نہیں۔"

داروغہ نے اپنا ایک ہاتھ موٹر سائیکل کے ہینڈل پر اور دوسرا پینٹ کی جیب میں گھسے پستول پر رکھے ہوئے یہ تنبیہ کی اور لمحے بھر بعد وہ موٹر سائیکل پھٹپھٹاتا ہوا چلا گیا۔ پیچھے پیچھے دھول اُڑاتی جیپ بھی چلی گئی۔

Scanned with CamScanner

اب وہاں قبرستان کے سینے میں ملک داروغہ کے بارے میں طرح طرح کے تبصرے کیے جانے لگے:

یہ داروغہ سالا بڑا حرامی ہے۔

ہر بات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سارا دماغ آسمان پر رہتا ہے ہمیشہ۔

اس کی آنکھ میں سؤر کا بال ہے۔

اسی نے بے چارے ٹیک کو جیل بھجوا دیا ڈکیتی کے جرم میں۔

پتا نہیں کیوں اس کا تبادلہ بھی نہیں ہو رہا ہے؟

ارے صاحب کہہ دیتا ہے کہ اوپر والوں تک اس کی پہنچ ہے!

جہاں ایک بار پٹایا، دماغ ٹھیک ہو جائے گا۔

--- اور دھیرے دھیرے سیدھی باتیں ٹیڑھی ہونے لگیں۔ جیسے ریت کا بندھن کھل جانے سے ہاتھ میں بندھی فصل بکھرنے لگتی ہے۔ دھوئیں کا کالا ٹوپ چھٹ گیا اور دھیرے دھیرے وہ قبیلے کے گھروں میں سما کر غائب ہو گیا۔

اگلے دن قصبے کے نکڑ پر ایک پنچایت بیٹھی۔ دھوپ تو نہیں تھی، ہوا بھی گرد آلود تھی، مگر ان میں چنگاریوں جیسی چمک سی تھی۔ اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے تھے، مگر ویسے ہی کا پردہ تنا ہوا تھا۔

داروغہ نے پنچایت شروع کی۔

ایک طرف سے ایک آدمی کا نام ہندو لوگ دیں اور ایک آدمی کا نام مسلمان لوگ دیں۔ دونوں آدمی پنچایت کے سرپنچ ہوں گے، اور دونوں کی آپسی رائے سے جو فیصلہ ہوگا وہ دونوں گروہوں کو قابل قبول ہوگا۔

اور مجمع میں ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ پھر کھسر پھسر شروع ہوئی اور صلاح مشورہ ہونے لگا۔ کچھ لوگ وہاں سے اٹھ کر اپنی اپنی طرف چلے گئے اور کچھ لوگ ایک چبوترے پر جا کر بیٹھ گئے۔ داروغہ اِدھر اُدھر جا کر چائے پینے لگا۔

تو کیا ہوگا اس فیصلے میں اب؟ بابو صاحب کھڑے کھڑے سوچنے لگے۔ کیا ان کے محلے میں ہندو علاقے کو سمیٹ نہیں لیں گے اور مسلمان علاقے کو تنگ؟ کیا یہ ہیر سنگ کو ان کے قصاب کی الگ الگ بستی بنانے پڑیں گے؟ کیا سب سمجھیں گے کہ بستی کی اتنی تنگ ڈھنگ سے رہ لی ہوں گی؟

اور بابو صاحب کا جی گھبرانے لگا۔ انہیں یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا، وہ پچھتانے لگے۔ جس شہر نے لوگوں سے بچوں کی طرح پیار کیا ہے، وہ اب شمشان کی تیاری کر رہا ہے --- بابو صاحب ہنسی کرتا یاد کرنے لگے، جیسے مصیبت کی گھڑی آنے پر لوگ بھگوان کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ یہ شہر آدھا پھولوں میں ہے آدھا شعلوں میں، آدھا جیل میں ہے آدھا بستر میں---

تبھی ایک آدمی کسی کی منڈیر پر سے آگے رخ کرتے ہوئے آنگن میں پہنچ گیا۔ داروغہ چائے پی کر باہر آ گیا تھا اور ہی کرسی پر بیٹھ کر اخبار دیکھ رہا تھا۔ اس آدمی نے کاغذ کا ایک پرزہ دھیرے سے

داروغہ کی ٹیبل پر رکھی اور رائے صاحب کے پیچھے جا کر کھڑے ہو گئے۔

مسلمانوں کا جی دھک دھک کرنے لگا۔ ہندوؤں کا سرپنچ سوائے رائے صاحب کے سوا کون ہو سکتا ہے؟ یہ کریں گے فیصلہ؟ اس پنچایت سے اچھا تو یہی تھا کہ دین کے نام پر لڑ مرتے وہ۔۔۔

داروغہ نے پرزے کو غور سے دیکھا اور کسی نیلامی کے قیصے کی طرح اسے پڑھ کر سنایا: ہندوؤں کی طرف سے پڈرونا کالج کے پرنسپل گوپی جی کا نام آیا ہے۔ اب مسلمان بھائی بھی اپنے سرپنچ کا نام دے دیں تاکہ پنچایت کی کارروائی شروع کی جا سکے

اور بابو صاحب گھبرا گئے۔

وہ کیا فیصلہ کریں گے؟ وہ تو ہندوؤں کے بھی پرنسپل ہیں اور مسلمانوں کے بھی۔ کیا اُن کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ ہندو ہیں؟ مگر اُستاد کیا ہندو یا مسلمان ہوتا ہے؟ بابو صاحب بھی اسی پس و پیش میں پڑے تھے کہ مسلمانوں کا پرزہ بھی داروغہ کی ٹیبل پر پہنچ گیا۔ بھیڑ میں کھسر پھسر بڑھ گئی۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکیاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ ہندوؤں کے دل تیز تیز دھڑکنے لگے۔ قصبے بھر میں اگر کوئی مسلمان بھروسہ کرنے لائق ہے تو وہ ہیں صرف قادر خان۔ لیکن وہی ایسے مسلمان ہیں جو مانتے ہیں کہ وید بھی بھگوان کے گرنتھ ہیں اور ان کی حیثیت بھی قرآن کے برابر ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوؤں کو کافر نہیں کہا جانا چاہیے۔ کافر وہ ہے جو کفر کرے، یعنی ایشور کے احکام کی خلاف ورزی کرے۔ اگر ان کی جگہ کسی اور کا نام ہوا تو انصاف کی امید نہیں ہے۔۔۔

لیکن داروغہ کے چہرے کو دیکھ کر لوگ کچھ زیادہ ہی خوف زدہ ہو گئے۔ لگتا ہے پرزے پر حافظ جی ہی کا نام ہے۔ داروغہ بار بار پرزے کو اُلٹ پلٹ رہا تھا اور اُس کے چہرے کا رنگ لال ہو گیا تھا۔

'سنائیے داروغہ صاحب، سنائیے!'

بھیڑ کا صبر ٹوٹ چلا تھا۔

داروغہ نے پرزے کو ایک بار پھر غور سے دیکھا اور پھر کچھ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا: مسلمانوں کی طرف سے جو نام آیا ہے۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ نام بھی پڈرونا کالج کے پرنسپل گوپی جی کا ہے

اور بھیڑ پر سکتہ سا چھا گیا۔ دھوپ کا کنٹوپ لگر سے کی چھتری کی طرح چھتر گیا۔

بابو صاحب کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ یہ سمپوہ ہندوستان پڈرونا اور بنارس ہی کی طرح کا ایک شہر ہے شاید! اور یہ شہر آدھا پھول میں ہے آدھا شو میں، آدھا جل میں ہے آدھا ستر میں۔۔۔

**

# شری لال شکل

ہندی سے ترجمہ: اجمل کمال

## فساد

کئی دن کی کڑاکے دار سردی اور بارش کے بعد دھوپ کھل کر نکلی تھی اور ہوا میں اچانک بسنت کا سا مزاج آ گیا تھا۔ اتوار نہ ہوتا تب بھی دن کچھ ایسا تھا جس میں کچھ کام نہیں ہو سکتا تھا۔ انھوں نے بیوی سے کہا کہ کچھ پینے کی اور کچھ کھانے کی چیزیں جلدی سے باندھ لی جائیں۔ اتوار کو برباد کرنے والے لوگ آنا شروع کریں، اس سے پہلے ہی ہم لوگ کہیں پکنک پر نکل چلیں۔ تبھی خبر ملی کہ پڑوس کے ضلعے کے ایک گاؤں میں فساد ہو گیا ہے اور دو آدمی مارے گئے ہیں۔

خبر وائرلیس سے آئی تھی۔ فساد فرقہ وارانہ تھا، پر ضلعے کے پولیس کپتان نے ہندوستانی پریس کی نقل کرتے ہوئے صرف دو فرقوں کی جھڑپ کی بات کہی تھی؛ ان کے نام نہیں کھولے تھے۔ اس علاقے کے ڈپٹی آئی جی پولیس کی حیثیت سے انھوں نے اس پولیس کپتان کو ہمیشہ کام چلاؤ اور خراب کی درمیانی لکیر پر رکھ چھوڑا تھا۔ تب انھوں نے پکے طور سے اسے خراب کے خانے میں ڈال دیا۔ بیوی سے کہا، لگتا ہے پوری خبر جاننے کے لیے اب مجھے ہی جانا پڑے گا۔

پکنک کی بات وہیں رہ گئی۔ بولے، ہندو مسلم کا ہی معاملہ رہا ہوگا۔ شاید مجھے بھی موقعے پر جانا پڑے۔

ایسا ہی ہوا۔ ان کا یہ کہتے ہی ایک سپاہی نے، جو گھر کا باورچی بھی تھا، اندر آ کر ان کے سامنے ایک وائرلیس کا پیغام پیش کر دیا۔

یہ ان بسواس رام کی طرف سے تھا جن کا سرکاری نام ... رام چودھری تھا اور جو صوبے کے آئی جی

Scanned with CamScanner

پولیس تھے۔ انھوں نے امید کی تھی کہ یہ مینیج شاید وہاں پر ان کی غیر موجودگی میں پہنچے گا، کہ وہ تب تک شاید موقعے پر پہنچ چکے ہوں گے۔ ہدایت کی گئی تھی کہ وہاں سے لوٹتے ہی وہ پورے حالات کی رپورٹ دیں۔ فساد پر قابو پانے اور فوراً امن و امان قائم کرنے کے بارے میں کوئی ہدایت نہ تھی۔ اتنے اونچے عہدے دار کے لیے اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی۔

دو آدمیوں کے مر جانے اور کئیوں کے زخمی ہونے کی خبر کے ساتھ ہی پولیس کپتان کے پیغام میں تھا کہ حالات پوری طرح قابو میں ہیں۔ انھوں نے بیوی سے کہا، "جلدی سے ناشتا لگوا دو۔"

تھوڑی ہی دیر میں ناشتے کی میز پر وہ، ان کی بیوی اور دونوں بچے بیٹھ گئے۔

ایک بچے کو چھوڑ کر، جو دوردرشن کے کسی اشتہار کی پیروی میں صرف چاکلیٹ کا ٹکڑا چاٹتا رہا، سب نے قاعدے سے ناشتا کیا اور بات چیت لڑکے کو چاکلیٹ کی جگہ معمول کے ناشتے کے فوائد سمجھانے پر مرکوز رہی۔ بعد میں بیوی نے کوئی بھولی سی بات یاد کرتے ہوئے کہا، "بہت جلدی نہ ہو تو پندرہ منٹ رک جائیے۔ سوچتی ہوں، ہم لوگ بھی پاپا کے یہاں چلے چلیں۔ راستے میں ہمیں اتار دیجیے گا۔"

انھیں جلدی تھی، پر وہ انتظار کرنے کو راضی ہو گئے۔ ٹھیک ٹھیک ڈھائی گھنٹے بعد پورا کنبہ موٹر پر لدا لدا کر فساد زدہ گاؤں کی سمت بڑھا۔

جس ضلعے میں فساد ہوا تھا اس میں بیوی کی خاص دل چسپی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہاں کی امرتیاں مشہور نہیں ۔۔۔ وہ تو تھیں ہی ۔۔۔ بلکہ اس لیے کہ اس ضلعے میں ان کے پتا کا ایک فارم تھا۔ بیوی کے ماں اور شادی شدہ لڑکے لڑکیوں کے الگ الگ ہو جانے کے بعد سے وہ فارم پر جنٹلمین فارمر کی حیثیت سے لیٹے رہتے تھے۔ وہ اونچے سرکاری افسر رہ چکے تھے، اور یہاں گاؤں میں کھیتی نہروں کے بیچ رہتے ہوئے ان کی آتما کو، جو اتنی لمبی سرکاری نوکری کے باوجود مناسب طور سے محفوظ تھی، شانتی ملتی تھی۔ فارم بڑی سڑک سے، جس سے انھیں فساد زدہ گاؤں تک پہنچنا تھا، چار کلومیٹر اندر پڑتا تھا۔ بیوی کو وہاں چھوڑنے کے بعد انھیں لوٹ کر پھر سڑک تک آنا تھا اور آگے پینتیس کلومیٹر جانا تھا۔

"تمھیں میں نے دقت میں ڈال دیا۔ پر کیا کروں، پاپا بڑا اکیلاپن محسوس کرتے ہیں۔ آج نہیں تو دو چار دن بعد مجھے آنا ہی پڑتا۔"

انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا، پھر کچھ دیر سوچ کر کار کی کھڑکی سے بولے، "پاپا کو وہ لیفٹیننٹ گورنری لے لینی چاہیے تھی۔"

"تم نہیں سمجھ پاؤ گے۔ ماں کے نہ رہنے سے ۔۔۔۔"

"میں سمجھتا ہوں،" انھوں نے بیچ ہی میں کہا اور بیوی نے انھیں ترچھے پن سے دیکھا۔ اُسے بھروسا نہیں تھا کہ شوہر کے یہ الفاظ پاپا کے وقار کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے ہیں۔ پر وہ ان کا چہرہ نہیں دیکھ پائی، وہ کار کی کھڑکی سے باہر کی سمت دیکھ رہے تھے۔

راستے میں ایک تھانا پڑتا تھا۔ انھوں نے کہا، "میں تب تک وہیں رک کر کام کروں گا۔ ڈرائیور

Scanned with CamScanner

سے بولے، "میم صاحب کو فارم پر چھوڑ کر بیس منٹ میں آجاؤ۔"

بیوی کو دلاسا دینے کے لیے انھوں نے اس کی بانہہ پر ہاتھ رکھا۔ کہا، "وہاں سب ٹھیک رہا تو شام کا کھانا پاپا کے ساتھ کھائیں گے اور آج ہی رات واپس لوٹ چلیں گے۔"

اس کے بعد انگریزی سکول کے بچوں میں رنج و دکھ کے موقعے کے تاثرات وغیرہ کے ساتھ سارے رسمی لفظوں اور اشاروں کو سمیٹتے ہوئے موٹر فارم کی طرف جانے والے راستے پر تیزی سے چل دی اور وہ داروغاؤں اور سپاہیوں کے بیچ قتل، ڈکیتی، دنگا فساد کی اپنی خاص دنیا میں سمٹے رہ گئے۔

بیوی کے لیے فارم پر بتائے گئے دن کا وہ ٹکڑا اس کے بچپن اور جوانی کی ساری رومانیت کے ریشمی تانے بانے سے تیار ہوا تھا۔ اپنے پاپا کے ساتھ وہ اپنے ماضی کے سامنے کھڑی ہوئی اور وہاں کے اس سے بھی زیادہ لبھاونے دن سپنوں میں کھوئی رہی۔ یہ دوسری ہی دنیا تھی۔

پیڑ پودوں اور طرح طرح کے سبزے کی لہلہاتی ہریالی کے بیچ بنی چھوٹی سی کاٹیج کے برآمدے میں پیر رکھتے ہی سے خوشی ہوئی تھی۔ پاپا پہلے سے دو چار سال کم ہی دکھ رہے تھے۔ گالوں پر پہلے سے زیادہ دمک تھی۔ وہ جب بچوں کو پیار سے اپنی طرف کھینچنے میں لگے تھے، تبھی ان میں سے ایک نے کافی ٹیبل پر رکھی ایک کتاب کی طرف اشارہ کر کے کہا، "وہ کیا ہے؟"

"تمھارے کومکس!"

پر کتاب کے پنے پلٹتے ہی بچے کے چہرے پر پریشانی جھلکنے لگی۔ بولا، "ناناجی، آپ چیٹ کر رہے ہیں۔" کتاب کا عنوان اس کی جانی پہچانی انگریزی میں ہونے کے باوجود پڑھنے میں دقت ہوئی۔ دھیرے دھیرے اس نے پڑھا، "یوگ واسشٹھ"۔ پوچھا، "یہ کیا ہے؟"

انھوں نے کتاب اس کے ہاتھ سے لے لی۔ کہا، "یہ ہم بڈھوں کی کومکس ہے۔"

ادھر ان کی بیٹی نے انھیں ٹوکا، "پاپا، آپ کو بڈھا کون کہتا ہے؟" ادھر انھوں نے بچوں کو دونوں ہاتھ سے کمرے کے اندر ڈھکیلا۔ بولے، "اندر جا کر میز پر دیکھ لو۔ تمھارے کومکس کا پیکٹ ایک کونے میں رکھا ہے۔ ۔ اور ہاں، الماری میں بھی دیکھنا۔"

الماری میں چاکلیٹ تھے۔

"آج کا اتوار تو، پاپا، روپی کے لیے برباد ہو گیا۔ سویرے آٹھ بجے ہی فساد کی خبر آ گئی۔ دو لوگ مارے گئے ہیں۔ پتا نہیں ہندو ہیں یا مسلمان۔"

انھوں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ اچانک ان میں بزرگی کا احساس جاگا۔ بولے، "اب تک روپی کیا کرتا رہا؟ اسے وہاں بہت پہلے پہنچ جانا چاہیے تھا۔"

"میری وجہ سے ہی۔۔۔"

"نہیں، نہیں، تمھارے کیا مطلب؟ شاید آج کل کا طریقہ یہی ہے۔" پھر، "تمھاری سائنو سائٹس اب کیسی ہے؟"

Scanned with CamScanner

دھیرے دھیرے دن بیتا، سورج ڈوبا۔ ان دنوں جھٹ پٹے کا وقفہ زیادہ لمبا ہونے لگا تھا۔ آسمان صاف تھا، پر افق پر ہلکی لالی کا دائرہ تھا اور اس کے نیچے حصے میں کاجل کی ایک پتلی جھیل گہراتی جا رہی تھی۔ پچھوا ہوا میں ٹھنڈک تھی پر اس میں ابھی وہ کیلاپن نہیں آیا تھا۔ دور دور تک لہلہاتی فصل کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے پاپا سے بات کرتی رہی۔

بچپن کے دنوں میں پاپا کے ساتھ گھومنا، جنگلوں اور سرکٹ ہاؤسوں میں بتائے ہوئے دن، شکار، رئیسوں اور افسروں سے گفتگو، پارٹیاں اور دعوتیں، پھر دلّی کو تبادلہ، پھر وہیں بس جانا۔۔۔ جہاں پور کئی چھوٹے شہروں کی زندگی سے ہٹ کر دیس بدیس کی اہم ہستیوں کی جھلکیاں اور بھیڑ میں سمجھا سمٹ کر گم ہو گیا۔ ماں کی لندن میں موت، اس تمہاری کا ہونا، خود وزیر اعظم کا نجی پیغام آنا۔

پاپا سے بچھڑنا، پولیس افسر کی بیگم صاحب کا رتبہ، پاپا کی ریٹائرمنٹ، ان کا چپکے ایک سے سنیاس، یہ فارم، یہ فصل، یہ سناٹا، یہ کاٹیج، یہ ہریالی۔۔۔

"پاپا، اس بنور ام کو دیکھیے، یہاں دل اور مخفی افسر اچھے نہیں لگتے۔"

"پاپا، اس بار آپ کی کاٹیج بہت پیاری لگ رہی ہے، یہ پھول کس نے لگائے ہیں اندر کے کمروں میں؟ کچن میں بھی۔۔۔"

"ایک آدمی واسی لڑکی مل گئی ہے۔ عیسائی ہے۔۔۔ جین۔ آج میں نے اسے چھٹی دے رکھی ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔ دکھی ہے، اس کا وہ فارسٹ ڈپارٹمنٹ میں چوکیدار تھا۔ ایک حادثے میں دو سال ہوئے۔۔۔"

"کھانا بھی بنا لیتی ہے؟"

"سیکھ رہی ہے۔ سوپ بہت اچھا تیار کرتی ہے۔"

پاپا کے وہسکی سوڈا کا وقت ہو رہا تھا۔

"پاپا، آپ کچھ دن ہم لوگوں کے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟"

"تم خود کچھ دن میرے ساتھ کیوں نہیں رہتیں؟"

وہ ڈرامائی انداز سے چپ ہو گئے۔ ایک چسکی لے کر پھر ڈرامائی انداز ہی سے بولے، "فکر نہ کرو بیٹی، میں بہت خوش ہوں۔"

"کچھ دن کے لیے انل کے پاس امریکا کیوں نہیں چلے جاتے؟"

"تم لوگ کیوں نہیں گھوم آتیں؟ میں کرانے میں مدد کر سکتا ہوں۔"

کوئی کھمبے کے پاس کھڑا تھا۔ "کیا ہوا مینیجر صاحب؟"

مینیجر صاحب پچکون اور پچپن کے بیچ ایک سو چست آدمی نکلا۔ سامنے آکر بولا، وہی پیچ دار مسئلہ تھا۔

"اس کی بات اس وقت کرو گے؟"

Scanned with CamScanner

کنور جی آئیں گے نا ابھی؟ آپ مناسب سمجھیں تو ان سے بات کریں۔

وہ کچھ سوچ کر بولے، "کروں گا۔"

ان کے جانے کے بعد جینتی نے ان کی طرف سوالیہ نگاہ ڈالی۔ کنور جی، یعنی ان کے بیٹے روی، جناب ڈی آئی جی صاحب! پاپا کے لیے کوئی نیا سبجیکٹ ہوگا، یعنی خود ان کے لیے کوئی نیا تھا۔۔۔

کہیں ٹی وی؟ ماشاء ہیرے کے تاجر ہیں؟

پاپا کہتے ہیں۔۔ ایگریکلچر ڈپارٹمنٹ سے طے کر کے۔۔ گیہوں کا ایک نیا بیج بڑھا رہا ہوں۔ اب اس محکمے کا افسر اسے بیج کی حیثیت سے مان دینے کو تیار نہیں ہے۔ ہمارے طریقے میں سے کچھ کمیاں نکال رہے ہیں۔ کسی منسٹر کا بھانجا ہے وہ۔ سوچتا ہے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ سب روپے مانگتے ہیں۔ یا تو فصل کٹنے پر اس بیج کو معمولی گیہوں کی طرح بیچ دیا جائے، یا محکمے سے منظور کیا جائے۔ اب طے ہے کہ میں ان لوگوں کو رشوت نہیں کھانے دوں گا اور خود ان سے بات بھی نہیں کروں گا۔

روی۔۔۔ روی سے بات کریئے۔

وہی تو ہمارے منیجر صاحب کہنے آئے تھے۔

تب چاند نکل آیا تھا۔ بجلی کی روشنی کے دائرے سے باہر ٹھنڈی چاندنی میں پیڑوں کی اندھیری شاخیں ہوا میں مل رہی تھیں۔ جینتی نے کہا، روی اپنے یہاں کے ڈپٹی ڈائرکٹر ایگریکلچر سے بات کریں گے۔ ایک وشسٹ صاحب ہیں۔ ہمارے یہاں آیا کرتے ہیں۔ پنڈت صاحب کے آدمی ہیں۔ پیاز تک نہیں کھاتے۔

اور رشوت؟

شاید وہ بھی نہیں کھاتے۔"

شام تب میں ہوا کا بہاؤ کچھ زور پکڑ رہا تھا۔ وہ ان کے سایوں کا رقص ایک ٹک دیکھتی رہی۔ کمرے کی طرف منہ کر کے اس نے پکارا، "پپو! ٹی وی سے کب تک چپکے رہو گے؟ کیا ایک منٹ کے لیے بھی برآمدے میں نہیں نکلو گے؟"

فساد کی یاد جو کسی قدیم چٹان کے نیچے دبی پڑی تھی، انھیں تب آئی جب دور سے آتی موٹروں کی روشنی سامنے پیڑوں پر پڑی۔

دو موٹروں میں آگے روی کی کار تھی، پیچھے ایک جیپ میں باوردی پولیس تھی۔ انھیں گیٹ کے سامنے اتار کر گاڑیاں کچھ دوری پر پیڑوں کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئیں۔

"کیسا رہا؟" کا روی نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک گلاس میں بہت تھوڑی سی وسکی ڈال کر، اس میں اوپر تک سوڈا بھر کر وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ پھر زور کی سانس کھینچ کر کہنے لگے، "حالات تو خراب ہیں، پر شکر ہے خدا کا کہ یہ ہندو مسلم فساد نہیں ہے۔"

تب تک پاپا نے باورچی کو بلا لیا تھا۔ کہا، "ان لوگوں کو چائے پلا دو۔ کچھ بسکٹ وغیرہ بھی۔"

Scanned with CamScanner

بچے بھی برآمدے میں آ گئے تھے۔ وہ بولے، پانچ مکان جلے ہیں۔ ان میں چار مسلمانوں کے ہیں اور اتفاق ہے کہ ان کے بیچ پانچواں ایک ہندو کا ہے۔ دراصل وہاں کے ٹھاکروں کی ان لوگوں سے کافی عرصے سے مقدمے بازی بھی آ رہی تھی۔ زمین کا جھگڑا تھا۔ غنیمت ہے کہ پولیس نے دونوں طرف سے ایک سو سات کی کارروائی بھی کر رکھی تھی۔ پر کل شام معاملہ اچانک بگڑ گیا۔ ٹھاکروں کے ایک لڑکے نے دوسرے فریق پر حملہ بول دیا۔ ایک آدمی گولی لگنے سے مر گیا۔ تین کو معمولی چوٹیں آئی ہیں۔ ایک آدمی آگ میں جل کر مر گیا۔ کل ملا کر قتل اور آتش زنی کا معاملہ ہے۔ قانون کے حساب سے فساد بھی، لیکن فرقہ وارانہ فساد تو ہرگز نہیں۔

"پی اے سی لگا دی ہوگی؟"

"شکر ہے کہ اس معاملے میں ہمارے پولیس کپتان صاحب مستعد نکلے۔ وہ اور ڈی ایم کل رات ہی وہاں پہنچ گئے تھے۔ آج سویرے دو بجے تک قاتلوں میں سے بہتوں کو پکڑ بھی لیا گیا ہے۔ ادھر کے بھی دو تین لوگوں کو حراست میں لیا گیا ہے۔"

بیوی بے چینی سے کرسی پر ہلی۔

"گاؤں؟ وہ تو اجاڑ ہو رہا ہوگا! جلے ہوئے مکان، جلی ہوئی لاش، گولیوں سے مرے اور زخمی لوگ۔۔۔ پتا نہیں تم یہ سب کیسے دیکھ پاتے ہو!"

"ڈیڈی، بھی ٹی وی پر فلم آئی تھی نا، وائل؟ اس میں بھی ایسا ہی تھا نا؟ خوب گولیاں چلی تھیں، جھونپڑیاں جل رہی تھیں۔۔۔"

"بچے، تم لوگ اندر جا کر کھانا شروع کرو۔ ہمیں گھنٹے بھر ہی میں واپس لوٹنا ہے۔"

"وائل میں جو ولین ہے نا ڈیڈی۔۔۔"

پاپا دونوں نواسوں کو پکڑ کر اندر لے گئے۔ جب وہ باہر آئے تو بیٹے داماد کو کہتے سنا، ایک بڑی ٹریجک بات لگی؛ جو آدمی ان جھونپڑیوں میں جل کر مرا تھا وہ اپنی اکیلی لڑکی کے ساتھ رہتا تھا۔ بے چاری سترہ اٹھارہ سال کی معصوم لڑکی ہے۔ وہ رو تک نہیں پا رہی تھی۔ وہ میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اور بس، کھڑی رہی۔ عجیب حالت تھی۔ بیٹھیے، پاپا! پیچھے کچھ دوری پر کئی عورتیں رو رہی تھیں۔ پر وہ میرے آگے خاموش کھڑی تھی اور مجھے صرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے بھی نہیں، صرف میرے کندھے پر لگے بیج کو۔۔۔

پاپا نے بھنویں سکیڑیں، پتا نہیں ہمدردی سے یا ایک پولیس افسر کے جذباتی ہونے پر حقارت سے۔۔۔

۔۔۔ پھر جب وہ بولی تو بولتی ہی رہی، پر صرف ایک بات۔ کہ میں اب کہاں جاؤں، بولو، میں اب کہاں جاؤں۔

"تم نے کیا کیا؟"

اسے کچھ دنوں کے لیے شہر میں عورتوں کے پروٹیکشن ہوم میں بھیجنے کو کہہ دیا ہے۔ کل سویرے اس کی برادری کا ایک آدمی پولیس کے ساتھ اسے وہاں لے جائے گا۔

"کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا؟"

ہمارے اسٹاف میں ایک سب انسپکٹر ہے، ہی جٹ کا ہے۔ وہ اسے اپنے گھر میں رکھنے کو تیار تھا۔ اس کی بیوی اس کے لیے کوئی چاہیے۔ پر اس سے پولیس کی نیت پر شبہ کیا جا سکتا تھا۔

تم جانتے ہو روی، وہ پروٹیکشن ہوم، بس، ایسے ہی ہیں۔ ان کا کچھ سا نہیں کیا جا سکتا۔

میں جانتا ہوں پاپا، پھر بھی یہ سرکاری ادارے ہیں۔ کوئی دوسرا انتظام کر، ہم لوگوں کے لیے شاید اور بھی ہو گھر کی بات ہوتی۔ ہم لوگ تو کلاس روم میں بیٹھے ہیں۔ کوئی بھی شہر پھونک سکتا ہے۔

پاپا تیسرے کلاس میں ہونے لگے۔ ان سے بل سے بولے، کیسا وقت آ گیا ہے۔ اتنی بڑی حکومت ایک بیچاری لڑکی کو قاعدے کی چھت تک نہیں دے سکتی۔ وہ اپنے داماد سے بولے، ایسا ہی تھا تو میں ہی یہاں فارم پر کچھ دنوں کے لیے اس کی سرپرستی لے سکتا تھا۔

داماد نے بیٹھی نگاہ سے سسر کو دیکھا۔ کہا، وہ تو بالکل ہی غلط ہوتا پاپا--- آپ خود جانتے ہیں۔ آپ سے میرا اتنا سیدھا رشتہ ہے---

پھر پاپا، اس کی بیٹی نے کہا، ایک لڑکی آپ کو گھر کے لیے مل ہی گئی ہے۔

وہ کچھ نہیں بولے۔ بیٹی نے کہا، میں کھانے کا دیکھتی ہوں۔

اس کے جانے کے بعد وہ داماد کے پاس کھسک آئے اور بولے، تم جا رہے ہو راوی، پر یہاں فارم کا ایک مسئلہ ہے، تمہارے بھی کان میں ڈال دیتا ہوں۔ مینیجر پوری بات کہے وہیں آ کر بتائے گا۔

مسلی فساد، جسے کسی نے میرٹ لیبیٹ سے لکھ دیا، تین دن بعد ہوا۔ یہ فساد شہر میں، جیسا پاپا کے اندیشوں کے مطابق، اس واقعے کے بعد ہوا جب وہاں کے پروٹیکشن ہوم میں دو دن پہلے بھرتی ہونے والی ایک لڑکی، مقتول مجاہدوں کے پراسرار حالات میں غائب کر دی گئی۔

وہ بی ڈی جی کے ہیڈ کوارٹرز سے فوراً اس شہر میں آئے اور پوری مستعدی سے فساد کو دبانے میں لگ گئے۔ جب تک پی اے سی، بی ایس ایف، فوج وغیرہ کی مدد سے فساد پر قابو پایا گیا، پورا واقعہ کل ہند شہرت میں شامل ہو گیا تھا اور صوبے کے چیف منسٹر کے آنے سے پہلے مرکزی ہوم منسٹر کے آنے کا پروگرام وہاں پہنچ چکا تھا۔

ایک قابل اور چست پولیس افسر کی حیثیت سے انہیں کوئی الجھن نہیں تھی۔ درحقیقت ان کے ماتحتوں میں مرکزی ہوم منسٹر کی آمد پر جتنی پریشانی تھی، ان کے دل میں اس کے لیے شاید اتنا ہی اشتیاق تھا۔ اپنی صاف ستھری انگریزی میں اعلیٰ سطح کی میٹنگوں میں پورے حالات کی وضاحت کرے، ان کا تجربہ

Scanned with CamScanner

کر کے فیصلے کے لیے سبھی ممکنہ حل پیش کرنے اور ان میں سب سے زیادہ موزوں حل کو منظور کرنے کے لیے وہ پوری پولیس فورس میں مشہور تھے۔ جھی سونی جھونپڑیوں کے موقعے کا معائنہ کرنے کے مقابلے میں یہ سارا کام زیادہ دور اندیشی اور مہارت کا تقاضا کرتا تھا جس کی وہ اپنے میں کمی نہیں محسوس کر رہے تھے۔ ایک یتیم لڑکی کو بے حفاظت چھوڑ دینے کے الزام کا وہ پولیس کی طرف سے پریس کو منہ توڑ جواب دے چکے تھے، اس کی پریس تک میں تعریف ہو رہی تھی۔

ایک حوصلہ مند اور تجربہ کار پائلٹ کو کل اسی من پسند مشین پر چڑھ کر کھلے آکاش میں پرواز کرنے کا موقع ملنے والا تھا۔

**

# گیان رنجن

ہندی سے ترجمہ: دولی رام وقیہ

## گھنٹا

پیشروا کافی اندر دھنس کر تھا۔ ردی کی دکان، سائیکل اسٹینڈ اور موڑ شہر اپنے کی جگہ کو پہچان کر وہاں پہنچا جاتا تھا۔ وہ کافی نامعلوم جگہ تھی۔ اسے صرف پولیس اچھی طرح جانتی تھی۔ ہم لوگ اسی بالکل گمنام جگہ میں بیٹھنے لگے تھے۔ یہاں جتنا سکون اور آزادی تھی، کہیں اور نایاب تھی۔ ہمیں یہاں پورا چین ملتا تھا پیشروا ایسی جگہ تھی جس سے شہریوں کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ جہاں تک ہم لوگوں کا سوال ہے، ہمارا شہر ہی پر یک ڈھیلے ہاڑ کی طرح کسی نہ کسی طور پڑا ہوا ہے۔ اکھڑے ہونے کی وجہ سے لگ سکتا تھا کہ وقت کے ساتھ سب سے رُٹھ کر ہم ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیٹھے بیٹھے ہم آپس ہی میں پھنکار پیتے ہیں، جیتے نہیں ہیں۔ ہمارے جسم میں لوتھڑوں جیسی شانتی بھر گئی ہے۔ نشے کی وجہ سے کسی کیبار تھوڑا مست غنڈہ بن جاتا ہے اور آپسی چپقلشوں کے بعد اوپر آسمان میں گم ہو جاتا ہے۔ اس نشے کی حالت میں کبھی ایسا بھی لگتا ہے کہ ہم بیدار ہو گئے ہیں۔ نجات کا وقت آ گیا ہے اور منافقت کو پہچان لیا گیا ہے۔ لیکن ہم لوگوں کے جسموں میں سنت ملوک داس اس قدر گہرا آسن مار کر جمے ہوئے تھے کہ بھیڑیا دھسان ہمیشہ جاری رہا۔ یہ لگتا کہ پیشروا کا زندگی سے باہر چلے جانا کافی مشکل ہو گیا ہے۔ یہ جگہ ایک پناہ گاہ میں بدل گئی تھی۔ پیشروا سے نکل کر شہر کے کھنڈر سے گزرتے ہوئے جب ہم اپنے گھروں کو واپس ہوتے تو شہر کا ڈھانچا دکھائی دیتا تھا۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ ہم سے بڑھ کر شہر کے ڈھانچے کے بارے میں کم لوگ جانتے ہوں گے۔ میرے ساتھیوں کو سوچیے، سماج اور دیش دنیا سے شاید ہی کوئی تعلق رہ گیا تھا۔ وہ لوگ قطعی طور پر اجنبی تھے۔ اپنے ساتھیوں میں میں واحد ایسا فرد تھا جس کا فیصلہ زندگی نے ابھی تک نہیں کیا تھا

Scanned with CamScanner

اور خود دلالوں کے بیچ میں غور اور سوچ بوجھ کا طریقہ استعمال کر رہا تھا۔ یہ کسی حد تک ممکن ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے ایک ہارا آدمی بن چکا ہوں، لیکن فی الحال میں یقین سے نہیں جانتا۔

شاید یہ ہوتا ہے کہ جب میری صحت گھٹیا ہے تھی ہے، رگڑوں کی تعداد بے شمار ہو جاتی ہے اور مجھے یہ دکھائی دیتا ہے کہ میرا مرض ترقی کر رہا ہے اور اس دوران اس میں کوئی بھی علاج نہیں آیا ہے، تب میں بھی بہانہ کر سوتا ہوں، شو دمڈو کے گلیاروں میں گھومتا ہوں، کوکا کولا پیتا ہوں اور بھو سیو۔ پیٹروالا کو کوئی وعدے کرتا ہوں۔ میرے سے یہ بھی ممکن ہے کہ اس بات کو تھوڑا بہت جانتے ہوں لیکن وہ پروا نہیں کرتے۔ میرے پاس کچھ ایسے کپڑے بھی ہیں جن کا میرے جسم سے اور خود میری پچھلی زندگی سے کوئی میل نہیں ہے اور انہیں پہنتے ہی مجھے لگتا ہے کہ میں بدل گیا ہوں۔ میں انہیں تب پہنتا ہوں جب پیٹروالا میں نہیں جاتا ہوتا۔ مجھے ان کا شاید ویسے ہی جیسے کپڑوں کی شرم بھی ستاتی ہے لیکن میں نے انہیں کسی ہمیشہ کے لیے پھینکا نہیں۔ ہوں نہیں پہنا، پر سنبھال کر رکھی۔

ایک دن میں پیٹروالا سے باہر پان کی دکان تک نکلا تو ہم سے اچانک ملاقات ہو گئی۔ کافی رات جا چکی تھی۔ ہم جب سے ہیرا ڈھکی چھوڑنے لگا ہے، خوب صورت ہو گیا ہے۔ ایک وقت ہم کی زندگی ایسے حالات پر پہنچ گئی تھی کہ لگتا تھا وہ بھی پیٹروالا کے گروہ میں شامل ہو جائے گا، لیکن وہ بال بال بچ گیا۔ پوری طرح سنبھل اور مضبوط ہو جانے کے بعد اب وہ جب بھی ملتا ہے پیٹروالا کی زندگی پر رول لینا شروع کر دیتا ہے۔ کہتا ہے: کہاں پیسے میں پھنس گیا، ان لوگوں کے ساتھ کی زندگی سے کہاں نصیب ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں اب ان کے پاس کافی پیسہ ہے اور آدمی بھی خوب ہو گیا ہے۔ دو چار منٹ مشکل سے بیتے ہوں گے کہ ہم نے کندن سرکار کے بارے میں بات شروع کر دی۔ مجھے پتا تھا، وہ کندن سرکار کی بات ضرور کرے گا۔ دوست ہمدردی میں ہوتے ہیں ساتھ ہو مجھے اس کی اس بات کا انتظار تھا۔ وہ مجھے جب بھی ملا، کندن سرکار سے تعارف کرنے کے لیے ٹک ٹک جٹ گیا۔ ضرور اس میں اس کی کوئی خوشی تھی۔ شاید وہ بتانا چاہتا ہو کہ ہماری دوستی ابھی تک بچی ہے، وقت نے اسے مٹایا نہیں ہے۔

کندن سرکار والی بات برسوں سے چلتی آ رہی تھی اور آج تک ماند نہیں پڑی۔ اس بار ہم سے مشکل کر رہا ہو کوشش تھی اس لیے یہاں بھی دو روشنے کا سی شادی دی۔ اس نے زور دیا کہ کندن سرکار کے ساتھ مجھے ملاقات نہیں ہوئی۔ تو جھٹک ورو، شخصیت بل، واقعی مزہ آ جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سب مجھے کافی عرصے پہلے بھگا گیا تھا۔ ب مشکل سے تھوڑا بہت پیچھا چھڑا پاتا، لیکن یہ بات میں ہم سے دبا جاتا ہوں اس سے بلکہ وقت کی ایک واہیات بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہم بالکل چھوٹا سے بچے سے وہ پوچھتا گیا: مد کتا نہیں کل پکارا۔ بس آدمی تم کو کرنے کا جو ہی پیدائش کو ملاقات دیکھا ہو۔ دوست ہم کا شخص ہے اور ٹپ طبیعت۔ بولو، اور کیا چاہتے ہو بھائی؟ چلتے چلتے وہ پھر رکا اور تھوڑا جوش میں آ کر بولا: وہ تمہارے ساتھ ہوں چلا جائے گا، نہ کپڑے چھوڑے گا اور نہ تک نہ تیرے گا۔ کل پکارنا۔"

میں سب چیزوں کو برداشت کرنے کی تیاری کر رہا ہوں، شراب کی کشش کے سہارے، کندن سرکار
کندن سرکار سوچتا ہوا پیشر ولا واپس پہنچا۔

کندن سرکار کافی مصروف ہو گیا تھا۔ شہر کے تمام مختلف ادیب و دانشوروں تک وہ پہنچ چکے تھے۔ سب مل کر اس کے دوست تھے، جس کا کہنا تھا کہ ان کا کام بہت ہی خوب تھے۔ جہاں سے آدمی کی دو پیچ جو نہیں سکتے ان لوگوں کو ان کی ضرورت، کندن سرکار کو دیکھتے ہی، کبھی اور خوش نصیبی کی گدگدی ہونے لگتی تھی۔ کندن سرکار اور دانشوروں کے میل جول کو بات کرنے والے دوست سے تماشائی چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ لوگوں نے شہر کے ادبی حلقوں میں کندن سرکار کی شہرت بڑھا دی تھی۔ میں نے ان سے ساتھیوں کو کچھ بھی نہیں بتایا اور کچھ ہم نے ان کے لیے جھوٹ بولا۔ نہیں پہچان سکتا ممکن ہی نہیں تھا۔ پیشرو کے ساتھیوں میں شریک تھے۔ کندن سرکار جیسے آدمیوں کو ان کی اصل قدر پہچانتے تھے۔ وہ خوب پوری طرح دنیا سے ڈرتے ہوئے تھے۔ سرف میں تھا، شاید وہ عزت شہرت، عہدے پیسے اور دلیس عوامی سے بے تاب ہونے والا۔

کندن سرکار بہت مقبول تھا جہاں وہ رہا ضرور، جیسے قریب نہیں رہا جا سکتا۔ ان کے وجود کو ہمیشہ کے لیے ضرورت کی چیز بن گیا۔ حکومت کو پتہ نہیں تھا اس نے سے وقوف بنا رکھا تھا۔ اسے ادبی شہرت تھی، ان کا ادیب و دانشوروں سے بات چیت کرنے ان کے درمیان کھلے تھے اور انہیں شراب پینے کی عادت رہی تھی۔ اس شہر میں ہی ہو اور سب وہ ان کا تھے، لیکن کندن سرکار ان سے کبھی گھبرایا نہیں۔ وہ ایک خوش مزاج ہاتھ رکھتا تھا۔ ایک وقت میں ایک، وہ کرتا چلا جا رہا تھا۔ ان کے ساتھ رہتے ہوئے لوگوں کندن سرکار کا گھمنڈ کرتے تھے۔

ان دنوں کندن سرکار کا گھمنڈ میں تھا۔ وہ مجھ سے دور بھی نہیں ہوا کا ان کو میری بات کافی ہمدردی تھی۔ پھر وہ کہتا دوست میں ان کے گھر میں گھستے ہوئے مجھے کار یہ شخص دوست اور ہم دونوں نہیں ہو سکیں گے لیکن اس کا ہمیں کوئی جواب نہیں ہے۔ شراب جیسے نہیں خوشی ہو گئی تھی۔ کسی سے شراب کی پیاس کی کمی بہت سکی دی ہوئی دولت تھی۔

شروع میں اس نے مجھے معمولی شراب پلائی جب کہ اس کے پاس یقیناً ولایتی شراب کا بھی اسٹاک موجود تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اسے کسی ادیب و دانشور سے۔ دوسری بات یہ کہ میں ایک معمولی شخص تھا۔ اگر میں مالدار دانشور ہوتا تو کندن سرکار کا سلوک کچھ اور ہی ہوتا۔ کندن سرکار نے مجھے کبھی نہیں دیا۔ میرے ساتھ وہ دوسرے کی طرف زیادہ جھکتا تھا۔ اس نے مجھ سے کئی بار ادبی حلقوں میں چھپے ہوئے لوگوں کا کچھ پتا نہیں تھا۔

میرے ساتھ ان کی یہ حالت تھی کہ میں ان پر شیشے ٹوٹتے ٹوٹتے جانے پر وہ کچھ بھی نہیں کرتا تھا۔ کبھی دن ایسے نکل جاتے کہ چائے کافی کے علاوہ کچھ بھی ٹھوس پروگرام نہ ہوتا۔ وہ ہمیشہ بات بات پر سیدھے جواب دیتا جب کہ اس کی جیب میں اس وقت مہنگی ولایتی سگریٹ بھی ہوتی۔ مجھے اس

میں کیا فائدہ تھا، پر میں پتا نہیں کیوں انتظار کرتا رہا۔ کندن سرکار کے لیے یہ دن بڑے مزے اور تمنا پوری ہونے کے دن تھے۔ کیا سی پتنگیں جو تیاگ کے بیٹھے میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر آیا تھا؟ وہ کہتا بھی تھا: یار، کھلی زندگی کا مزہ پہلے کبھی نہیں آیا۔

مزہ نہیں آیا اڑنے کے لیے آنے والوں کے پاس، کتنے کی ور ... میں آرہا ہوں، مجھ سے کٹ کر طبیعت ہوئی کہ پہاڑ پر رکھ دوں اس کا اور پتا ڈھونڈوں۔ مجھے شرم سی ستاتی تھی۔ اپنے ساتھیوں کو دھوکا دے کر، نہیں اپنے سے سب خبر دے، میں یہاں موت کے لالچ میں چلا گیا۔ وہ تب تک کہ ساتھی میں زندگی کو پھانس دیے گئے، باوجود اس کے اپنے کو دھتکار دیتے جلاتے نہیں۔ وہ لوگ بہت ہیں اور دکھی ہونے والے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جلدی نکلا جائے، گلاب کے کی حالت کو تمام کر دیا ہے۔ بھائی کا لو نزدیک ہے اور اب ٹھکانا ہو جائے گا۔

جلد ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ کندن سرکار کا ساتھ دینا سخت مشکل کام ہے، ور نہ بہت ہوئی تھی۔ رہ رہ کر گھبٹے اس کے ساتھ شرارتی بات چیت کرنے کی طاقت آپ میں ہے تو آپ سے کبھی بچ سکتی ہے۔ مجھے اس کی رنگ بدلت کا پتا نہیں تھا۔ شروع میں اسے ہو سیر کی طرح پریشان رہتا تھا۔ ... صورت حال ہو اور بات چیت کا کیا ہی رنگ، اس کو سطح پر کی طرف موڑتے ہیں ... اسی وقت نہیں تاثرات جیسا ایک کیسر بدل کر دوسرا کیسر اٹھاتے میں لگتا ہے۔ مجھے تو مہارت نہیں تھی۔ میں بہت جلد ... سے بول گیا۔ ... حد سے زیادہ برداشت کے باوجود سچائی کا لمحہ آ ہی گیا

کندن سرکار نے ایک بار مجھے تفصیل سے بتایا تھا کہ ... ، ... ہوئی زندگی جینی چاہیے۔ ... اس کا تجربوں سے ہی رہ سکتی ہے۔ ... بے شمار ... کے ... اپنے یاد تھے ... نے ... کے ... پر اپنے وقت کے تمام ریکارڈوں کا ... کر دیا تھا۔ ... لیے عجیب و غریب ہوتے تھے کہ ... پیٹ جیسے کوئی چاہتا تھا۔ ... کا کہنا تھا ... کے کھیت ... زندگی کھاد ہے، ... انسان اور ... فصل ... جیسے عورت ... کی مٹی ہے ... اور ... پھل۔

مجھے بھی بولنا پڑتا تھا۔ خاموش رہنا مشکل تھا۔ ... سے پتا چل جاتا کہ میں کیا ... شخص ہوں تو ... سے پہلے کہ میں فیصلہ کر کے خود کیسٹ ... ہوں، وہ مجھے ... کر دیتا۔ ... سینے میں ... سے ... چھپاتا رہا۔ آپ کی باتوں میں عجیب کشش ہے۔ میں کہتا۔ وہ چہک کر بولتا: کشش! حقیقت کو آپ کشش کہتے میں! شاباش!

اس نے مجھے بار بار بتایا کہ وہ ہوئی کا پجاری ہے۔ تم دیکھو میں ... سکتا ہوں ... کیوں پیتا ہوں، سڑکوں پر پیدل کیوں گھومتا ہوں، بار کھادی کیوں پہنتا ہوں، گاڑی ہوتے ہوئے بھی پیدل کیوں چلتا ہوں، جب کہ میں ... نہیں ہوں۔۔۔ بس ٹھکچول ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ مجھے کہانی خوب صورت لگتی ہے۔ میں بس جمع کر رہا ہوں

Scanned with CamScanner

کسی طرح وہ آخری دن آ گیا۔ زکام سے میری طبیعت چڑچڑی سی ہو گئی تھی۔ ناک کی حالت ٹوٹی جیسی ہو گئی تھی۔ ایک عجیب چڑچڑاہٹ سی ہو گئی تھی۔ زکام کی وجہ سے آخری دن ادھورا ہو گیا۔ ادھر یہ عجیب اتفاق تھا کہ کندن سرکار کی باتوں میں نئی دلچسپی میرے لیے ابھر رہی تھی۔ اس دن ہی نے خوب خرچ کیا۔ صبح سے شروع ہو کر شام تک ہم چلتے گھومتے رہے۔ میرے دل میں کچھ کچھ تھا، یادہ سے زیادہ لوٹ لو کندن سرکار کو، ہماری سمجھ میں آنے والی سے ہی بچتے گئے رہتے۔ جب شام ہوئی اور بتیاں جلیں، وہ مجھے ایسے ریستوران میں لے گیا جہاں میں کبھی نہیں گیا تھا۔ وہ ایک شریف جگہ تھی کہ میں وہاں جا ہی نہیں سکتا تھا۔ اگرچہ مالی مسئلہ بھی تھا، مگر اصل میں شریف لوگوں سے میں ہی نہیں جاتا۔ وہاں میں مضطرب ہو جاتا ہوں اور اکتاہٹ آنے لگتی ہے۔ اس دن کی بات کچھ اور ہی تھی۔ میٹھے میں شہد کی طرح نشے میں جسم ہوا تھا اور جسم پیڑ کی طرح میرے سامنے جھوم رہا تھا۔

ریستوران کا ماحول بدلا ہوا تھا۔ مدھم روشنی تھی اور مردوں عورتوں کی تعداد برابر لگتی تھی۔ چاروں طرف خوشبو میں لپٹی ہوئی میزیں اور ادھر ادھر ہوتے پردے پڑے ہوئے تھے۔ ہمیں دو کرسیوں والی ایک ٹیبل مل گئی۔ کندن سرکار کے کوٹ میں ایک ٹائی لگا دی تھی۔ بیٹھنے کے تھوڑی دیر بعد وہ تاک میں لگ گیا۔ میں اس حد تک کافی پھنسا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ دھیرے دھیرے میری سانس بحال ہو گئی اور میں ہوشیار ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں نے ایک ساتھ اتنی عورتیں اور آدمی کبھی نہیں دیکھے تھے۔ میرا دماغ درد اور زکام میں رہے سے پہلے کہیں صاف ہو گیا تھا۔ یہاں تھوڑی دیر مجھے اپنے حالات و گھر کا دھیان آتا رہا۔

کندن سرکار نے بتایا اس ریستوران میں زیادہ تر اونچے افسر اور ان کے بچے ہی آتے ہیں۔ مجھے فوراً یقین ہو گیا کہ یہاں بیٹھے ہوئے لوگ اونچے افسر ہی ہو سکتے ہیں۔ اس جگہ کا اصل دنیا سے کوئی واسطہ نہیں لگتا تھا۔ یہاں کوئی شخص غمگین، کسمپرسی کا شکار نظر نہیں آ رہا تھا۔ سب تندرست، تر اور چکنے چہرے تھے۔ کندن سرکار بھی کسی ترو تازہ کا رنگ لگ رہا تھا۔ صرف ایک اکڑے ہوئے شخص کو شکر شراب پلا دینے سے کیا اس کا مقام اس دنیا سے ملایا جا سکتا ہے؟

میں نے غور کیا، یہاں ہر وقت کی عورتیں تھیں۔ کچھ بالکل ہلکی پھلکی اور کچھ ایسی جنہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ ابھی بکھر جائیں گی۔ سانولی عورتیں مردوں کے ساتھ سب سے زیادہ لڑکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ مرد کچھ بولتے نہیں تھے۔ چہروں کو چمکتے ہوئے وہ دوسروں کی عورتوں کو نظروں سے مہذب طریقے سے چاٹ رہے تھے۔ وہ اپنے علاوہ دوسروں کو وہاں موجود ہی نہیں سمجھ رہے تھے۔ یقیناً وہ اس دنیا کا ہی شکار تھے اور ان کا بیان میں کیسے کروں، بہت سے اور دیوانے بھی ہیں۔۔۔ میرا دماغ ایک دم سے زنگ ہو گیا۔ آخر تو لوگ کب تک غلام رہے ہوں گے اور کب تک ہم گشت کرتے رہیں گے!

جب تک کندن سرکار ٹانگوں کے بیچ ایک بوتل توڑ کر دو پانی کے گلاسوں میں ڈال چکا تھا۔ اب پانی کی دونوں ٹیبل پر رکھی تھی اور وہ آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے پی رہا تھا۔ کسی ڈانس پر ہلکی موسیقی شروع ہو گئی، جیسے سیلاب بہ رہے ہوں، خواب ہوں، اور جیسے قتل کیے جانے والوں

کی چیخ پکار بھی ہوتی ہو۔ سب کچھ میل کھاتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ شراب تھی یا میرا اصلی روپ، مگر مجھے سردار کی آوازوں سے متلی ہونے لگی۔ میں نے سوچا، اس سے پہلے کہ اندر کی گڑگڑاہٹ اچانک مدہوش دانتے میں تبدیل ہو جائے، مجھے کچھ کرنا چاہیے۔ دراصل ستانے نے تو گویا گلے کے بیچ کھٹکنا شروع کر دیا ہے۔ میں نکلنا نہیں چاہتا، اگرچہ چاہتا ہوں۔ کتے نے مجھے پکڑ رکھا تھا۔ نہیں تو اس وقت مجھے پتا ہے، کیسا کر زیادہ سے زیادہ دوچار گالیاں بکتا اور سو سو ہو جاتا۔ فی الحال میرا دماغ ایک بڑی مستی سے بھرا ہوا تھا۔

میں نے غور کیا کہ پہلے سے صورت حال بہتر ضرور ہوئی ہے۔ پہلے میں صرف مسکراتا تھا۔ جیسے دنیا ایک چیستان ہے اور میں اسے سمجھ گیا ہوں۔ دراصل یہاں تک پہنچی کہ اس مسکراہٹ کی وجہ سے مجھے گھونگا کہا جانے لگا۔ اس سرکاری خود مسکراہٹ سے نظام کا تو کچھ بگڑتا نہیں۔ دراصل مسکراہٹ تو راجا کی ہوتی ہے، منسٹر کی ہوتی ہے، عورت کی ہوتی ہے، اور جن کا جسم خطروں سے آزاد ہے ان کی ہوتی ہے۔ مسکراہٹ بس تو اب الٹی آنے لگی ہے۔ توڑپھوڑ اچھی لگتی ہے۔ بھرپور طریقے سے یہ بھی ہوتا رہے، یہ بھی آسان نہیں ہے، کیوں کہ جمہوریت کے رونس اور شہری پن کے احساس کو پتا نہیں کب اندر ایسے کوٹ کر بھر دیا گیا ہے کہ توڑپھوڑ تو درکنار ہو جاتی ہے، اپنی رہ جاتی ہے بس ایک سسکی بدبد۔

میں نے جلدی سے پیالہ گلاس اٹھایا اور پی گیا۔ مجھے ڈر ہوا، آج کی الٹی اور بے چینی اور پنپتی ہوئی طبیعت کہیں جاگ نہ جائے۔ کہیں مسکراہٹ کے دن نہ آ جائیں۔ مسکراہٹ توڑنے سے کھود ڈالنے سے، میں نے کندن سرکار کی طرف دیکھا۔ آج میرا آخری دن ہے۔ آج کے بعد میں تمہارا گھنٹا نہیں رہوں گا۔ کندن سرکار! کندن سرکار کو اس کا کیا پتا۔ وہ اطمینان سے پی رہا تھا۔ پھر ابھی شہر میں بہت سے لوگ موجود تھے اس کا گھنٹا بننے کے لیے۔

کندن سرکار نے گھڑی دیکھی، بیرے سے کچھ کھانے کو منگوایا اور مجھے دھیمے سے بتایا 'وقت ہو گیا ہے، اب چھوکری آنے کی گانا گانے۔'

"ٹھیک ہے، چھوکری کو آنے دو،" میں نے کہا۔

کندن سرکار نے بچی کچی شراب بھی گلاسوں میں نکال دی اور میں کرسی ٹھیک کر کے، ڈائس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس طرح بیٹھ گیا جیسے سامنے ظلم ہونے والا ہو۔ میری نظر کے سامنے ایک عورت کی کھچڑی بالوں والی، کالی کھوپڑی آ گئی تھی، اس لیے میں نے کرسی ٹھیک کی۔ اسی دوران کچھ مضبوط اور تندرست تنومند سے آئے اور ہال کا پورا چکر مار کر واپس کہیں مڑ چلے گئے۔ شاید وہ جانچ پڑتال کرنے آئے ہوں گے۔ سب سے پہلے تو میں نے سوچا، یہ لوگ ہال کے چکر میں ہیں، مگر نہیں، وہ لوگ صرف ذمے داری دکھاتے ہوئے چلے گئے۔ جیسے پولیس کا مقصد ہے، جنتا کے لیے سڑکوں پر پریڈ کرتی ہے۔

لڑکی دائیں سے ہال میں آئی۔ پتا نہیں تھا کہ وہ چل رہی ہے، وہ تیر رہی تھی۔ ڈائس پر چڑھنے سے پہلے وہ سب طرف گھومی، جیسے سبک کاغذ کا ہوائی جہاز ہوا میں اڑتے ہیں۔ اس کا چہرہ تر و تازہ تھا اور وہ چھوٹی سی لڑکی لگتی تھی۔ اس کے دھڑ پر ڈیڑھ فٹ کا بے حد کسا ہوا ایک سنہرا کرتا تھا۔ وہ کافی لوچ طریقے سے

Scanned with CamScanner

گھومتے ہوئے گاتی رہی۔ [illegible] اُن کی آنکھوں اور ہونٹوں پر دیکھی جا سکتی تھی۔ گاتے ہوئے وہ اکثر [illegible] کے روبرو ہے۔ [illegible] کو پردوں کی طرف ہال میں بلانے کا کھیل کرتی تھی۔ دراصل یہ اُس کی حرکت تھی [illegible] دونوں ہاتھ ملا کر [illegible] سے گانے کے بول یاد کرتی تھی۔ [illegible] پیشے اور سوتی رات کا [illegible] نہیں تھا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد [illegible] سے [illegible] کے ساتھیوں کو [illegible] اور شرابور کرتی چلتی تھی۔

ریستوران بدنت سے بھر گیا تھا۔ [illegible] میں جیسے ہوئے لوگ [illegible] آواز کیے باتیں کر رہے تھے۔ میں نہیں [illegible] [illegible] کی بیٹی نے ماپ سے زیادہ [illegible] کا [illegible] ہوگا۔ [illegible] سے تھے کہ کافی ہوئی لڑکی [illegible] سے [illegible] [illegible] کی عورتیں [illegible] نہیں تھیں۔ اُن کی آنکھوں میں [illegible] نہیں چمک [illegible] تھی۔ دراصل [illegible] [illegible] سے تھے کہ دیکھو تم سے علاوہ [illegible] مل سکنے والی چیزیں ہیں۔ عورتیں کی جیب [illegible] رہتیں۔ [illegible] [illegible] بیٹ کار [illegible] [illegible] جارجٹ کے [illegible] ہونٹوں [illegible] سمارٹ [illegible] [illegible] کا [illegible] [illegible] کا پروموشن نہیں ہوا ہے۔ جو ہیر سے [illegible] [illegible] خوبصورت سے، [illegible] لیڈر ہوئی ہے پر تو [illegible] ہو جائے گا

[illegible] ہے [illegible] تیسری ٹیبل پر [illegible] لمبی [illegible] تیسی [illegible] والا ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا تھا۔ [illegible] آنکھوں میں [illegible] [illegible] والی عورت کا [illegible] تھی۔ [illegible] ہوئے وہ [illegible] کی طرف [illegible] [illegible] ہوئے جیسے مونچھ اور گال کا کھیل غیر ارادی ہے۔

میرے دیکھنے کی [illegible] ایک عجیب بات ہوئی۔ [illegible] کے ساتھ جو گا رہی تھی۔ [illegible] کا [illegible] لگاتار [illegible] [illegible] [illegible] ہنسنے کی وجہ سے [illegible] لباس کے بیچ لٹک گیا۔ اُس کے [illegible] لباس کے [illegible] میں وہ میرا کچھ [illegible] تھا۔ منگیت کے [illegible] [illegible] رہا تھا۔ میں [illegible] [illegible] کے [illegible] سے [illegible] [illegible] کا ہو۔ وہ کافی [illegible] سکتی تھی [illegible] کسی وقت آدمی کو [illegible] پر [illegible] سکتی تھی۔ [illegible] سر کا، چونک پڑا۔ اسے کافی شراب کے بعد ہی [illegible] کا ہوش تھا اور [illegible] بھی [illegible] کری۔ یہ ہوش ایسا ہے جو سب کچھ کے بعد بھی زندگی کو مضبوط رکھتا ہے اور [illegible] ہے۔ [illegible] سر کا [illegible] مجھے [illegible] طرح گھور کر دیا۔ [illegible] سے [illegible] ہے۔ [illegible] تمہارے علاوہ یہاں کوئی [illegible] ہے؟ مہذب ہونے کی وجہ سے یہاں [illegible] ہوئے لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ [illegible] کا [illegible] ہے جو وہاں لٹک گیا ہے [illegible] رعب سے بولا "تم نے شاید اسے پیٹر ولا سمجھ لیا ہے۔

[illegible] میں کھڑا ہو گیا۔ پیٹر ولا کا نام میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میرے ہاتھ میں [illegible] کی گردن تھی۔ وہ [illegible] سے چاپلوس ہو گیا۔ میرے دوست تمہیں نشہ ہو گیا ہے۔ [illegible] کا پانی [illegible]

ہوں۔ اس نے مجھے پکار کر ڈانٹ دیا۔ پہلی بار اس نے میرے ساتھ بڑی شستہ زبان کا استعمال کیا اور پہلی بار بہ صد ادب پیش آیا۔ جو بھی ہو، اس نے میری حیثیت میں دلچسپی لی تھی۔

میرا اشتعال ابھی پوری طرح ٹھنڈا نہیں ہوا۔ طبیعت کا رخ بیزاری کی طرف پلٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے گھبی اور پانی دونوں پیتے ہوئے میں اسی طرح بیٹھا رہا جیسے اکیلا ہوں اور سامنے کندن سرکار ایک ارتھی کی طرح کھڑا ہوا ہے۔ مجھے ان کی ڈانٹ ڈپٹ کا احساس ہو رہا ہو۔ میں کندن سرکار کے پاس شراب کا لطف اٹھانے آیا تھا، ڈانٹ ڈپٹ سہنے نہیں، لٹریری بات چیت کرنے اور ہمدردی دکھانے نہیں آیا تھا۔ کندن سرکار کے لیے سب حیا مسرا ہوا ہے۔

افسوس اور غصے کا عجیب کاک ٹیل دماغ میں بنا ہوا تھا۔ چاروں طرف گندی گندی چھپکلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ پتا نہیں کہاں گم ہو گیا ہے میرا جنگل پن اور زندگی کا جھٹکا۔ بس جھنجھوڑیں بجا رہے اور زیادہ سے زیادہ ایک تھوتھو۔ اندھیرا بڑھتا ہوا پھیل رہا ہے۔ بس بجلی گئی، دماغ جھنجھنا رہا ہے۔ اچانک میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو مخاطب کرنے لگا: ارے فوجی بچو اور مارو! دور نہیں ہے وقت۔ تمہاری بات پلٹ کر دوبارہ دے کی زندہ لوگوں کی بیعت تڑ ہو جائے گی۔ پکڑے پکڑے پھرو گے۔ یہ جو عقلیں تمہارے پاس ہیں اور جو صرف تمہارا پیٹ ڈھو رہی ہیں، تمہاری نہیں رہیں گی۔ سنبھالو، یہ تلوار، عقل کا کام پیٹ ڈھونا نہیں ہے۔

ہاں نہیں تو! دس سال برباد ہو گئے، کبھی ہنسی کبھی مسکراہٹ، کبھی مسکراہٹ کبھی ہنسی بس یہی بدحزمی۔ وطن کے لیے سوکھی سنو رو کا مشغلہ ان ترقی پسندوں اور سنجیدہ نابالغوں کی زندگی کو کچھ بھی پیدا نہیں ہو۔ یہ کشتی سے دور ملک جیسے نادری کے ایک سینٹی میٹر والے فلاں پروگرام کی میں گھس رہا ہے کا کر رہے تھوڑا ٹھنڈا ہونے پر مجھے خیال آیا، ہمارے سیکڑوں تندرست نوجوان سب کچھ چھوڑ کر رسوں سے کشتیوں کے بچے کاٹے کا اپنا رہے ہیں۔ اف! جیل کاٹنے کا راستہ بھی پورا نہیں ہو گا۔

ریستوران کے ہال میں بدامنی بڑھتی جا رہی ہے۔ وہاں بیٹھے لوگ خطرے میں پھنس رہے ہیں۔ مجھے خوشی ہو رہی تھی اور ایک کڑھے پیچھے میں ڈوبتا چلا جا رہا ہوں۔ رگوں میں لہو بے خوف ہوتا جا رہا ہے۔ آرکسٹرا کال میں بدستور بج رہا تھا، بس بس کرتا ہوا۔ لڑکی کسی طرح ڈوبتی لے میں ڈوبتی چلی جا رہی تھی۔ دماغ میں کوئی نامعلوم اور چپ چاپ طریقہ چل رہا تھا۔ انقلاب ضرور آیا ہو گا، یہ آخری وقت ہے۔ اس کے بعد انقلاب کی پڑھیے رہے تو سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے گا۔ یکایک کیا ہوا، میری کرسی پیچھے آپ لڑھک گئی، آپ سے باہر ہو گئی۔ کندن سرکار نے پھرتی سے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچنا چاہا، وہ مجھے تاک رہا ہو گا۔ لیکن تب تک کوکا والی بوتل مٹھی سے باہر ہو چکی تھی، بے حد جھنجھناتے شور کے ساتھ۔ سامنے کانچ کی دیوار ٹوٹ پھوٹ گئی۔ میں جاگ سا گیا اور دیکھا ڈسکس پر سے لڑکی بدحواس، پولیس پولیس چلاتی، بھاگ رہی ہے۔ وہ دوڑتی ہوئی ایک دم سے گری، دم سے باہر آتے ایک غنڈے کی گود میں گر گئی۔ میں نے بھی پستول نکال لی اور کمانڈر کی طرح لوگوں کے سامنے تن کر چلانے لگا: چلے جائیے آپ لوگ یہاں سے،

Scanned with CamScanner

نہیں تو دھر دیا جائے گا" اور پتا نہیں کیا کیا۔

جب مجھے ہوش آیا اس وقت بھی مار پڑ رہی تھی۔ تین چار غنڈوں کے بیچ مجھے ادھر سے ادھر دھکا دیا جا رہا تھا۔ ایک آدمی ڈانٹتے ہوئے تماشا دیکھنے والے لوگوں کو اپنی اپنی جگہ بیٹھنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ ایک غنڈا ذری موٹی گالی کا نام لے کر میرے بدن پر گرا اور وہاں تو گویا ہر طرف ستم کا ہجوم ہو گیا۔ اس نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور ہاتھ سے اسے الگ کیا اور کالر سے اسے کھود دیا ... کھونس لیا۔ میری پیٹھ کی گہرائی کر رہے ہو۔ جو نمایاں شخص تھا، سب کلو کرو کلو کرو کہہ رہے تھے۔ جس طرح سے ثقافت والے کا ملبہ صاف کیا جاتا ہے ... ہی طرح کھڑے ہوئے کا بچ گیا۔ مجھے مٹانے کی ساری دوڑ ہو رہی تھی۔ کلو کرو نے چبوترے پر ایک ہی لات دی کہ میں سیڑھیوں سے دور نیچے تک لڑھک گیا۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لیے لندن سرکار کو کھوجا، مگر وہ پتا نہیں کب کھسک چکا تھا۔ میں نے لندن لندن آواز بھی دی، تب تک کلو کرو نے لندن کے نام پر مجھے ایک گھونسا اور جڑ دیا۔ میرے جسم کے حصوں میں سب پھٹ رہے تھے۔ میں فٹ پاتھ کا پایہ پکڑ کر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہیں ایک سے حد درجہ ... شخص سکھوں کے شکار میں تھا۔ اس کے ساتھ کی عورت کے کان میں کہا: یہ مس ایلزبتھ ہے لوفر۔ عورت ان کی دعوت کے ساتھ خوش تھی۔ اس پر کوئی اثر نہیں پڑا، وہ مجھے دیکھ کر منہ منہ مسکراتی رہی۔

میں اپنے چبوترے پر دوسری لات کھانے کی حالت میں نہیں تھا۔ تب میں تھوڑی سی ہمت اٹھا کر وہاں سے اتر کر بھاگنے لگا۔ مجھے وحشیوں نے ... میں کہیں بیچ میں ہی بیہوش ہو گیا۔ وہاں سے کہاں ... دوڑتی بھیڑ میں اس کا کچھ ہو گیا۔ بچے بھیڑ میں سے دوڑ کر کھیلا اور سلام مارنے لگے ... کیا پتا تھا یہ سلام والا آدمی نہیں آ رہا ہے۔ وہ بے صبر شخص تھا۔

ایک طرف سے لندن سرکار کا گھونسا سڑک پر گر پڑا۔ جس طرف میری سڑک پر ... سے ہلے ... اور چوٹ نہیں لگی، ویسی میری حالت تھی۔ ... سڑک پر آیا جو کافی سنسان تھی۔ سڑک کی ٹریفک ... بند ہو چکی تھی۔ ... چلتا ہوا میں بڑی بڑی قد آور عمارتوں کے سائے میں ... مجھے دیکھ کر انھوں نے ایک ... قہقہہ لگایا۔ اس کے علاوہ کوئی برا سلوک انھوں نے نہیں کیا۔

**

# اُدے پرکاش

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی


## رام سجیون کی پریم کہانی

جہاں کبھی برس پہلے گاؤں تھا اور جہاں بیلوں کے گلے میں بندھے ہوئے کالے سینگ تھے، دوپہر کے جنگل میں پتوں کی گہری ہری خوشبو تھی اور کچے آم کی تازہ کٹی پھانک کے ساتھ نمک مرچ کا سواد تھا، دھان کے مہکتے ہرے کھیت تھے، جہاں اندھی بڑھیا ہیرا جن تھی جس کی باڑی سے لڑکے کھیرا اور بھٹے چرا لاتے تھے... رام سجیون کا بچپن وہیں پیچھے کہیں چھوٹ گیا تھا۔ پندرہ سال پیچھے۔

ان کا بچپن بستی کے ان کھیتوں میں کہیں رہ گیا تھا جہاں وہ اسکول سے بھاگ کر چھپ جاتے تھے اور دوسرے لڑکوں کے ساتھ گدھا چھپ بیڑی کے سٹے کھینچتے تھے۔

برہمن گھرانا تھا۔ اوسط کسان طبقہ، ایک ایسا طبقہ جس کی گاؤں میں اب کچھ نہیں رہتی۔ جو گاہے ماہے بڑے کسان یا زمیندار کو بھی چھوٹا موٹا قرض دے سکتا ہے یا پنچایت کچہری میں مدد دو مزدوری کر سکتا ہے۔ ملا واسطوں یا بے رحموں کو تو غلہ نہیں دو بیج بھرا یا بیماری، ٹونی کے لیے سو یا ڈیڑھ سو یا دو سو دے ہی سکتا ہے۔

ایک ایسا کسان گھرانا جہاں گاؤں سے زمیندار کے گھر آیا ہو پٹواری لوٹتے ہوئے ایک بار ضرور رکتا ہے پان لے جاتا ہے۔ تھوڑا بہت ہنسی ٹھٹھول بھی کر جاتا ہے۔

رام سجیون پاس کے قصبے کے ہائی اسکول اور پاس کے شہر کے گورنمنٹ کالج کو دوست ڈویژن میں دیکھتے ہوئے اب دلی کی اس یونیورسٹی تک آ پہنچے تھے جو ملک کی اب ... نہیں، کہا جاتا تھا کہ ایشیا، جنوبی ایشیا کی تو یہ بڑی تیسری دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی۔ اس یونیورسٹی میں ہر منسٹر کی بہو، پولیس منسٹر کی پوتی، کرنل ... جی کی بیٹی، ... جی کا بیٹا اور ملک کے سب سے بڑے ادیب کا سب

سے بڑا سالا پڑھتا تھا۔

یہاں زیادہ تر لڑکے لڑکیوں کے رہن سہن اور مزاج کا ایسا ہی ڈھنگ تھا۔ وہ بڑے نرم و نازک، شفاف اور حساس لگتے۔ ہنستے تو اتنے خوب، جیسے نہ گاؤں کی سی، تمباکو اور نشے میں ستھری، روتے پیٹنے کی طرح بدصورت دکھائی دیتی۔

اور لڑکیوں کا تو کہنا ہی کیا۔ ان کا تو الگ ہی تمیز بھرا اور الگ ہی روشنی تھی۔ وہ زیادہ تر جینز اور کھلی بانہوں والی ہوتیں۔ انہیں بہت صاف سپید آٹے کو دودھ میں گوندھ کر، اس میں تھوڑا سا مہاور(۱) ملا کر بنایا گیا تھا۔ کھلی بانہیں، بال کٹے ہوئے۔ گھنشیام جیسی ہستی کا تنہا بڑا مسئلہ رام جیون کو اپنی زندگی کی بابت ایک بار سرے سے غور کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ وہ چاہے کلاس میں ہوں یا چپ اکیلے کمرے میں، سانس بھی لیتے تو ان کے ساتھ خوشبو یا سینٹ کی مہک ان سے دور تک پہنچتی۔ اس خوشبو میں گاؤں کے پسینے کی سب انہیں کیسی لگتا ہے وہی خوشبو کیسی ہوتی

لیکن رام جیون کے اندر ایک گہری چڑ اور غصے نے بھی سر اٹھانا شروع کر دی۔ اس بڑے، لق دق شہر میں، جہاں اونچی اونچی دکانیں، تو شیشوں کاروں کی چمچماتی دھوپ تھی، انہیں اپنے گاؤں کا بڑے سے بڑا سال بھی قلابازی دکھائی دیتا۔ اپنے ٹیریکاٹ کے کپڑے نہیں سجتے، میلے اور بھدے ہوتے لگتے۔ اپنے چہرے میں گاؤں کی مٹی کا میلا بھار، موٹے ہونٹ، دھوپ اور دھول کو جھیل کر زندہ اور پیلی سی آنکھیں، تیل اور سرسوں کے تیل کو پی کر موٹے اور کالے پڑے بال۔ یہ سب انہیں گنوار لگتے۔ وہ کالے تو نہیں تھے، پھر بھی انہیں لگتا تھا کہ ان کے گیہوئیں رنگ سے گاؤں کا میلاپن کبھی چھوٹ نہیں سکتا۔

دلی ایک ایسا شہر تھا جہاں روپیوں کی ندی کی وحشت سے باہر آتی تھی۔ وہ شہر کوئی اتنا بڑا شہر رام جیون نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ ایک بار، جب وہ بالکل نئے تھے، ایک لڑکے نے ان سے ان کے جوتے کی قیمت پوچھی۔ وہ سو روپے کا ... پوچھتا ایک لوشن ... کے بارے میں پوچھ ڈالے گا۔ پھر تو ان کے دیکھتے دیکھتے یہ پوشیدہ طریقہ ہی ہو گیا۔ اگر کسی کے ہاں کوئی نئے مال کی آمد ہوتی اس کے مطابق وہ چیزوں کو کسی بھی بات کی قیمت کے عدد میں بدل دیتے۔ انہیں جب مزہ آتا۔ اس آدمی نے کل ملا کر تین سو شرٹ پہن رکھی ہے۔ اس لڑکی نے چار سو کا کلور ... ایک کلائی میں پہن رکھی ہے۔ مکان کا کرایہ ساڑھے تین ہزار ... پانی تک۔ اور وہ دیکھو ... بڑی کار لیے اور پر چڑھا ہوا ہارن بجاتا بھاگا جا رہا ہے۔

لیکن یہ سب ایک دلچسپ، تفریحی کھیل ہی نہیں تھا، یہ بہت گمبھیر اور دردناک تھا۔ گاؤں کا اوسط

(۱) مہاور: وہ سرخ رنگ جس سے عورتیں پیروں کو مہندی کی طرح رنگتی ہیں۔

کسان طبقہ شہر کے نچلے درمیانی طبقے سے بھی نچلی حیثیت کا ثابت ہوا تھا۔ کسی دفتر کا چھوٹا موٹا بابو بھی معیارِ زندگی اور رہن سہن کے لحاظ سے زیادہ خوشحال اور چمکدار دکھائی دیتا تھا۔

رام سیون کے دماغ میں سماجی مساوات کے لیے ایک شدید خواہش جاگ گئی۔ یہ سب ناانصافی ہے۔ اس دیش کی اسّی فیصد جنتا کو زندہ رہنے کے لیے جتنی کیلوریز طاقت کی ضرورت ہے، اتنی بھی اسے نہیں مل پاتی، اور دوسرے ساڑھے تین کروڑ لوگ اتنی شراب ایک بیٹھک میں پی جاتے ہیں! رام سیون کو پرانی دلّی کی جامع مسجد کے سامنے کے فٹ پاتھوں پر پڑے ہوئے بچے، اپنے گاؤں کے لوگ دکھائی دیتے۔ اتنے ہی غریب، اتنے ہی ننگے، اتنے ہی بھوکے۔ انقلاب کی ضرورت ہے، بار بار رام سیون نے سوچا۔

یہ انھیں دنوں کی بات ہے جب ملک کے شمال مشرقی علاقے، جنوب میں آندھرا پردیش اور بہار، اتر پردیش کے مشرقی اضلاع اور علاقے میں بے زمین اور چھوٹے کسان مل کر تحریک شروع کر چکے تھے۔ انھیں پولیس مقابلوں میں مارا جا رہا تھا، جیلوں میں ٹھونسا جا رہا تھا، سرعام ان کی آنکھیں پھوڑی جاتی تھیں اور عورتوں کے جسموں میں لاٹھیاں بھی ڈالی جاتی تھیں۔

رام سیون کو لگا کہ ان کے دل میں یقیناً ہی سے غریبوں اور بے چاروں کے لیے گہری ہمدردی رہی ہے۔ انہیں کئی واقعے ایسے یاد آئے جب وہ اپنے گھر سے مٹی اور چاول چرا کر غریبوں کے گھر میں دے آتے تھے جہاں کئی دنوں سے چولھا نہیں جلا ہوتا تھا۔ اپنے پرانے کپڑے تو وہ گاؤں کے لڑکوں کو دے ہی دیتے تھے۔

سوجھ بوجھ اور دانائی رام سیون میں بہت تھی۔ انھوں نے سماج کو سمجھنے کے لیے طرح طرح کی کتابیں پڑھنی شروع کیں۔ سرمایہ، [illegible]، اینٹی ڈیورنگ، ایٹینتھ برومیر آف لوئی بوناپارٹ، "ہولی فیملی" سے لے کر لینن اور ماؤ کے خیالات تک کا مطالعہ کیا، اور دھیرے دھیرے سماج کا ایک خوب صورت نقشہ ان کے دماغ میں بنتا گیا۔

لیکن گاؤں چھوڑے دس سال ہو رہے تھے۔ فیلوشپ ملتی تھی، اس لیے وہاں جانے کی ضرورت کبھی ہوئی نہیں، اور دھیرے دھیرے گاؤں کے لوگوں کے نقشے اور رنگت چہرے ان کے دماغ میں دھندلے اور بے شکل ہونے لگے۔ کھیت غائب ہوئے، چیزوں کو جیسے دل کر دیکھنے کا ہنر بھی بسر گیا۔ موسموں کے بسنے کی جانی پہچانی گندھ، بکریوں کی لو کے ساتھ پتا نہیں کہاں گئی۔ اب ان کے دماغ میں سماج کی طبقاتی بناوٹ تو صاف تھی، لیکن لوگوں کے چہرے غائب ہو چکے تھے۔

یونیورسٹی کا ہوسٹل تھا جس میں رام سیون رہتے تھے۔ جینز پہنتے تھے، اس کے اوپر کرتا اور داڑھی۔ چشمہ لگانے لگے تھے۔ یونین میں فعال تھے اور یونین کے عہدے دار انہیں سب سے بڑا مفکر اور ادیب مانتے تھے۔ رام سیون تیسری دنیا کی سب سے ماڈرن یونیورسٹی میں رہتے ہوئے اودھ کی کسان تحریک پر پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔

رام سیون کا کمرہ بھی دیکھنے لائق تھا۔ اس میں کبھی جھاڑو نہیں لگتی تھی۔ گرد اور مکڑی کے جالوں کے

Scanned with CamScanner

بچے کچھ نہ کہتے اور صبر اور تحمل سے رہتے۔ رضائی پرانی تھی اور جب وہ سوتے تو اس کی روئی ان کی داڑھی اور بالوں میں الجھ جاتی۔ وہ بارہ بجے سو جایا کرتے تھے، کمرے ہی میں زیادہ تر رہتے اور جہان جانے کے بارے میں مضمون وغیرہ نہیں لکھتے۔ فیلوشپ کی دوران سیدھو پوری سوچنے کی وجہ سے بند ہو گئی تھی، اس لیے ان کی کاوش بڑھنے لگی تھی۔ جتنی زیادہ ان کی دشواری ہوتی، رام سیون خود کو ہنستا اور رونق پاتے۔ ان کے مضمون میں ان کی ... کے خلاف ... کی تاثیر ہوتی تھی۔ انھوں نے ہوسٹل کے کمرے میں رہتے ہوئے ہنستا ہے، ... کے ... کی سطح پر مست کش طبقے میں خود کو مدد کرنے کے لیے ڈی کلاس ہونے کی ضرورت کے بارے میں لکھا۔

لیکن وہ محنت نہیں کرتے تھے، مست رہتے اور دوسروں کے بارے میں لکھتے ضرور تھے۔ سیون تک پہنچتے نہیں دیتے تھے۔ ساتھ نہیں تھے۔ داڑھی پر تو ہمیشہ دور ٹھٹے کا خوف ان کو ہوتی تھی۔ پہ کمرے کی صفائی ... کی ... کا دھیان نہیں جاتا تھا۔ نہیں دیکھ کر یہ ضرور لگتا کہ وہ ڈی کلاس ہو چکے تھے۔

ان کی جیسی ہی ایسی ان سب سے بڑی یونیورسٹی کی انتظامیہ نے طلبا کے مطالبے کو دھیان میں رکھتے ہوئے، دوسری یونیورسٹیوں کے سامنے ایک آئیڈیل مثال پیش کی۔ کو ایجوکیشن کے ساتھ ساتھ کو ڈویلنگ (co-dwelling) کی مثال۔

اس ہوسٹل میں رام سیون رہتے تھے اس کا آدھا حصہ لڑکیوں کے رہنے کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ ہوسٹل عمارتی سے بیچ کی شکل کا سا تھا۔ جنوب کی طرف ان ڈنڈی میں لڑکوں کی تین منزلہ عمارت تھی جس کی ... سے ... ہو کر سے تھے، شمال والی ڈنڈی کے کمروں میں لڑکیاں رہتی تھیں اور دونوں کو جوڑنے والے بیچ کے ڈنڈے میں جس تھا جہاں لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ، لنچ اور ڈنر لیتے تھے۔ اس طرح سال کا ڈیڑھ اور سی فیصد جھگڑوں کے دیش میں وہ یونیورسٹی ایک سنگین سی تعلیمی ... اس طرح ساتھ پڑھنے، ساتھ رہنے اور ساتھ کھانے کے ہونی راستے پر بڑھی۔

یونیورسٹی سے زیادہ تر لڑکے لڑکیاں جیسے اونچے طبقے سے آتے تھے ابھی ایسے اونچے طبقے سے جہاں کا ہوسٹل نے ان سب کے علاوہ ناچ گانا اور ... اسی طرح کا ہوتا ہے، رام سیون نے اپنی محنت مشق و لگن سے انگریزی کا علم حاصل کیا تھا لیکن وہ لکھتے تو خوب تھے، بولتے میں ان کا خاص ساتھ نہیں آ پاتا تھا سے صبر کی گڈ ایوننگ (a very good even ng) جیسے فقرے تو وہ بولتے تھے، لیکن پیچھے سے ... کی ... کی ... ان کی جسم کی تہذیب کی جڑوں تک بیٹھ چکی تھی۔ لیکن ابھی ایسی کتنی تہذیب کچھ خاص معنوں میں شعور سے زیادہ جسم کو پکڑتی ہے۔ ان کا شعور خاص کا ... نہیں جیسے لڑکی ملک بیٹھتی۔

ان کی شمالی ڈنڈی کی سب سے اوپری منزل کے کمرہ نمبر تین سو آٹھ کی بالکنی میں رام سیون کہتے تھے۔ ان کی شمالی ڈنڈی کی سب سے اوپری منزل کے کمرہ نمبر تین سو سوہ کی بالکنی میں وہ لڑکی

Scanned with CamScanner

نکل آئی تھی جو اُدھر رہتی تھی۔ دونوں بالکنیاں آمنے سامنے تھیں۔ رام سیون نے آنکھ اُدھر کی۔ وہ لڑکی انہیں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آنکھیں بڑے جمالیاتی انداز سے ٹک ٹکی ایک دوسرے کا بدن سہلاتے ہوئے ملیں اور اس جسمانی مس سے نکلتی حرارت سے رام سیون پر کپکپی چھا گئی۔ ماتھے اور ناک کی کگر پر پسینے کی بوندیں جھلملا اٹھیں۔ یہ کلاسیکی شاعری کے نظر نوازی کے آثار تھے۔ اب عشق کھانے کی باری تھی، جس سے رام سیون بچے۔ انھوں نے خود کو بے نیاز، سنجیدہ اور کچھ کچھ بدحواس سا بنا لیا۔ لڑکی تھوڑی دیر تک بالکنی میں رہنے کے بعد اندر چلی گئی۔ اس دن رام سیون جب بالکنی سے ہٹے تو ہٹے نہیں لیکن انھوں نے پھر اُس لڑکی کی سمت نہیں دیکھا۔ ہاں، اس کی موجودگی کو وہ کبھی پیشانی پر اور کبھی اپنی کنپٹی پر محسوس کرتے رہے۔ وہ لڑکی انہیں ایک اُجلی ہری بھری چڑیا کی طرح لگ رہی تھی جو اچانک بہت مانوس، کچھ بولڈ اور نکھری ہوئی سی تھی۔

دوپہر کو گلی میں جھانکتے ہوئے انھوں نے چاروں طرف محتاط اور مشتاق آنکھیں دوڑائیں، لیکن کہیں کچھ نہیں۔ بہت سی لڑکیاں کھڑی تھیں لیکن معاملہ جادوئی سا تھا کہ ایک نظر میں انہیں ساری لڑکیاں بالکنی کی لڑکی لگنے لگتیں اور دوسرے ہی پل ہر لڑکی کوئی اور ثابت ہو جاتی۔ کئی ناکامیاں ہوتے ہوئے وہ یہ کھیل موہو کر کھیلتے رہے۔

رام سیون کمرے ہی میں تھے جب ان کے من میں ایک سنگیت امڈ سا، بیٹھے بیٹھے آنکھیں کھولیں۔ وہ لڑکی اپنی بالکنی پر تھی اور یقینی طور پر رام سیون کی بالکنی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں اندھیرا کر کے کھڑکی سے اُسے پوری اپنائیت کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ رنگ خوب گورا، آٹے اور میدے والا سا نہیں، نکھرا اور گلاب والا۔ بہت ہلکا سفید چھیاں جیسا ٹاپ، کھلی باہیں، سینے تک کھلا ہوا گلا، جانگھوں پر فیڈ ہوتی جسم کی اسپورٹی نیلی پینٹ، عمر بیس کے اِدھر یا اُدھر۔ ہنسی ایسی جیسے جلتا کی سی کھنکتی ہو اور ڈھیر سے پھول دیے سے ہوں۔ اس لڑکی کے گلے میں آواز کیسی ہوگی اور صدری کتنی بدل کر، اُردو میں ڈوب کر نکلے گی۔

وہ بالکنی میں نکلے۔ لڑکی غضب جست اور بے فکری سے ان کی طرف تک رہی تھی۔ تہذیب کا فرق ہے۔ بچے گاؤں کی ہوتی تو آنکھ۔ ٹوٹی یا پیچھے والا پارک دیکھنے لگتی۔ آہ، یہ ایک لڑکی کی آنکھ تھی، ست کچھ سمجھا دینے کی نگاہ سے، کتنے کتنے معنی اس میں تھے۔ یہ تعارف تھا۔۔۔ پہلا۔ بار بار رام سیون کو بچپن میں دیکھی رام لیلا کا جنک واٹکا (۲) کا منظر یاد آ گیا اور پھر جے شنکر پرساد، میتھلی شرن گپت سے ہوتے ہوئے وہ شمشیر (۳) تک پہنچے۔

---

(۲) جنک واٹکا: رام چندر جی کے باپ راجا جنک کا باغ۔
(۳) جے شنکر پرساد، میتھلی شرن گپت اور شمشیر (بہادر سنگھ): ہندی شاعروں کے نام۔

ہاں تم مجھ سے پیار کرو
جیسے ہوائیں میرے سینے سے کرتی ہیں
جس کو وہ گہرائی تک دبا نہیں پاتیں
جیسے مچھلیاں لہروں سے کرتی ہیں ۔۔۔

تم مجھ سے پیار کرو
جیسے میں تم سے کرتا ہوں
آؤ، روشنائی میں گھل جاؤ
اور آسمان میں مجھے لکھو اور مجھے پڑھو
آؤ، ... [illegible]
آؤ، میں تمہاری زندگی ہوں

رات بجلی گئی تھی اور ... [illegible] نیرودا میں لکھے ہوئے تھے: Today I can write saddest lines

صبح ... [illegible] ہوسٹل کے شمالی گیٹ کے چوکیدار کماؤنی دھیرن سنگھ بشٹ سے پوچھا کہ وہ ... [illegible] کہاں رہتے ہیں ... [illegible] جاتا ہے ... [illegible] سے کہا، اُن لوگوں ... [illegible] آتے ہوئے ... [illegible] قسطوں ... [illegible] ہوئے، کہا ... [illegible] پڑھنے ... [illegible] والی ہوئی ... [illegible] پایا ہی ہے، کہا ... [illegible] رہنے والی ہوئی

یہ تو سب ... [illegible] معلوم ہوتا ہے ... [illegible] نام کیا ہے اُن کا ... [illegible] نے پوچھا۔

دیکھیے جی، تمہارا ... [illegible] تو ٹیک ہی دیکھے لگے ... [illegible] کی ہوئی۔ یہ ... [illegible] میں بھی قدم قدم رکنے والی ہوئی۔

... [illegible] طرف دیکھا ... [illegible] کھینچ کر دھواں نکالتے ہوئے ... [illegible] باتیں ... [illegible] دیا اور کہا، "ہاں لیکن اصل پٹاتا ہوا ٹھہرا۔"

لمپن (lumpen) ہے ... [illegible] نے سوچا ... [illegible] طبقے کے ایسے لوگوں میں طبقاتی شعور پیدا کرنے کے لیے ... [illegible] تعلیم کی ضرورت ہے ... [illegible] کی کمیونسٹ پارٹیاں بھی کام نہیں کر رہی ہیں ... [illegible] چھوٹے ملازمین ... [illegible] فورتھ کلاس کے ملازم ... [illegible] عورت ... [illegible] سماج سے

استحصالی نظام کی دین ہے۔

رام جیون غصے میں وہاں سے چلے گئے۔ اس پیچیدہ مسئلے پر سوچتے ہوئے کہ ایسے لوگوں کے طرزِ عمل کا ذمے دار ان کے معاشی اور سماجی پس منظر کو ٹھہرایا جائے یا ان کے ذاتی شعور، تہذیب، خیالات اور رویے کو۔

نیتا چاندی والا۔ اس پورے نام میں ایک سنگیت ہے۔ نیتا۔۔ انی، ابا، نو۔۔ اس کے کئی روپ ہو سکتے ہیں۔ چاندی والا۔ مگر یہ اس چھوٹے سے نام کو بھی بوجھل اور بھاری بھرکم بنا دیتا ہے۔ جب رام جیون سے دل کا بوجھ زیادہ... زیادہ تر وقت سامنے کی بالکنی کو دیکھتے اور اس نام کو لہجے میں بول کر اسے اپنے اندر تک محسوس کرنے میں گزرتا۔ وہ کمرے میں رضائی اوڑھ کر لیٹے لیٹے دھیرے سے بولتے جیسے سامنے بیٹھے کسی کو مخاطب کر رہے ہوں "تم کو یولیسس (Ulysses) کیسی لگی؟" پھر وہ خاموش ہو کر جیمز جوائس کے بارے میں اس کا جواب سنتے۔ جواب ہندی میں بھی ہوتا اور مشکل سے سمجھ میں آنے والی انگریزی میں بھی۔

ایک بار انھوں نے کمرے میں رضائی کے اندر ہی اس سے ہیٹ اینڈ ڈسٹ اور جیول ان دی کراؤن فلموں کے بارے میں پوچھا۔ نیتا چاندی والا نے انگریزوں کے برٹش راج ناسٹیلجیا کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح انگلینڈ کے لوگ اپنے امپیریلسٹ ماضی سے بے تحاشا پیار کرتے ہیں، گوتھے کے برابر سکڑ جانے کے باوجود اپنے ملک کو گریٹ برٹن کہتے ہیں اور بھارت کی تاریخ کو جیسے اپنی مرضی کے مطابق بدلتے توڑتے ہیں۔ پھر اس نے کہا، فار ایگزامپل، دی لیٹسٹ فلم، اے پروسس آف پروڈکشن، ٹرانسفر آف پاور، پرنس وِد دی ویری کانسیپٹ آف ڈومینین سٹیٹس فار انڈین ری پبلک وِد ہاٹ ڈیمانڈ فار انڈیپنڈنس۔۔ ہنروز، پنڈتس، رائٹ سیٹ اپ، رائٹ سیٹ اپ۔۔ ٹ شوز اینڈ بٹ دی لاسٹ وائسرائے، ویسٹ مینسٹر۔۔۔

اس لڑکی کے خیالات میں بیداری بھی ہے اور اپنی تاریخ کو دیکھنے کا ایک صحیح تناظر بھی۔ بس اگر اسے سماج کے موجودہ حالات کے بارے میں علمی طریقے سے سمجھا دیا جائے اور مطالعے سے جوڑ دیا جائے تو وہ ہوتی میں بہت کچھ کردار ادا کر سکتی ہے۔ رام جیون اپنے پلنگ پر رضائی چھوڑ کر بیٹھ گئے اور بولے، ایبسولیوٹلی رائٹ! واٹ (what) وے سیو ٹن، یو سی، وے سیو مائنڈ اور بیتاری، سبھاش بوس، سو سے فنی (funny) پولیٹیکل جوکر۔۔۔

واٹ کی تکرار نکل جانے پر انھیں گہری ندامت ہوئی۔ انھوں نے پکا ارادہ کیا کہ آئندہ اپنی گفتگو میں واٹ جیسی اسکولی کی پرچھائیں تک نہیں پڑنے دیں گے۔

نیتا چاندی والا سے بھی بالکنی میں ملتی۔ کبھی کبھی نہا کر اپنے بال سکھانے وہیں کھلی دھوپ میں کھڑی ہو جاتی۔ کھلی باہیں، بے فکری میں اٹھے ہوئے بازو، شیمپو کیے ہوئے سوکھتے اور الگ الگ اڑتے بال۔۔۔ رام جیون اپنے کمرے میں اندھیرا کر کے چپ چاپ دیکھتے اور سرگوشیوں میں ان کی لمبی خود کلامی شروع ہو جاتی۔

ایک دن، بڑی ہمت والے [illegible] کے بعد، آخری فیصلہ کر کے [illegible] سے کہا، "[illegible] آئی [illegible]!" پورا گھر [illegible] تک اس [illegible] سے [illegible] میں [illegible] کی خوشبو گھر سے میں تیر رہی تھی۔ [illegible] کی بڑی [illegible] اور تیز [illegible] سے، [illegible] نے [illegible] میں [illegible] اور وہ [illegible] سے تعلق [illegible] سے ان کے پورے بدن [illegible]۔ وہ [illegible] رہے تھے۔ [illegible] چھوٹے سے [illegible] ہوتے ہیں [illegible] بدن کی [illegible] ساری [illegible] اور [illegible] تھا۔ لیکن ایک بار [illegible] سے [illegible] کافی [illegible] محسوس کر رہے تھے۔ وہ [illegible] تھے۔ وہ [illegible] کا گیت گا رہے تھے۔

[illegible] دوسری تھی۔ [illegible] فیصلہ [illegible] کے بعد [illegible] سے [illegible] تھا۔ [illegible] ایک کمال تھا۔ [illegible] سے ایک [illegible] کے فرش پر چاروں شانے چت پڑا کراہ رہا تھا۔

[illegible] سے [illegible] میں [illegible] سے [illegible] تھی۔ [illegible] دھوپ کو دیکھ رہی تھی۔ [illegible] سے [illegible] میں [illegible]۔ وہ [illegible] کی [illegible] ایک بہت [illegible] سے [illegible] وجود [illegible] کی [illegible] رنگ [illegible] سے [illegible]۔ [illegible] ایک بہت [illegible] تھی۔ [illegible] ضرورت [illegible] تھی۔ [illegible] سے [illegible] ہے --- (خاموشی [illegible] ہے۔) [illegible] ہی جاتا ہے۔" (خاموشی کی زبان ہے۔)

[illegible] سے [illegible] ترقی پسند شاعروں کی تخلیقات ان کے دماغ میں آ رہی تھیں۔ [illegible] کے بعد [illegible] جن اور [illegible] (۴) کی کوئی نظم یاد نہیں آ رہی تھی۔ [illegible] انقلابی [illegible] کی نظموں کے لیے [illegible] انقلابی شاعروں کا یا [illegible] ترقی پسند شاعروں کا [illegible] تھا۔ [illegible] کا کیا کہنا تھا۔ [illegible] سے [illegible] قرار دیا تھا اور [illegible] وقت [illegible] سے فیصلہ کیا کہ وہ انقلابی [illegible] کی نظمیں [illegible] ہندی میں [illegible] کی [illegible] ہوتی ہے۔ [illegible] ملت، [illegible] تھے [illegible] سے [illegible] نہیں۔ [illegible] ہندی میں یہ کام [illegible]

(۴) [illegible] جن اور آکوٹ وِھنوا: ہندی کے دو ترقی پسند شاعر۔

عمارتوں، بوتیک کاروں اور نیز جوں کے گلدستے میں ڈال دیا گیا ہے۔ بنگلہ کے جیبن آنند داس جیسے شاعر تو نایاب ہی ہیں ہندی میں۔

صرف یونین ہی نہیں، یونین سے باہر کے وفتکار لڑکے بھی جان چکے تھے کہ رام جیون کو آج کل پریم ہو گیا ہے۔ انھوں نے خود یہ بات سب کو بتائی تھی۔ دو دوست تھے، سیدھے درجہ باتی تھے، جو اُن کے خاص دوست تھے اُن کے پاس وہ کنٹرورسٹ میں پہنچ جاتے اور اس پریم کی تازہ ڈیولپمنٹس کے بارے میں سناتے۔ انھوں نے اپنے دوست ہوری ڈھونڈھیاں کو بتلایا تھا کہ وہ لڑکی چاہتی ہے کہ میں کچھ بولوں، اس سے کچھ کہوں۔ کل شام ہم لوگ دو گھنٹے تک آمنے سامنے کی بالکنیوں میں چپ چاپ کھڑے رہے۔ تم لوگ اسے سمجھ نہیں سکتے۔ یہ ایک دوسرے قسم کا پریم ہے۔ دیکھو، ابھی تک ہم نے ایک جملہ بھی نہیں بولا ہے، ایک دوسرے سے بات نہیں کی ہے، لیکن ہم لوگ اس اسٹیج تک پہنچ چکے ہیں جہاں تک معمولی، عام اور ادپرست لوگ مہینوں ساتھ ساتھ دوڑ کر، گھوم پھر کر پہنچتے ہیں۔ وہ وہاں کھڑی رہتی ہے چپ چاپ، میں یہاں کھڑا رہتا ہوں خاموش۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی موجودگی کو فیل کرتے ہیں۔"

ایک شام انھوں نے اپنے دوسرے دوست جبریش مشر کو بتلایا، "آج کل میں ایک خاص تبدیلی محسوس کر رہا ہوں۔ لگتا ہے اپیتا اس نان کمیونی کیشن سے اوب رہی ہے۔ یہ اس کی عمر بھی تو میرے مقابلے میں کم از کم پانچ سات سال کم ہے۔ اتنی میچیورٹی کہاں سے آسکتی ہے اتنی جلدی؟ بہت دن ہو بھی گئے ہیں اس طرح۔ ایک طرح کی مونوٹنی، ایک طرح کی تکرار اور یکسانیت پیدا ہو گئی ہے ہمارے تعلقات میں۔ آخر ہے تو وہ لڑکی ہی۔ اس سیکنڈ سیکس کی نفسیات بالکل الگ ہوتی ہے۔ پہلے تو وہ صرف سینا فلموں ہی میں گرتی ہے۔ اسی لیے ان کمرشل فلموں کو میں اینٹی ڈیمنٹ سمجھتا ہوں۔ انھوں نے دیکھنے والوں کے دماغ میں صرف غیر حقیقی فینٹسی کی ایجاد ہی نہیں بٹھائی، بلکہ انھوں نے اتنے بڑے اس میڈیم کے ذریعے ایک غیر حقیقی عورت کے کمپلیکٹ کو بھی خوب پھیلایا ہے۔ نتیجہ دیکھو، ہر شہر اور قصبے کا مڈل کلاس چھوکرا خوب کنگھی چوٹی کر کے، بچ دھج کے کسی ہیرو کو ڈپلی کیٹ کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ اسے دیکھ کر کوئی بھی لڑکی اس پر مرمٹے گی اور گانا گانے لگے گی۔

رام جیون نے ہوری ڈھونڈھیال سے کہا، "سب سارا معاملہ بڑے کریٹیکل جنکچر تک پہنچ گیا ہے۔ میں نے مارک کیا ہے کہ میں جب کھانا کھاتے وقت بھی کبھی وہ میری طرف جان بوجھ کر دیکھتی ہے۔ آج دوپہر لنچ میں اس نے اپنا چمچ زور سے فرش پر گرا دیا تھا کہ میں اس کی طرف دیکھنے لگوں۔ دراصل اس وقت میں کہیں اور دیکھ رہا تھا۔"

ایک بار وہ رات دس بجے پہنچے اور انھوں نے کسی گہرے راز کو پیاز کی طرح پرت پرت کھولتے ہوئے کہا، "تم نے اپیتا کی ایک چیز پچھلے پانچ چھ دنوں میں نوٹ کی ہے؟ وہ آج کل زیادہ سیریس

Scanned with CamScanner

پہنتی ہے کہ صرف بانہیں ہی نہیں، کندھوں کے نیچے کا کافی حصہ کھلا رہتا ہے۔ اور آج اُس نے جو ٹاپ ہرے رنگ کا پہن رکھا تھا اُس کا گلا اتنا کھلا ہوا تھا، اتنا کھلا ہوا تھا کہ ممبئی کی ماڈرن لڑکیاں بھی ایسی دلیری نہیں کر سکتیں۔ تم نے اپنی [illegible] نظری کھو دی؟ لیکن بندھو پیارے، ایسا ہے نہیں! یہ اُس کا ایک اشارہ ہے۔ یہ اُس کی بے چینی اور [illegible] کا اظہار ہے۔ اپنے اشتعال انگیز کپڑے پہن کر، اپنے بدن کو اتنا کھول کر، وہ کہنا چاہتی ہے کہ میں ابھی موجودہ indecisiveness کو توڑوں۔ اُس سے صاف صاف بات کروں۔ مگر لڑکی بے بدن کے میڈیم ہی سے تو خاموشی کو زبان میں بدلتی ہے۔"

کلیان کمار داس نے کہا، "یار، تم لڑکی سے سیدھے بات کیوں نہیں کر لیتے؟ جا کر اُس سے کہہ دو کہ میں آپ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم خواہ مخواہ بیٹھے بیٹھے خیالی [illegible] بنتے رہتے ہو۔"

رام سجیون کو یہ سن کر چوٹ لگی۔ یہی بات اپنا کتنے انوکھے طریقے سے، اپنے تندرست جوان بدن سے خاموشی کو زبان میں بدلتے ہوئے، کتنے رمزیہ انداز سے کہی تھی، وہ وہی بات کلیان کمار داس کیسے بھونڈے اور بھدے طریقے سے کہہ رہا تھا۔ [illegible] اس سرمایہ دارانہ سماجی نظام نے جس بازاری لہجہ کو پیدا کیا ہے، وہ ہر چیز کو ایک جنس، ایک کموڈٹی ہی تو سمجھتا ہے۔ جیسے لڑکی بکنے کے لیے تیار بیٹھی ہو اور میں گاہک کی طرح [illegible] جاؤں اور اُس کا سودا طے کر ڈالوں اور اسے پٹا لوں۔

کلیان داس سے رام سجیون چپ ہی رہے۔ انھوں نے چلتے ہوئے کہا، "ہاں، اُس صحیح وقت کے انتظار میں ہوں یار۔ ویسے [illegible] ہمارے اس پریم کو تم جیسا سمجھتے ہو، وہ ویسا ہے نہیں۔ گرو! یہ ایک [illegible] کا کھیل ہے۔ اس کا بھید پہلے دن [illegible] ہی جاتے تھے۔ یہاں کوئی گیٹ نہیں، کوئی چھپاؤ نہیں، ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے بالکل ٹرانسپیرنٹ ہیں۔ ایک دوسرے سے ہمارا کچھ بھی چھپا نہیں۔ [illegible] بات آمنے سامنے بیٹھ کر، یا کھڑے ہو کر، یا لیٹ کر، یا چلتے چلتے بات کرنے کی، تو وہ کوئی [illegible] تب [illegible] نہیں۔ بندھو پیارے، ویٹ کرو۔ دیکھتے جاؤ۔ وہ بھی ہو جائے گا۔ جو جو تم سوچتے ہو سب ہو جائے گا۔"

بیچ میں لڑکی دس دنوں کے لیے کہیں باہر چلی گئی تھی۔ اُس کے کمرے کی پچھلی کھڑکی کھلی رہ گئی تھی۔ رام سجیون چپ چاپ اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے یا بالکنی میں کھڑے ہو کر اُس طرف دیکھتے رہتے۔ لڑکی کی یہ غیر موجودگی اور اُس کی پچھلی کھڑکی کا کھلا رہ جانا بھی انھیں کئی کئی معنوں سے بھرا ہوا لگتا۔ آخر اپنے پریمی کے لیے جیسی [illegible] معنوں سے [illegible] رکھی تھی اُس میں [illegible] کے علاوہ باقی ہر چیز [illegible] تھی، اشارہ تھی، اس میں کئی کئی معنی تھے۔

انھوں نے شام کو [illegible] کی کھڑکی کھلی رہ جانے کی بابت شریش مشر کو بتلایا تو اُس نے کہا، "رام سجیون جی، [illegible] آپ پنجاب میں ہے۔ آپ کچھ کریں گے دھرے کے دھرے ہیں، [illegible] میں دل [illegible] اسے سب سوچیں ہے۔ [illegible] بم کا بتائی، تو لڑکی آپ کا جانتی ہو سکتی بھی ہے؟ [illegible] پوچھو نہیں ہوتے [illegible] کا آپ کو ہمارا نام معلوم ہے کی نہیں [illegible]۔

رام سیوک کو پھر صدمہ ہوا۔ اندرونی چوٹ لگی۔ اتنی سیدھی اور بے حجاب باتیں انہیں ڈنگ لگتی تھیں۔ انہیں اس روحانی تیج پر پچھلے دنوں اچھی طرح یقین ہو گیا تھا کہ پریم کبھی بھی اتنا گہرا اور شدید ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ دونوں طرف برابر نہ ہو۔ انہیں پورا بھروسا تھا کہ جس طرح انھوں نے چوکیدار دھیراج سنگھ نیگی سے انیتا کے بارے میں پوچھا تھا، ویسے ہی انیتا نے ضرور اس سے ان کے بارے میں پوچھا ہوگا۔ یہ یقین اتنا ٹھوس اور اتنا سچا لگتا تھا کہ کسی بھی طرح سے اس کی تصدیق کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پھر انہیں ایسا کرتے ہوئے ایک عجیب سا ڈر بھی لگتا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہوا تو؟

سرمایہ داری فائن آرٹس کی سب سے بڑی اور سفاک دشمن ہوتی ہے۔ انھوں نے چالو دنیادار ڈھرے کا پریم نہ کر کے ایک آرٹ فارم بنانے کی کوشش کی تھی۔ یہاں پریم ایک رشتہ نہیں ایک آرٹ تھا، ایک اعلیٰ آرٹسٹک تخلیق تھا۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام کا یہ بھیانک ستم تھا کہ اپنے نزدیک سے نزدیک کے دوستوں سے بھی وہ کمیونی کیٹ نہیں کر پا رہے تھے۔ اسٹیبلشمنٹ تعلقات کے بیچ اجنبیت کے وندھیاچل کھڑے کر رہا تھا۔ انہیں چیخوف کی کہانی 'گریف' یاد آئی جس میں اپنے اندر کی پیڑا کو کہنے کے لیے ہیرو کو کوئی نہیں ملتا اور آخر میں وہ اپنے گھوڑے کے گلے سے لپٹ کر روتا ہے۔

رام سیوک کو کوئی گھوڑا تو نہیں ملا لیکن انھوں نے رات میں ایک نظم لکھی، "کھلی کھڑکی کے معنی"، جس کی شروع کی لائنیں تھیں:

ــــ فریش مشر
تم نہیں جانتے کہ
تاریخ میں کھلی رہ گئی ایک اکیلی
کھڑکی کا کیا مطلب ہوتا ہے
لیکن میں جانتا ہوں
کھلی کھڑکی کا ایک مستقبل ہوتا ہے
جس میں سے قول و قرار اور تمناؤں کی
روشنی پھوٹتی ہے
وغیرہ وغیرہ۔۔۔

ایک دن دوپہر کو رام سیوک دوڑتے دوڑتے کلیان کھنہ واس کے کمرے میں پہنچے۔ موہن ڈھونڈھیال بھی وہاں بیٹھا ہوا تھا۔

رام سیوک کے چہرے سے خوشی کے مضبوط اور گدرے پیڑ کی پھنگیاں باہر نکل کر بل رہی تھیں۔ جھیپڑوں میں ڈھیر سارے گل مل اور کنیر کے پھول بھرے ہوئے لٹک رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے وہ خوشی کے کسی گیس کے غبارے کے ساتھ باندھ دیے گئے ہوں اور ان کے پیر زمین پر پڑتے ہوئے کوئی

Scanned with CamScanner

بار بار ڈالتے ہوں۔ کیکے سے دھرتی کو بس چھو لیتے ہوں اوپر رہ کے۔

رام سیوک نے ایک ہی سانس میں کہا، "آج غضب ہو گیا۔ اب سب کچھ بدل چکا ہے۔ یہ ایک ایسا موڑ ہے جہاں ساری چیزیں نئے سرے سے شروع ہوتی ہیں۔"

"ہوا کیا؟ کیا بات چیت ہو گئی؟" ڈھونڈھیال نے پوچھا۔

"بات چیت کو تم لوگ اتنی اہمیت کیوں دیتے ہو؟ یہ سمجھو کہ میری سب تک کی ریڈنگ سیج تھی۔ آج میں بس اسٹاپ پر کھڑا تھا۔ اس نے پوچھا: 'ٹیگور کی چیزیں وغیرہ بس سیدھی ٹیبل سلس رکھی ہیں؟' میں نے کہا: 'اسٹ ربٹ ٹو گر۔' وہ مسکرائی۔ ٹھیک پونے نو بجے وہ بس اسٹاپ پر ہی کھڑی ہوئی۔"

کلیان کمار داس نے رام سیوک کو پوری ہمدردی سے دیکھا اور پوچھا، "تو محبوب سے اس میں آپ کا شعور کون سا اشارہ ڈھونڈتا ہے؟"

رام سیوک ہمدردی برداشت ہوئے۔ "ان کا چہرہ دمکتا آیا۔ ویسے تو یہ ساری باتیں ہی تم لوگوں کے لیے مفہوم ہیں۔ لیکن اگر تم سب اپنی ہی دلیلوں کے ذریعے ساری باتوں کو سمجھنا چاہتے ہو تو یہ بتاؤ کہ کس وقت بس اسٹاپ پر کھڑے کر میں ڈرانے کھڑے تھے۔ چیتا نے یہ سوال مجھ سے، صرف مجھی سے کیوں کیا؟"

اس سوال کا جواب نہ کلیان کمار داس کے پاس تھا اور نہ ہی ڈھونڈھیال کے پاس۔

ایک دن شام چھ بجے کے لگ بھگ رام سیوک نے دیکھا کہ چیتا نے اپنی بالکنی سے ایک کاغذ کا ٹکڑا نیچے گرایا، ان کی طرف دیکھا، ذرا سا ٹھہری اور پھر اندر چلی گئی۔

سب کچھ بھول کر رام سیوک وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچے۔ ہوا چل رہی تھی۔ اور وہاں ہری گھاس پر ڈھیروں کاغذ کے ٹکڑے تھے۔ یہاں، وہاں، ہر طرف، ڈھیر کے ڈھیر کانپتے ہوئے۔ کچھ ایک دم چپ اور ساکت، جیسے مٹی میں جڑیں پکڑ چکے ہوں۔

ان میں سے وہ کاغذ کیسے اٹھائے جو ہیں؟ کیا لکھا ہوا کاغذ ہی ہیں؟ رات آٹھ بجے تک لوگوں نے دیکھا کہ رام سیوک نیچے گرتے ہی والی ہوا کر وہاں کے سارے کاغذوں کو چن رہے ہیں۔ وہ چلنے کو تیار ہوتے اور تب ہی کہیں کوئی اور چھوٹی سی چمکتی کترن سی چیز دکھائی دے جاتی۔ وہ جوش میں کانپتے ہوئے اسے اٹھاتے۔

اس رات وہ گھر گئے۔ انھوں نے اپنے کمرے کی بتی جلائے رکھ کر، سارے پرزوں کو کھول کھول کر بھی طرح سے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ایک بار سب کو دیکھ چکنے کے بعد ان کے دل میں شک جاگا اور انھوں نے دوبارہ انھیں دیکھا۔ بیچ میں سونے کی کوشش کی لیکن پھر ایک تیز جوش و خروش، گہری امنگ اور سانس روک دینے والی بے قراری نے ان کی نیند اڑا دی اور وہ لگاتار کئی کئی بار انھیں ایک ایک کر کے

Scanned with CamScanner

دیکھتے رہے۔ ان کے کمرے کے فرش پر، پلنگ پر چاروں طرف کاغذ کی ننھی ننھی تمام رنگوں کی چندیاں بکھری ہوئی تھیں اور رام سیون ان کے بیچ بیٹھے تھے۔

رام سیون نے پوچھا، انو، تمہیں پتا ہے، گاؤوں میں لوگ کس طرح سے رہتے ہیں؟ بنجر زمین اور سوکھے آسمان سے لڑتے جوجھتے ان لوگوں کی ہڈیاں کیسے نکل آتی ہیں؟ جاگیردارانہ جبر اور معاشی استحصال کا یک کبھی نہ ٹوٹنے والا سلسلہ کیسے ان کے جیون کو کیڑے مکوڑوں سے بدتر بنا ڈالتا ہے۔۔۔

انیتا کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ رام سیون نے رضائی سے اپنا سر ڈھانپ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر روتے رہے۔ لگ بھگ تین گھنٹے۔

رام سیون کی آنکھیں پھٹی پھٹی اور لال رہتیں۔ لگتا کہ ان کا لہو غالب کے مطابق صرف رگوں میں دوڑنے پھرنے کا قائل نہیں رہ گیا ہے بلکہ آنکھوں میں آکر ٹھہر گیا ہے۔ منھ کھلا رہتا تو کھلا ہی رہ جاتا داڑھی کسی اونچی جنگل کی طرح بے ترتیب اور منتشر ہو چکی تھی۔ پتلون کے پائنچوں میں مٹی اور دھول لگی ہوتی۔

جب کوئی ان سے کچھ کہتا تو سمجھنے میں انہیں کافی وقت لگتا اور اکثر وہ کچھ اور سمجھ جاتے۔ پھر وہ بڑی بےبسی، بےفکری اور ثابت قدمی سے اسے اپنے پریم کے بارے میں بتانے لگتے۔

اس دن بالکنی میں انیتا کے ساتھ ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی۔ کتھئی بارڈر کی سفید ساڑی پہنے۔ بالکل بگلے کے پر جیسے بال۔ پتلی سنہری کمانی کا چشمہ۔ وہ دونوں ان کی بالکنی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

رام سیون نے ہفتوں بعد اپنا چہرہ دھویا۔ پانی کی ٹھنڈک سے ان کا مسام کھل اٹھا۔ انہوں نے دوسرا کرتا پہنا، بالکنی میں نکلے اور آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ پھر انہوں نے ہیرو دیا اور کسی بھی شاعر کی کوئی نظم یاد کرنی چاہی لیکن پتا نہیں کیوں بار بار ان کے دماغ میں بنکم چندر کا یہی مصرعہ گونجنے لگتا تھا۔ "شاسیہ شیامل، سجلم ماترم بندے ماترم!

رام سیون نے انہیں دنوں ایک مضمون لکھا "سماج کی حالیہ اقتصادی اور سیاسی صورت حال اور طبقاتی کشمکش کا موجودہ مرحلہ"۔

یہ مضمون ان کی یونین میں، رات کو خاص طور پر بلائے گئے جلاس میں پڑھا گیا۔ رام سیون کی گہری نگاہ اور سماجی صورت حال کی بات ان کی مالمانہ سمجھ بوجھ کی تعریف کی گئی۔

اس دن رام سیون یونیورسٹی کے کینٹیریا میں دیر تک بیٹھے رہے۔ سامنے کچھ میزوں کو چھوڑ کر انیتا بیٹھی تھی۔ وہ کسی نوٹ بک میں کچھ لکھ رہی تھی۔

رام سیون اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ نوٹ بک میں کچھ لکھ نہیں رہی ہے، لکھنے کی صرف اداکاری کر رہی ہے، اور اگر وہ وہاں بیٹھی ہے تو صرف اس لیے کہ وہ وہاں بیٹھے ہیں۔

ان دنوں سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ کوئی ان سے ان کے پریم کے بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتا تھا۔ اور ان کے پاس اس کے سوا کہنے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا۔

Scanned with CamScanner

انسانی تعلقات کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

ایک سبب یہ بھی تھا کہ رام سجیون اپنے پریم کے بارے میں جو کچھ بتلاتے، اس کی زبان اتنی الگ ہوتی تھی کہ اُسے سمجھنا اور کسی کے لیے ممکن نہ تھا۔ اُن کے قریبی دوست بھی اُن سے کتراتے۔ سوین ڈھونڈھیال نے ایک دن بتایا کہ رات میں قریب دو بجے رام سجیون اُن کے کمرے میں آ گئے۔ اُن کی آنکھیں چھوٹی اور لال تھیں۔ کرتا پھٹا ہوا اور میلا تھا۔ لگ بھگ آدھے گھنٹے تک فرنچ جیسی کسی زبان میں بولتے رہے۔ بیچ بیچ میں مسکراتے تھے، منہ سے رال بہنے لگتی تھی۔ پھر وہ دیر تک سسکتے رہے۔

سوین ڈھونڈھیال، اسلم اختر، شریش مشر، کلیان کمار داس، سب لوگ مل کر رام سجیون کے کمرے میں پہنچے۔ فیصلہ کیا گیا تھا کہ رام سجیون نے اپنے چاروں طرف جو کائنات بنا لی ہے اُسے توڑ کر، اُسے تباہ و برباد کر کے ہی اُنھیں بچایا جا سکتا ہے۔ شریش نے کہا، اُنھیں شدید شیزوفرینیا ہے۔ اُن کے زاویۂ نظر کو اصلیت سے ٹکرا کر توڑنا پڑے گا۔

ہم بالکل رحم نہیں کریں گے۔ بی وی آر ٹف بوئز! اسلم نے نعرہ لگایا۔

رام سجیون اپنے کمرے ہی میں تھے۔ رعنائی میں کھوئے ہوئے۔ شریش مشر نے بات شروع کی۔ دیکھیے سجیون بابو، سچائی تو یہ ہے کہ اُو لڑکی ابھی آپ کا نام نہیں جانتی ورنہ ہی اُسے پتا ہے کہ آپ اُس سے پیار کر رہے ہیں۔ بجنس لی نا ہیں۔

"اور یہ بھی سچ ہے کہ آپ بنا کچھ کیے، سوچتے ہی سوچتے پاگل ہوئے جا رہے ہیں۔ چلیے ہمارے ساتھ، ہم آپ کو بیتا چاندی والا سے ملوا دیتے ہیں۔

"لیکن سجیون بابو، بڑی بات آپ اچھی طرح سے جان لیں کہ جون کلاس کی اُو لڑکی ہے، اُس کا مقابلے میں روؤا کی حالت جیسر اسپوں سے گئی گزری ہے۔ روؤا کا پتا ہے کہ نہیں، کہ اُو لڑکی کا باپ کینیا میں فیکٹری چلا رہا ہے اور بیتا چاندی والا کیمبرج میں پڑھنے یہاں آئی ہے؟

آپ ہاتھ منہ دھوئیے۔ اچھے کپڑے لتے پہنیے۔ داڑھی دوڑھی بنائیے اور قاعدے سے رہیے۔ جب ایسی لڑکی سے پیار کیا ہے تو اور اُس کے ہو لیجیے۔

اور نہیں بن سکتے تو فوراً اپنی دنیا میں لوٹ آئیے۔ آنکھیں کھولیے۔ دھوپ کو دیکھیے۔ وہ لڑکی کسی اور سنسار کی ہے۔ آپ کسی اور دنیا کے باسی ہیں گرودیو! جو آپ کلاس کلاس کرتے رہتے ہیں وہ خیالی پلاؤ نہیں ایک ٹھوس سچائی ہے۔ اسے جانیے۔ کلاس اسٹرگل میں صرف جنگ ہی نہیں ہوتی، کوتائیں ہی نہیں لکھی جاتیں، جلوس اور نعرے ہی نہیں لگتے۔ پیار ویار، جنس کی چیزیں بھی اس کے تحت بانٹی جاتی ہیں۔

رام سجیون، ہوش میں آئیے۔

آپ ہوش میں نہیں آئیں گے تو پاگل ہو جائیں گے۔

وہ سب باری باری سے بولتے رہے۔ یہ سب کچھ پہلے سے تیار کر لیا گیا تھا۔ یہ سماک تھیٹر کا ایک

Scanned with CamScanner

تکمیل تھا۔

رام سجیون ساکت پڑے تھے۔ اسی طرح۔ پھر انھوں نے زور زور سے گانا شروع کیا۔ اُن کی آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے۔

لوگوں نے بعد میں جانا کہ یہ گیتا کا دوسرا ادھیائے تھا۔ تعجب یہ تھا کہ وہ بابو رام سجیون کو یاد تھا —— پورا کا پورا۔

ایک دن ہوسٹل کے وارڈن نے نوین ڈھونڈھیال اور کلیان کمار داس کو اپنے آفس میں بلایا۔ وارڈن سدگوپال نے اُن کے سامنے ایک خط رکھا۔ اسے پڑھیے آپ لوگ اور بتائیے کہ کیا کیا جائے۔

وہ محبت نامہ تھا جسے بابو رام سجیون نے انیتا چاندی والا کو لکھا تھا اور اسے کمرہ نمبر ۲۱۶ کے پتے پر پوسٹ کر دیا تھا۔ خط دو زبانوں میں تھا، انگریزی میں بھی اور ہندی میں بھی۔ اُس میں جیبن آنند داس، لورکا، نیرودا اور ٹیگور کی لائنیں تھیں، اپنے دل کے گہرے پریم کا پیچیدہ اور مسلسل بیان تھا۔ کلیان کمار داس کو وہ خط ادب عالیہ کا ایک نمونہ معلوم ہوا۔

وارڈن سدگوپال نے کہا، وہ لڑکی بہت ڈر گئی ہے۔ اُس نے سیکیورٹی پروٹیکشن کا مطالبہ کیا ہے۔ آج صبح ہی اُسے خط ملا۔ پہلے تو اسے پتا ہی نہیں لگا کہ کس نے لکھا ہے۔ پھر اُس نے چوکیدار دھیرج سنگھ سے پوچھا۔ رام سجیون نے اپنا نام پتا صاف لکھ رکھا ہے۔

"اس لڑکی نے کیا کہا ہے؟" ڈھونڈھیال نے پوچھا۔

"وہ بہت ڈر گئی ہے،" وارڈن نے بتلایا۔ "کہہ رہی تھی کہ پچھلے دنوں سے اُسے ایسا ضرور لگنے لگا تھا کہ ایک پاگل سا آدمی لگاتار اُسے گھورتا رہتا ہے، لیکن اس نے اسے سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ اب بات دوسری ہے۔ آپ لوگ کچھ کیجیے۔ ویسے میں نے اُسے فی الحال سمجھا دیا ہے، لیکن اچھا ہوگا کہ آپ لوگ رام سجیون کو کچھ دن کے لیے اُن کے گاؤں بھیج دیں۔ یہاں سے باہر رہیں گے، آب و ہوا بدل جائے گی تو شاید وہ ٹھیک ہو جائیں۔"

رات کی گاڑی سے رام سجیون کو جبراً اُن کے گاؤں بھیج دیا گیا۔ سب لوگ اُن کے ساتھ اسٹیشن گئے۔ اسلم خستر کو تو ساتھ گاؤں تک بھیجا گیا۔ وہ تیسرے دن انھیں پہنچا کر لوٹا۔ بابو رام سجیون کا کمرہ اس ہوسٹل سے بدل کر ایک ایسے ہوسٹل میں کر دیا گیا جس میں صرف لڑکے رہتے تھے۔ اُن کی غیر موجودگی میں اُن کا سارا سامان پہلے والے کمرے سے نکال کر نئے کمرے میں پہنچایا گیا۔

کچھ دنوں بعد وارڈن نے پھر کلیان کمار داس اور نوین ڈھونڈھیال کو بلایا اور اُن کے سامنے خطوں کا ایک پلندہ رکھ دیا۔ سب خط رام سجیون نے گاؤں سے انیتا چاندی والا کو بھیجے تھے۔ انیتا چاندی والا نے اُن خطوں کو کھولا بھی نہیں تھا اور چوکیدار دھیرج سنگھ نیگی کے ہاتھ وارڈن کے پاس بھیج دیا تھا۔

وہ خط میز پر رکھے تھے۔ ہوا میں دھیرے دھیرے کانپتے، بالکل بند۔ انھیں کسی نے بھی نہیں پڑھا تھا۔ کلیان کمار داس نے انھیں اٹھا کر اپنے جھولے میں ڈال لیا جس کے اندر گہرا اندھیرا تھا۔

Scanned with CamScanner

رام سجیون اب پھر لوٹ آئے ہیں، ایک سال تک گاؤں میں رہنے کے بعد۔ انیتا چاندی والا ریسرچ ختم کر کے کیمبرج جا چکی ہے۔ کلیان کمار داس کو گوہاٹی کے کسی چائے کے باغ میں اچھی نوکری مل گئی ہے۔

رام سجیون کو پورا یقین ہے کہ انیتا چاندی والا اب بھی یہیں یونیورسٹی میں ہے۔ وہ انھیں دیکھ رہی ہے اور پرکھ رہی ہے۔ وہ کسی ان دیکھے امتحان سے گزر رہے ہیں۔

رام سجیون اب بھی سماج کی مادی صورت حال، فلسفے کی معروضی روایتوں اور طبقاتی کشمکش پر کبھی کبھی مضمون وغیرہ لکھا کرتے ہیں۔

**

# اُدے پرکاش

ہندی سے ترجمہ: اجمل کمال

## ترچھ

اس قصے کا تعلق پتاجی سے ہے۔ میرے خواب سے ہے۔ اور شہر سے بھی ہے۔ شہر کی بات جو ایک پیدائشی ڈر ہوتا ہے، اس سے بھی ہے۔

پتاجی تب پچپن سال کے ہوئے تھے۔ دبلا جسم، بال بالکل کپاس کے گولے جیسے سفید۔ سر پر جیسے روئی رکھی ہو۔ وہ سوچتے زیادہ تھے، بولتے بہت کم۔ جب بولتے تو ہمیں تسلی ہوتی، جیسے دیر سے رکی ہوئی سانس نکل رہی ہو۔ ساتھ ساتھ ہمیں ڈر بھی لگتا۔ ہم بچوں کے لیے وہ ایک سخت پہرے دار تھے۔ ہمیں پتا تھا کہ دنیا بھر کے سارے علم کی تجوری ان کے پاس ہے۔ ہم جانتے تھے کہ دنیا کی ساری باتیں وہ بول سکتے ہیں۔ دنیا ان کو جانتی ہے اور ہماری ہی طرح ان سے ڈرتی ہوئی، ان کا ادب کرتی ہے۔

ہمیں ان کی اولاد ہونے پر فخر تھا۔

کبھی کبھی، ویسے ایسا برسوں میں ایک آدھ بار ہی ہوتا، وہ شام کو ہمیں اپنے ساتھ ٹہلانے کہیں باہر لے جاتے۔ چلنے سے پہلے وہ منہ میں تمباکو بھر لیتے۔ تب کسی وجہ سے وہ کچھ بول نہیں پاتے تھے۔ وہ چپ رہتے۔ ان کی خاموشی ہمیں بہت گمبھیر، پُروقار، [illegible] لگتی اور [illegible] لگتی۔ چھوٹی بہن کبھی ان سے راستے میں کچھ پوچھنا چاہتی تو فوراً میں اس کا جواب دینے کی کوشش کرتا تاکہ پتاجی کو نہ بولنا پڑے۔

ویسے یہ کام کافی مشکل اور جوکھم بھرا ہوتا۔ کیوں کہ میں جانتا تھا کہ اگر میرا جواب غلط ہو تو پتاجی کو بولنا پڑ جائے گا۔ ٹہلنے میں ہمیں پریشانی ہوتی تھی۔ ایک تو ہمیں تمباکو کی پیک نگلنی پڑتی تھی، پھر

---

ترچھ: گرگٹ کی نسل کا ایک زہریلا جانور جسے وِش کھاپرا بھی کہا جاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

… دنیا میں وہ … تھے وہاں سے نکل کر یہاں تک آنے میں مجھے ایک لمبی دوری طے کرنی پڑی تھی۔ وجہ … کے سوالوں میں کوئی خاص بات ہوتی نہیں تھی۔ جیسے وہ بھی پوچھ بیٹھتی کہ سامنے بچھو لے کر … گئی۔ جیسی کسی چڑیا کو کیا کہتے ہیں۔ میں چوں کہ ساری چڑیوں کو جانتا تھا اس لیے بتا سکتا تھا کہ وہ … دوسرے کے دن اسے ضرور دیکھنا چاہیے۔ میری پوری کوشش رہتی کہ پتاجی کو آرام سے … سوچتے رہیں۔

میری … کی، دونوں کی پوری کوشش رہتی کہ پتاجی بڑی دنیا میں سکھ چین سے رہیں۔ وہاں سے … نکالا جائے۔ وہ دنیا ہمارے لیے بہت بڑا اسرار تھی، لیکن ہمارے گھر کے اور ہماری … کے بہت سے مسئلوں کو پتاجی وہیں رہتے ہوئے حل کرتے تھے۔ مثلاً جب میری فیس کی بات آئی اس وقت ہمارے پاس کا آخری … بھی ختم ہو گیا تھا اور سب لوگ … میں پڑے تھے۔ پتاجی دو دن تک … چپ رہے۔ ماں کو بھی شک ہوتا تھا کہ پتاجی فیس کی بات بالکل بھول گئے ہیں یا پھر اس کا حل ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن تیسرے دن … پتاجی نے مجھے ایک چٹھی لفافے میں رکھ کر دی … شہر کے ڈاکٹر … کے پاس … مجھے … تعجب ہوا جب ڈاکٹر نے مجھے … گھر کے … لیے … بیچ … دیے۔

ہم پتاجی پر فخر کرتے تھے، ان سے پیار کرتے تھے، ان سے ڈرتے تھے اور ان کے ہونے کا احساس … جیسے ہمارے گھر میں … ہو۔ ایسا قلعہ جس کے چاروں طرف گہری نہریں کھدی ہوئی ہوں، … بہت اونچی ہوں، دیواریں … چٹانوں کی سی ہوں اور … کے لیے ہمارا قلعہ ناقابل شکست ہو۔

پتاجی ایک خوب … تھے، ان کی فصیل پر ہم سب کچھ محفوظ کر کے رکھتے تھے اور رات میں مجھے خوب … نیند آتی تھی۔

لیکن … دن … پتاجی … سے … کر آئے تو ان کے ٹخنے میں پٹی بندھی تھی۔ … گاؤں کے … وہاں آئے … پتا چلا کہ پتاجی کو … میں … نے کاٹ لیا ہے۔

ہم سب جانتے تھے کہ … کے کاٹنے پر آدمی بچ نہیں سکتا … رہتے ہیں۔ … کی … گاؤں … بہت … ہمارے گھر … میں جمع ہو گئے تھے۔ پتاجی ان کے بیچ میں … بیٹھے … اور … کی راکھ سے … تھا۔

… ایک بار میں نے دیکھی تھی۔

… چٹانوں کے … تھے، … خوب …

… پانی … کی طرف جا رہا تھا۔

… کالے رنگ … ہو … وہ اس میں …

ہے۔ اُس نے بتایا کہ سانپ تو تب کاٹتا ہے جب اُس کے اوپر پیر پڑ جائے یا جب کوئی بلاوجہ اُسے تنگ کرے۔ لیکن ترچھ تو نظر پڑتے ہی دوڑتا ہے۔ پیچھے پڑ جاتا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے کبھی سیدھے نہیں بھاگنا چاہیے۔ ٹیڑھے میڑھے چکر کاٹتے ہوئے گول گول دوڑنا چاہیے۔

دراصل جب آدمی بھاگتا ہے تو زمین پر وہ صرف اپنے پیروں کے نشان ہی نہیں چھوڑتا، بلکہ ہر نشان کے ساتھ وہاں کی دھول میں اپنی بُو بھی چھوڑ جاتا ہے۔ ترچھ اسی بُو کے سہارے دوڑتا ہے۔ نانا نے بتلایا کہ ترچھ کو چکمہ دینے کے لیے آدمی کو یہ کرنا چاہیے کہ پہلے تو وہ بالکل پاس پاس قدم رکھ کر جلدی جلدی کچھ دیر دوڑے، پھر چار پانچ بار خوب لمبی لمبی چھلانگیں لگائے۔ ترچھ بُو سونگھتا ہوا دوڑتا آئے گا۔ جہاں پاس پاس پیر کے نشان ہوں گے وہاں اُس کی رفتار خوب تیز ہو جائے گی۔ دراصل جہاں سے آدمی نے چھلانگ ماری ہوگی وہاں آ کر وہ اُلجھن میں پڑ جائے گا۔ وہ اِدھر اُدھر تب تک بھٹکتا رہے گا جب تک اُسے اگلے پیر کا نشان اور اُس میں بسی بُو نہیں مل جاتی۔

ہمیں ترچھ کے بارے میں دو باتیں اور معلوم تھیں۔ ایک تو یہ کہ جیسے ہی وہ آدمی کو کاٹتا ہے، ویسے ہی وہ وہاں سے بھاگ کر کسی جگہ پیشاب کرتا ہے اور اس پیشاب میں لوٹنے لگتا ہے۔ اگر ترچھ نے ایسا کر لیا تو آدمی بچ نہیں سکتا۔ اگر اُسے بچنا ہے تو ترچھ کے پیشاب میں لوٹنے سے پہلے ہی خود کسی ندی، کنویں یا تالاب میں ڈبکی لگا لینی چاہیے یا پھر ترچھ کے ایسا کرنے سے پہلے ہی اُسے مار دینا چاہیے۔

دوسری بات یہ کہ ترچھ کاٹنے کے لیے تبھی دوڑتا ہے جب اُس سے نظر مل جائے۔ اگر ترچھ کو دیکھو تو کبھی اُس سے آنکھ مت ملاؤ۔ آنکھ ملتے ہی وہ آدمی کی بو پہچان لیتا ہے اور پیچھے لگ جاتا ہے۔ پھر چاہے آدمی پوری زمین کا چکر لگا لے، ترچھ پیچھے پیچھے آتا ہے۔

میں بھی تمام بچوں کی طرح اُس وقت ترچھ سے بہت ڈرتا تھا۔ میرے ڈراؤنے خوابوں کے سب سے خطرناک کردار دو ہی تھے: ایک ہاتھی اور دوسرا ترچھ۔ ہاتھی تو پھر بھی دوڑتا دوڑتا تھک جاتا تھا اور میں پیڑ پر چڑھ کر بچ جاتا تھا، یا پھر اُڑنے لگتا تھا، لیکن ترچھ — اُس کے سامنے تو میں جیسے کسی دلدل میں پھنس جاتا تھا۔ میں خواب میں کہیں جا رہا ہوتا تو اچانک ہی کسی جگہ وہ مل جاتا۔ اُس کی کوئی جگہ طے نہیں ہوتی تھی۔ کوئی ضروری نہیں تھا کہ وہ جنگل ہی کی دراروں، پرانی عمارتوں کے کھنڈروں یا کسی جھاڑی کے پیچھے دکھے۔ وہ مجھے بازاروں میں، سنیما ہال میں، کسی دکان یا میرے گھر کے ہی بیچ میں دکھ سکتا تھا۔

میں خواب میں کوشش کرتا کہ اُس سے نظر نہ ملنے پائے لیکن وہ اپنی آنکھوں سے مجھے دیکھتا کہ میں اپنے آپ کو روک نہیں پاتا تھا اور بس، آنکھ ملتے ہی اُس کی بو مجھ میں آ جاتی تھی۔ وہ دوڑتا تھا اور میں بھاگتا تھا۔

میں خوب کوشش کرتا کہ جلدی جلدی پاس پاس ڈگ بھر کر، اچانک خوب لمبی لمبی چھلانگیں لگانے لگتا۔ اُسے بھٹکانے کی کوشش کرتا، کسی اونچی جگہ پر چڑھ جاتا، لیکن میری ہر کوشش کے باوجود وہ چکمہ نہیں کھاتا تھا۔ وہ مجھے بہت دیر تک ... چکمہ نہیں کھاتا۔ مجھے لگتا کہ وہ مجھے خوب اچھی طرح سے جانتا ہے۔ ...

[illegible] میرے لیے بچپن کی جو چمک تھی، اس سے مجھے لگتا [illegible] [illegible]

[illegible] خواب [illegible] [illegible] [illegible] موت [illegible] [illegible]

[illegible] موت [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] سے ہر بار اس ہتھیار کی یاد مجھے بالکل آخری وقت میں آتی [illegible] اپنی موت کی سانسیں مجھے چھوٹنے لگتیں، موت [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] کہ بہت ڈراونا خواب تھا۔

[illegible]

[illegible]

کے اُسے مار ڈالتا۔ طے تھا کہ اگر وہ مور اُسے نہ مار پاتے تو وہ پیشاب کر کے ضرور اس میں لوٹنے لگتا۔ پھر پتاجی کسی حال میں نہ بچتے۔ یہی وجہ تھی کہ پتاجی کے بارے میں مجھے اتنی فکر نہیں رہ گئی تھی۔ بلکہ ایک طرح کی تسکین اور آزادی کا احساس میرے اندر دھیرے دھیرے پیدا ہو رہا تھا۔ وجہ، ایک تو یہی کہ پتاجی نے ترچھ کو آرام سے مار ڈالا تھا، اور دوسرے یہ کہ میرا اب سے خطرناک، بڑا، جانا پہچانا دشمن آخر کار مر چکا تھا۔ اس کا خاتمہ ہو گیا تھا اور اب میں اپنے خواب کے اندر کہیں بھی، بنا کسی ڈر کے، سیٹی بجاتا گھوم سکتا تھا۔

اس رات دیر تک ہمارے آنگن میں بھیڑ لگی رہی۔ پتاجی کی جھاڑ پھونک چلتی رہی۔ کاٹنے کی جگہ کو چیر کر خون بھی باہر نکالا گیا اور کنویں میں ڈلنے والی لال دوا (پوٹاشیم پرمینگنیٹ) زخم میں بھر دی گئی۔ میں مطمئن تھا۔

اگلی صبح پتاجی کو شہر جانا تھا۔ عدالت میں پیشی تھی۔ ان کے نام سمن آیا تھا۔ ہمارے گاؤں سے تقریباً دو کلومیٹر دور سے نکلنے والی سڑک سے شہر کے لیے بسیں گزرتی ہیں۔ ان کی تعداد مشکل سے دن بھر میں دو یا تین تھی۔ غنیمت ہوا کہ پتاجی جیسے ہی سڑک تک پہنچے، شہر جانے والا پاس کے گاؤں کا ایک ٹریکٹر انہیں مل گیا۔ ٹریکٹر میں بیٹھے ہوئے لوگ پہچان کے تھے۔ ٹریکٹر دو ڈھائی گھنٹوں میں شہر پہنچ جانے والا تھا، یعنی عدالت کھلنے سے کافی پہلے۔

راستے میں ترچھ والی بات چلی۔ پتاجی نے اپنا زخم ان لوگوں کو دکھایا۔ ٹریکٹر میں پنڈت رام اوتار بھی تھے۔ انہوں نے بتلایا کہ ترچھ کے زہر کی ایک خاصیت یہی ہے کہ کسی کسی پر چوبیس گھنٹے بعد، ٹھیک اسی وقت جس وقت پچھلے دن ترچھ نے کاٹا ہو، اپنا اثر دکھاتا ہے۔ اس لیے ابھی پتاجی کو مطمئن نہیں ہونا چاہیے۔ ٹریکٹر کے لوگوں نے پتاجی کا دھیان ایک اور بڑی غلطی کی طرف دلایا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ تو پتاجی نے سخت ٹھیک کیا کہ ترچھ کو فوراً مار ڈالا لیکن اس کے بعد بھی ترچھ کو یوں ہی نہیں چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ اسے کم سے کم جلا ضرور دینا چاہیے تھا۔

ان لوگوں کا کہنا تھا کہ بہت سے کیڑے مکوڑے اور دوسرے جانور مرنے کے بعد، چاند کی روشنی میں، دوبارہ جی اٹھتے ہیں۔ چاندنی میں جو اوس اور ٹھنڈک ہوتی ہے اس میں امرت ہوتا ہے، اور کئی بار ایسا دیکھا گیا ہے کہ کسی سانپ کو مار کر رات میں یوں ہی پھینک دیا جاتا ہے، اس کا جسم چاندنی کی ٹھنڈک میں بھیگ کر دوبارہ جی اٹھتا ہے اور وہ بھاگ جاتا ہے۔ پھر وہ ہمیشہ بدلے کی تاک میں رہتا ہے۔

ٹریکٹر کے لوگوں کو شک تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ رات میں جی اٹھنے کے بعد ترچھ پیشاب کر کے اس میں لوٹ لگائے۔ ایسا ہوا تو چوبیس گھنٹے بیتتے بیتتے، ٹھیک اسی گھڑی کے آتے آتے، ترچھ کا جان لیوا زہر پتاجی پر چڑھنا شروع ہو جائے گا۔ ان لوگوں نے صلاح بھی دی کہ پتاجی کو یہیں سے واپس لوٹ جانا چاہیے اور اگر اتفاق سے ترچھ کی لاش اسی جگہ پڑی ہوئی ہو تو اسے اچھی طرح جلا کر راکھ کر دینا چاہیے۔ لیکن پتاجی نے انہیں بتایا کہ پیشی کتنی ضروری ہے۔ یہ تیسرا سمن تھا اور اگر اس بار بھی وہ عدالت میں حاضر نہ

ہوتے تو غیر ضمانتی وارنٹ نکلنے کا ڈر تھا۔ پیشی بھی ہمارے ہی محلے کے سلسلے میں تھی جس میں ہمارا نمبر رہ رہا تھا۔ وکیل کو پچھلی دو پیشیوں میں فیس بھی نہیں دی جا سکی تھی اور کہیں اگر اس نے لاپروائی دکھلا دی اور جج سنک گیا تو وہ ہماری ڈگری بھی کر سکتا تھا۔

عجیب بات تھی کہ اگر پتاجی اس ترچھ کی لاش کو جلانے کے لیے ڈسٹرکٹ سے آ کر وہیں سے گاؤں لوٹ آتے تو غیر ضمانتی وارنٹ کے تحت گرفتار کر لیے جاتے اور ہمارا گھر ہم سے چھن جاتا، عدالت ہمارے خلاف ہو جاتی۔

لیکن پنڈت رام اوتار ایک وید بھی تھے۔ جیوتش، ہری ہنت کے علاوہ انہیں جڑی بوٹیوں کی بھی اچھی جانکاری تھی۔ انھوں نے بتایا کہ ایک طریقہ ایسا ہے جس سے پتاجی پیشی میں حاضر بھی ہو سکتے ہیں اور ترچھ کے زہر سے چوبیس گھنٹے کے اندر بچ بھی سکتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ چرک کا پودا اس معاملے میں ہے کہ زہر کی زہر کی کاٹ کرتا ہے۔ اگر دھتورے کے بیج کہیں سے مل جائیں تو وہ ترچھ کے زہر کی کاٹ تیار کر سکتے ہیں۔

اگلے گاؤں سات پور میں ڈھنڈھورا دیا گیا اور ایک تیلی کے کھیت میں دھتورے کے پودے آخرکار کھوج نکالے گئے۔ دھتورے کے بیجوں کو پیس کر، تانبے کے پرانے سکے کے ساتھ ابال کر کاڑھا تیار کیا گیا۔ کاڑھا بہت کڑوا تھا اس لیے اسے چائے میں ملایا گیا اور پتاجی کو وہ چائے پلا دی گئی۔ اس کے بعد سب مطمئن ہو گئے۔ ایک بہت بڑے خطرے سے پتاجی کو نکالنے کی کوشش ہو رہی تھی۔

ویسے مجھے ترچھ کے بارے میں تیسری بات بھی معلوم تھی، جو پتاجی کے جانے کے کئی گھنٹے بعد یاد آئی۔ یہ بات سانپ کی اس بات سے ملتی جلتی تھی جس کے نمونے پر آگے چل کر کیمرے کی ایجاد ہوئی تھی۔

مانا جاتا تھا کہ اگر کوئی آدمی سانپ کو مار رہا ہو تو اپنے مرنے سے پہلے وہ سانپ آخری بار اپنے قاتل کے چہرے کو پوری طرح سے، بہت غور سے دیکھتا ہے۔ آدمی اسے قتل کر رہا ہوتا ہے اور سانپ ٹکٹکی باندھ کر اس آدمی کے چہرے کی ایک ایک باریکی کو اپنی آنکھ کے اندرونی پردے پر درج کر رہا ہوتا ہے۔ سانپ کی موت کے بعد سانپ کی آنکھوں کے اندرونی پردے پر اس آدمی کی تصویر ہو بہو محفوظ ہو جاتی ہے۔

بعد میں، آدمی کے چلے جانے کے بعد، اس سانپ کا دوسرا جوڑا آ کر اس مرے ہوئے سانپ کی آنکھوں کے اندر جھانکتا ہے اور اس طرح وہ قاتل پہچان لیا جاتا ہے۔ سارے سانپ اسے پہچاننے لگتے ہیں۔ پھر وہ کہیں بھی چلا جائے، وہ اس سے بدلہ لینے کے فراق میں رہتے ہیں۔ ہر سانپ اس کا دشمن ہوتا ہے۔

مجھے شک تھا کہ مرے ہوئے ترچھ کی آنکھ کے اندرونی پردے پر پتاجی کا چہرہ درج ہو گا، کوئی دوسرا ترچھ آ کر اس لاش کی آنکھ میں جھانکے گا اور پتاجی وہیں پہچان لیے جائیں گے۔ میرے اندر اس

Scanned with CamScanner

بات پر بے چینی پیدا ہوئی کہ پتاجی نے یہ احتیاط کیوں نہیں برتی۔ انھیں ترچھ کو مارنے کے ساتھ ہی کسی پتھر سے اس کی دونوں آنکھوں کو کچل کر پھوڑ دینا چاہیے تھا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟ پتاجی شہر جا چکے تھے اور میرے سامنے الجھن اور یہ چیلنج تھا کہ گاؤں کے پاس پھیلے بڑے بڑے جنگل میں جس جگہ ترچھ کو مار کر چھوڑا تھا، وہ جگہ میں کھوج نکالوں۔

میں تانو کے ساتھ بوتل میں مٹی کا تیل، دیا سلائی اور ڈنڈا لے کر جنگل میں ترچھ کی کھوج میں بھٹکتا رہا۔ میں اُسے اچھی طرح سے پہچانتا تھا، بہت اچھی طرح۔ تانو مایوس تھا۔

پھر مجھے اچانک ہی لگنے لگا کہ اس جنگل کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ایک ایک پیڑ میرا پہچانا نکلنے لگا۔ اسی جگہ سے کئی بار خواب میں میں ترچھ سے بچنے کے لیے بھاگا تھا۔ میں نے غور سے ہر طرف دیکھا: بالکل، یہی وہ جگہ تھی۔ میں نے تانو کو بتایا کہ ایک تنگ سا نالہ اس جگہ سے کتنی دور دکھن کی طرف بہتا ہے۔ نالے کے اوپر جہاں بڑی بڑی چٹانیں ہیں، وہاں کیکر کا ایک بہت پرانا پیڑ ہے جس پر بڑے بڑے شہد کے چھتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ کئی صدیوں پرانے ہیں۔ میں اس کھردرے رنگ کی چٹان کو جانتا تھا جو برسات بھر نالے کے پانی میں آدھی ڈوبی رہتی تھی اور بارش کے بیتنے کے بعد جب باہر نکلتی تھی تو اس کی کھوہوں میں کیچڑ بھر جاتی تھی اور عجیب عجیب قسم کی پتیاں (نباتات) وہاں سے اُگ آتی تھیں۔ چٹان کے اوپر ہری کائی کی ایک پرت سی جم جاتی تھی۔ اسی چٹان کی سب سے اوپر والی دراڑ میں ترچھ رہتا تھا۔ تانو اس بات کو میرا وہم سمجھ رہا تھا۔

لیکن بہت جلد ہمیں وہ نالا مل گیا۔ کیکر کا وہ بوڑھا پیڑ بھی جس پر شہد کے چھتے تھے، اور وہ چٹان بھی۔ ترچھ کی لاش چٹان سے ذرا ہٹ کر زمین پر گھاس کے اوپر چت پڑی ہوئی تھی۔ بالکل، یہ وہی ترچھ تھا۔ میرے اندر وحشت، جوش اور خوشی کی ایک سنسنی دوڑ رہی تھی

تانو نے اور میں نے سوکھے پتے اور لکڑیاں اکٹھی کیں، خوب سارا مٹی کا تیل اس میں ڈالا اور آگ لگا دی۔ ترچھ اس میں جل رہا تھا۔ اس کے جلنے کی چراند ہوا میں پھیل رہی تھی۔ میرا من زور سے چیخنے کو ہوا لیکن میں ڈرا کہ کہیں میں جاگ نہ جاؤں اور یہ سب کچھ خواب نہ ثابت ہو جائے۔ میں نے تانو کی طرف دیکھا۔ وہ رو رہا تھا۔ وہ میرا بہت اچھا دوست تھا۔

میرے خواب میں اسی جگہ سے نکل کر اس ترچھ نے کئی بار میرا پیچھا کرنا شروع کیا تھا۔ تعجب تھا کہ اتنے لمبے عرصے سے اس کے ڈر سے کو اسی اچھی طرح سے جاننے کے باوجود میں نے کبھی دن میں آ کر اسے مارنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

میں آج بے تحاشا خوش تھا۔

پنڈت رام اوتار نے بتلایا تھا کہ ٹریکٹر نے پونے دس بجے کے لگ بھگ شہر کا چنگی ناکا پار کیا تھا۔ وہاں انھیں ناکے کا ٹول ٹیکس چکانے کے لیے کچھ دیر رکنا بھی پڑا تھا۔ وہاں پر پتاجی ٹریکٹر سے اتر کر

Scanned with CamScanner

پیشاب کرنے گئے تھے۔ لوٹنے پر انھوں نے بتایا تھا کہ ان کا سر کچھ گھوم سا رہا ہے۔ تب تک پتاجی کو دھتورے کا کاڑھا پیے ہوئے تقریباً آدھ گھنٹہ ہو چکا تھا۔ ڈرائیور نے پتاجی کو شہر میں دس بج کر پانچ سات منٹ کے آس پاس چھوڑ دیا تھا۔ ڈرائیور کی جیپ میں بیٹھے بڑے گاؤں کے ماسٹر مدن لال کا کہنا تھا کہ جب شہر میں منہ والا ہسپتال کے پاس والے چوراہے پر پتاجی کو ڈرائیور نے اتارا تب انھوں نے شکایت کی تھی کہ ان کا گلا کچھ سوکھ سا رہا ہے۔ وہ تھوڑے پریشان سے تھے کیوں کہ عدالت جانے کا راستہ انھیں معلوم نہیں تھا اور شہر کے لوگوں سے پوچھ پوچھ کر کہیں جانے میں انھیں بہت تکلیف ہوتی تھی۔

پتاجی کے ساتھ ایک دقت یہ بھی تھی کہ گاؤں یا جنگل کی پگڈنڈی تو انھیں یاد رہتی تھی، شہر کی سڑکوں کو وہ بھول جاتے تھے۔ شہر وہ بہت کم جاتے تھے۔ جہاں تک ہو پاتا تو آخری وقت تک اسے ٹالتے رہتے تھے۔ تب تک جب تک جانا بالکل ہی ضروری نہ ہو جائے۔ کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ پتاجی سامان لے کر شہر کے لیے روانہ ہوئے اور بس اڈے سے لوٹ آئے۔ کہا کہ بس چھوٹ گئی۔ جب کہ ہم سب جانتے تھے کہ ایسا نہیں ہوا ہوگا۔ پتاجی نے بس کو دیکھا ہوگا، پھر وہ کہیں بیٹھ گئے ہوں گے، پیشاب کرنے یا پان کھانے۔ پھر انھوں نے دیکھا ہوگا کہ بس چھوٹ رہی ہے۔ انھوں نے ذرا سا اور انتظار کیا ہوگا۔ جب بس نے رفتار پکڑ لی ہوگی تب وہ کچھ دور تک دوڑے ہوں گے، پھر انھوں نے قدم دھیمے کر لیے ہوں گے اور وہ افسوس اور غصہ ظاہر کرتے لوٹ آئے ہوں گے۔ ایسا کرتے ہوئے انھیں خود بھی لگا ہوگا کہ بس سچ مچ چھوٹ گئی ہے۔ ایسے میں جب یہ کہا جاتا کہ وہ شہر جا چکے ہیں، وہ لوٹ کر ہمیں حیران کر دیتے۔

ڈرائیور نے صرف منہ والے ہسپتال کے پاس والے چوراہے پر، ... کمپنی کے ٹھیک سامنے، لگ بھگ دس بج کر سات منٹ پر اتارا۔ اس کے بعد سے شام چھ بجے تک پتاجی کے ساتھ شہر میں جو کچھ بھی ہوا، اس کا صرف ایک دھندلا سا اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ یہ معلومات بھی کچھ لوگوں سے بات چیت اور پوچھ تاچھ کے بعد ملی ہیں۔ کسی کی موت کے بعد، اگر وہ موت حادثاتی اور دردناک ڈھنگ سے ہوئی ہو، ایسی معلومات مل ہی جاتی ہیں۔ اس دن، یعنی ... مئی ۱۹۷۳ کو، صبح دس بجے سے لے کر شام چھ بجے تک، لگ بھگ پونے آٹھ گھنٹے میں پتاجی کہاں کہاں گئے، کہاں کہاں ان کے ساتھ کیا کیا ہوا، اس کا بہت صحیح اور بہت درست حساب لگا پانا تو مشکل ہے۔ جو اطلاعیں یا معلومات بعد میں ملیں، ان کے ذریعے ان واقعات کا صرف ایک خاکہ ہی بنایا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ بڑے گاؤں کے ماسٹر مدن لال کا کہنا تھا، جب پتاجی ڈرائیور سے اترے تبھی انھوں نے گلا سوکھنے کی شکایت کی تھی۔ اس سے پہلے تھانے والے کے پاس جب پتاجی پیشاب کر کے لوٹے تھے تو انھوں نے سر گھومنے کی شکایت کی تھی۔ یعنی پتاجی پر دھتورے کے بیجوں کے کاڑھے کا اثر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ویسے بھی شہر پہنچنے تک پتاجی کو کاڑھا پیے ہوئے لگ بھگ دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس وقت پتاجی کو بہت پیاس لگی ہوگی۔ گلا سوکھنے کے لیے وہ کسی ہوٹل یا ڈھابے کی طرف گئے بھی ہوں گے

Scanned with CamScanner

نہیں، جیسا کہ مجھے اُن کے سُبھاؤ کے بارے میں پتا ہے، وہ وہاں کچھ دیر کھڑے رہے ہوں گے اور پھر ایک گلاس پانی مانگنے کا فیصلہ نہ کر سکے ہوں گے۔ ایک بار انھوں نے بتایا بھی تھا کہ کچھ سال پہلے گرمیوں کے دنوں میں جب انھوں نے کسی ہوٹل میں پانی مانگا تھا تو وہاں کام کرنے والے کسی لڑکے نے انھیں گالی دی تھی۔ پتاجی بہت خوددار تھے، اس لیے انھوں نے اپنی پیاس کو دبایا ہوگا اور وہاں سے چل پڑے ہوں گے۔

ہوٹل سے لے کر ٹھیک گیارہ بجے تک کے عرصے میں، پینتالیس منٹ تک، پتاجی کہاں کہاں گئے اس کی کوئی اطلاع کہیں سے نہیں ملتی۔ اس دوران کوئی ایسا واقعہ بھی نہیں ہوا جس سے کوئی کچھ کہہ سکے۔ پھر شہر میں سڑک پر آتے جاتے لوگوں میں سے کس نے اُن پر دھیان دیا ہو، انھیں دیکھا ہو، اس کا پتا لگانا بھی مشکل ہے۔ ویسے میرا اپنا اندازہ ہے کہ اس دوران پتاجی نے کچھ لوگوں سے عدالت جانے کا راستہ پوچھا ہوگا اور اُن کے دماغ میں یہ بات بھی رہی ہوگی کہ وہ اپنے وکیل ایس این اگروال سے پانی مانگ لیں گے۔ لیکن اُن کے پوچھنے پر یا تو لوگ چپ رہ کر تیزی سے آگے بڑھ گئے ہوں گے یا کسی نے اتنی بوکھلاہٹ اور جلد بازی میں انھیں کچھ بتایا ہوگا کہ پتاجی ٹھیک سے سمجھ نہیں سکے ہوں گے اور صرف بیکل، دکھی اور پریشان ہو کر رہ گئے ہوں گے۔ شہر میں ایسا ہوتا ہی ہے۔

پتاجی گیارہ بجے شہر میں دیش بندھو مارگ پر واقع اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی عمارت میں گئے تھے۔ وہ وہاں کیوں گئے، اس کی وجہ ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آتی۔ ویسے ہمارے گاؤں کا رمیش دت شہر میں بھومی وکاس سہکاری (ہوسنگ ڈیولپمنٹ کوآپریٹو) بینک میں کلرک ہے۔ ہو سکتا ہے پتاجی کے دماغ میں صرف بینک رہا ہو اور وہاں سے گزرتے ہوئے اچانک انھوں نے اسٹیٹ بینک لکھا دیکھا ہو اور ادھر گھوم گئے ہوں۔ انھوں نے اب تک پانی نہیں پیا تھا، اس لیے انھوں نے سوچا ہوگا کہ وہ رمیش دت سے پانی بھی مانگ لیں گے، عدالت کا پتا بھی پوچھ لیں گے اور اسے بتا بھی سکیں گے کہ اُن کا سر گھوم رہا ہے؛ یہ بھی کہ انھیں کل شام ترچھ نے کاٹا تھا۔ اسٹیٹ بینک کے کیشیئر اگنی ہوتری کے مطابق وہ اس وقت کیش رجسٹر چیک کر رہا تھا۔ اس کی میز پر لگ بھگ تیس ہزار روپوں کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس وقت گیارہ بج کر دو تین منٹ اوپر رہے ہوں گے، تبھی پتاجی وہاں آئے۔ اُن کے ماتھے پر دھول لگی ہوئی تھی، چہرہ ڈراؤنا تھا اور اچانک ہی انھوں نے زور سے کچھ کہا تھا۔ اگنی ہوتری کا کہنا تھا کہ میں چونک کر ڈر گیا۔ عام طور پر ایسے لوگ بینک کے اندر، کیشیئر کی ٹیبل تک نہیں پہنچ پاتے۔ اگنی ہوتری کا کہنا یہ بھی تھا کہ اگر وہ پتاجی کو ایک آدھ منٹ پہلے سے اپنی طرف آتا ہوا دیکھ لیتا تب شاید اتنا نہ ڈرتا۔ لیکن ہوا یہ کہ وہ پوری طرح سے کیش رجسٹر کے حساب کتاب میں ڈوبا ہوا تھا، تبھی اچانک پتاجی نے آواز نکالی اور سر اٹھاتے ہی انھیں دیکھ کر وہ ڈر گیا اور چونک پڑا۔ اس نے گھنٹی بھی بجا دی۔

بینک کے چپراسیوں، دو چوکیداروں اور دوسرے ملازموں کے مطابق، اچانک ہی کیشیئر کی چیخ اور گھنٹی کی آواز سے وہ سب لوگ چونک گئے اور اُسی طرف دوڑے۔ تب تک نیپالی چوکیدار تھاپا نے

Scanned with CamScanner

پنڈت جی کو دیکھ لیا تھا اور بار بار ہو کا میں روم کی طرف سے جا رہا تھا۔ ایک چپراسی رام کشور نے، جس کی عمر پچپن برس سے اوپر تھی، کہا کہ اس نے سمجھا کوئی شرابی وغیرہ میں گھس آیا ہے یا پاگل، وہ چونکہ اس کی ڈیوٹی بینک کے صدر دروازے پر تھی اس لیے برانچ مینیجر اسے چارج شیٹ کر سکتا تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ جب پنڈت جی کو دھکا مارا تھا، تب ہی لوگوں نے گڑبڑی میں کچھ بولنا شروع کر دیا۔ اسی وجہ سے چپراسیوں کا شک بڑھ گیا۔ اس دن شاید اسسٹنٹ برانچ مینیجر صاحب نے یہ کہہ دیا کہ اس آدمی کی بھی طرح سے جانچ ہونی چاہیے ... رام کشور کا کہنا تھا کہ پنڈت جی کا چہرہ عجیب طرح سے ڈراؤنا ہو گیا تھا ... بینک کے چپراسیوں نے پنڈت جی کو ... لیکن بینک سے باہر ... چوپاں کی دکان کے ... بیٹھے ... بینک سے باہر ... آنکھوں سے بچے ہوئے اور ... تھے۔ ... مٹی ... جاتے ہیں۔

اس کے بعد، یعنی ساڑھے گیارہ بجے سے لے کر ایک بجے تک کے عرصے میں، پنڈت جی کہاں کہاں گئے، اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا ... اسٹیٹ بینک سے ... پان کی دکان لگانے والے ... سے ... نہیں تھا، یا ہو سکتا ہے کہ اسٹیٹ بینک سے ... نے بتلایا تھا کہ اسٹیٹ بینک سے باہر نکلے ... شاید ... پنڈت جی سے ... روپیہ اور کاغذ ... بینک کے چپراسیوں سے ... ہو سکتا ہے پنڈت جی سے کوئی اور بات کہی ہو ... ان کا چہرہ ... کافی ... تھا، ... اور ان کا دماغ ٹھکانے نہیں تھا۔

میرا اپنا اندازہ ہے کہ اس وقت تک پنڈت جی ... کا ... زیادہ ... تھا۔ حالانکہ پنڈت رام اوتار اس بات سے انکار کرتے ہیں ... کے بیچ تو ہوں کے دنوں میں ... کے ساتھ ہی گھومتے ہیں لیکن ... نہیں ہوتا کہ آدمی بالکل پاگل ہو جائے۔ پنڈت رام اوتار کا ... سے ... اس وقت پنڈت جی سے ... شروع ہو گیا تھا اور ان کا نشہ ان کے دماغ تک پہنچ جاتا ... اسٹیٹ بینک میں پنڈت جی کو ... چپراسیوں نے ... کی طرف ... اور اسی دھکے سے ان کا دماغ ... گیا ہو ... اس وقت تک پنڈت جی ... اور وہ پوری کوشش کر رہے تھے ... شہر سے ... روپیہ اور ... کے کاغذات بینک میں چھین جانے کی وجہ سے ... ان کا مطلب نہیں ہے۔ انھوں نے شاید ایک ... کا ... اسٹیٹ بینک ... تو گھر ... ایسا کرنے کی ان کی ہمت نہیں

پڑتی ہوئی۔ وہ ڈر گئے ہوں گے۔ میں اُن کی زندگی میں پہلی بار اِس ڈر سے [illegible] اس لیے وہ ٹھیک سے سوچنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے ہوں گے۔ اُن کا جسم بہت دبلا تھا اور بچپن ہی سے اُنہیں دمے کی سانس کی شکایت تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُس وقت تک اُن پر کاڑھے کا اثر ختم ہو چکا ہو اور وہ ایک چیز پر دیر تک سوچ نہ پا رہے ہوں اور دماغ میں ہلچل پیدا ہو رہی ہو اور چھوٹے چھوٹے جملوں جیسے جگنوؤں یا [illegible] کے بس میں [illegible] اِدھر سے اُدھر چل پھر رہے ہوں۔ لیکن میں یہ بتا دوں، مجھے پورا یقین ہے، کہ اُن کے دماغ میں گھر لوٹ آنے اور شہر سے نکل جانے کی بات -- ایک چیخ، بار بار اندھیرے سے اُبھر رہی ہوگی، مجھے یہ بہت موہوم اور بہت دھندلی بات -- [illegible] ہو رہی ہوگی۔

پتاجی ٹھیک سوا گیارہ بجے شہر کے پولیس تھانے پہنچے تھے۔ تھانہ شہر کے [illegible] ہاؤس کے پاس [illegible] مسجد (مینار والی) کے پاس ہے۔ تعجب یہ ہے کہ تھانے سے صرف ایک کلومیٹر دور عدالت بھی ہے۔ اگر پتاجی چاہتے تو یہاں سے پیدل دس منٹ میں عدالت پہنچ سکتے تھے۔ سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ پتاجی اگر یہاں تک پہنچے تھے، کیا تب تک اُن کے دماغ میں عدالت جانے کی بات رہ ہی گئی تھی۔ اُن کے پاس کاغذات تو رہے نہیں گئے تھے۔

تھانے کے ایس ایچ او اور انسپکٹر پرتاپ سنگھ نے کہا کہ اُس وقت ایک [illegible] ہوئے تھے۔ وہ [illegible] لائے ہوئے قتل کو رجسٹر کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ [illegible] انہوں نے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ کچھ نہیں پاتے اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا [illegible] پتاجی وہاں آئے تھے۔ اُن کے جسم پر قمیص نہیں تھی۔ بنیان پھٹی ہوئی تھی۔ [illegible] سے [illegible] نہیں [illegible] تھانے میں اُس وقت ایک ہی سپاہی [illegible] تھا۔ سپاہی کا کہنا تھا کہ اُس نے سوچا کہ شاید کوئی [illegible] تھانے میں گھس آیا ہے۔ اُس نے [illegible] دی لیکن پتاجی تب تک ایس ایچ او اور انسپکٹر پرتاپ سنگھ کی ٹیبل تک پہنچ چکے تھے۔ ایس ایچ او [illegible] کا موڈ خراب تھا۔ تیرہ سال کی شادی شدہ [illegible] نہیں تھی کہ انہیں کوئی بھی چیز بالکل ناپسند ہیں۔ [illegible] ہیں۔ انہوں نے جیسے ہی [illegible] پتاجی بالکل اُن کے قریب پہنچ گئے۔ پانی سے جسم [illegible] اور کندھوں کے پیچھے لٹکی ہوئی تھی اور اُس کی بہت تیز بو آ رہی تھی۔ ایس ایچ او نے پوچھا [illegible] بات سے تو جواب میں پتاجی نے جو کچھ کہا اُسے سمجھنا بہت مشکل تھا۔ ایس ایچ او [illegible] سنگھ بعد میں [illegible] تھے کہ [illegible] ہمیں معلوم ہوتا کہ یہ آدمی کسی گاؤں کا [illegible] تو وہ اُسے تھانے [illegible] میں [illegible] بٹھا دیتے، [illegible] لیکن اُس وقت ہمیں لگا کہ یہ کوئی پاگل ہے [illegible] نہیں جانتے ہوئے [illegible] یہاں تک گھس آیا ہے، اس لیے انہوں نے سپاہی [illegible] دی۔ [illegible] پتاجی کو گھسیٹ [illegible] باہر لے گیا۔ [illegible] کا کہنا تھا کہ اُس نے پتاجی کے ساتھ کوئی مارپیٹ نہیں کی اور اُس نے دیکھا تھا کہ جب وہ تھانے آئے تھے تب اُن کا [illegible] ہوا تھا، [illegible] کہیں [illegible]

گرنے سے کھرونچ کے نشان تھے اور کہیں کہیں چھلی ہوئی تھیں۔ وہ کہیں نہ کہیں گرے ضرور تھے۔

یہ کوئی نہیں جانتا کہ تھانے سے نکل کر لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹے پتاجی کہاں کہاں بھٹکتے رہے۔ صبح دس بج کر سات منٹ پر، جب وہ شہر آئے تھے اور منروا ٹاکیز کے پاس والے چوراہے پر ٹریکٹر سے اترے تھے، تب سے لے کر اب تک انھوں نے کہیں پانی پیا تھا یا نہیں، یہ جاننا مشکل ہے۔ اس کا امکان کم ہی ہے۔ ہو سکتا ہے اس وقت تک ان کا دماغ اس قابل نہ رہ گیا ہو کہ وہ پیاس کو بھی یاد رکھ سکیں۔ لیکن اگر وہ پولیس تھانے تک پہنچے تو ان کے ذہن میں، نشے کے باوجود، کہیں بہت گہرے دور سے، اندھیرے میں ڈوبا یہ دھیان رہا ہوگا کہ کسی طرح وہ اپنے گاؤں جانے کا راستہ وہاں پوچھ لیں، یا اس ٹریکٹر کا پتہ پوچھیں یا پھر اپنے روپے اور عدالتی کاغذات جیب سے غائب ہونے کی رپورٹ وہاں لکھا دیں۔ یہ سوچنے کے قریب پہنچنا ہی بُری طرح سے بے چین کر ڈالنے والا ہے کہ اس وقت پتاجی صرف ترچھ کے زہر اور دھتورے کے نشے ہی کے خلاف نہیں لڑ رہے تھے بلکہ ہمارے مکان کو بچانے کی فکر بھی کہیں نہ کہیں ان کے نشے کی دھند میں سے بار بار سر اٹھا رہی تھی۔ شاید انھیں اب تک یہ لگنے لگا ہوگا کہ یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے، صرف ایک خواب ہے۔ پتاجی اس سے جاگنے اور باہر نکلنے کی کوشش بھی کرتے رہے ہوں گے۔

سوا دو بجے کے آس پاس پتاجی کو شہر کے سب سے آخری چھور پر بسی سب سے خوشحال کالونی، اتوری کالونی، میں گھسٹتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ یہ کالونی مرکز کے جوہریوں، پی ڈبلیو ڈی کے بڑے ٹھیکیداروں اور ریٹائرڈ افسروں کی کالونی تھی۔ کچھ آسودہ حال صحافی شاعر بھی وہاں رہتے تھے۔ یہ کالونی ہمیشہ پرسکون اور ہنگامے سے محفوظ رہتی تھی۔ جن لوگوں نے یہاں پتاجی کو دیکھا تھا، انھوں نے بتایا کہ اس وقت تک ان کے جسم پر صرف ایک پٹے دار جانگیا بچا تھا جس کا ناڑا شاید ٹوٹ گیا تھا اور وہ اسے اپنے بائیں ہاتھ سے بار بار سنبھال رہے تھے۔ جس نے بھی انھیں وہاں دیکھا اس نے یہی سمجھا کہ کوئی پاگل ہے۔ کچھ نے کہا کہ وہ بیچ بیچ میں کھڑے ہو کر زور زور سے گالیاں بکنے لگتے تھے۔ بعد میں اسی کالونی میں رہنے والے ایک ریٹائرڈ تحصیلدار سونی صاحب اور شہر کے سب سے بڑے اخبار کے چیف رپورٹر ستیندر تھپلیال نے بتایا کہ انھوں نے پتاجی کے بولے کو ٹھیک سے سنا تھا اور دراصل وہ گالیاں نہیں بک رہے تھے بلکہ بار بار کہہ رہے تھے: میں رام سوارتھ پرساد، ایکس اسکول ہیڈ ماسٹر... ولد... آف... گرام بکیلی... شاعر اور صحافی تھپلیال صاحب نے دکھ ہی ظاہر کیا۔ دراصل اسی وقت وہ امریکی سفیر کی کسی خاص پارٹی میں سنگیت سننے دلی جا رہے تھے اس لیے جلد بازی میں وہ چلے گئے۔ ہاں تحصیلدار سونی صاحب کا کہنا تھا کہ مجھے اس آدمی پر ترس آیا اور میں نے لڑکوں کو ڈانٹا بھی۔ لیکن دو تین لڑکوں نے کہا کہ یہ آدمی رمیش دت کی بیوی اور سالی پر حملہ کرنے والا تھا۔ تحصیلدار نے کہا کہ ایسا سننے کے بعد انھیں بھی لگا کہ ہو سکتا ہے یہ کوئی بدمعاش ہو اور ناٹک کر رہا ہو۔ لڑکے انھیں تنگ کرنے میں لگے تھے اور پتاجی بیچ بیچ میں زور زور سے بولتے تھے: میں رام سوارتھ پرساد... ایکس اسکول

ہیڈماسٹر۔۔۔"

اگر حساب لگایا جائے تو سنٹرل واٹا گیز کے پاس والا چوراہا، جہاں پتاجی ٹریکٹر سے صبح دس بج کر سات منٹ پر اترے تھے، وہاں سے لے کر دیش بندھو مارگ کا اسٹیٹ بینک، پھر وہاں سے کھمبے کے پاس کا تھانا، اور شہر کے باہری اتری چھور پر بسی اتواری کالونی کو ملا کر وہ اب تک تین چھتیس کلومیٹر کی دوری تک بھٹک چکے تھے۔ یہ جگہیں ایسی ہیں جو ایک ہی سمت میں نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پتاجی کی دماغی حالت یہ تھی کہ انہیں ٹھیک ٹھیک کچھ سوجھ نہیں رہا تھا اور وہ جو ایک ہی کسی بھی طرف چل پڑتے تھے۔ جہاں تک صراف کی بیوی اور سالی بہن کے عہد کرنے کی بات ہے، جسے تیمیوں صاحب سچ مانتے ہیں، میرا اپنا اندازہ ہے کہ پتاجی ان کے پاس یا تو پانی مانگنے گئے ہوں گے یا بھیلی جانے والی سڑک کے بارے میں پوچھنے۔ اس ایک پل کے لیے پتاجی کو ہوش ضرور رہا ہوگا۔ لیکن ان جیسے آدمی کو بہت قریب دیکھ کر وہ عورتیں ڈر کر چیخنے لگی ہوں گی۔ ویسے پتاجی کی داہنی آنکھ کے اوپر ماتھے پر جو چوٹ تھی اور جس کا خون رس کر ان کی آنکھ پر آنے لگا تھا، وہ چوٹ ان کو اتواری کالونی ہی میں لگی تھی، کیوں کہ بعد میں لوگوں نے بتایا کہ لڑکے بیچ بیچ میں انہیں ڈھیلے مار رہے تھے۔

وہ جگہ اتواری کالونی سے بہت دور نہیں ہے جس جگہ پتاجی کو سب سے زیادہ چوٹیں آئیں۔ نیشنل ریسٹورنٹ نام کے ایک سستے سے ڈھابے کے سامنے کی خالی جگہ پر پتاجی گھر گئے تھے۔ اتواری کالونی سے لڑکوں کا جو جھنڈ ان کے پیچھے پڑ گیا تھا، اس میں کچھ بڑی عمر کے لڑکے بھی شامل ہو گئے تھے۔ نیشنل ریسٹورنٹ میں کام کرنے والے ہو کر سنگھ کا کہنا تھا کہ پتاجی نے غلطی یہ کی تھی کہ ایک بار غصے میں آ کر بھیڑ پر ڈھیلے مارنے شروع کر دیے تھے۔ شاید انہیں میں کا ایک ڈھیلا سات آٹھ سال کے لڑکے وکی اگروال کو لگ گیا تھا، جسے بعد میں کئی ٹانکے لگے تھے۔ سنگھ کا کہنا ہے کہ اس کے بعد مجمع زیادہ خطرناک ہو گیا تھا۔ وہ شور مچا رہے تھے اور چاروں طرف سے پتاجی پر پتھر مار رہے تھے۔ ڈھابے کے مالک سردار ستنام سنگھ نے بتایا کہ اس وقت پتاجی کے جسم پر صرف پٹے والی ایک چڈی تھی۔ دبلے بدن کی ہڈیاں اور چھاتی کے سفید بال دکھ رہے تھے۔ پیٹ پچکا ہوا تھا، وہ دھول اور مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے، سر کے سفید بال بکھر گئے تھے، داہنی آنکھ کے اوپر سے اور نچلے ہونٹ سے خون بہہ رہا تھا۔ ستنام سنگھ نے دکھ اور افسوس کے ساتھ کہا، "میرے کو کیا معلوم تھا کہ یہ آدمی سیدھا سادا، عزت دار رہا ہوگا، ہوش کا انسان ہے اور نصیب کے پھیر میں اس کی یہ حالت ہو گئی ہے۔" ویسے ڈھابے میں کپ پلیٹ دھونے والے نوکر ہری کا کہنا تھا کہ بیچ بیچ میں پتاجی بھیڑ کو اشٹ شٹ گالیاں دے دے کر ڈھیلے مارنے لگتے تھے۔ "آؤ سسرو، آؤ۔۔۔ ایک ایک کو مار ڈالوں گا۔۔۔ تمہاری ماں کی۔۔۔" لیکن مجھے شک ہے کہ پتاجی نے ایسی کوئی گالی دی ہوگی۔ ہم نے کبھی بھی انہیں گالی دیتے نہیں سنا تھا۔

میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، کیوں کہ پتاجی کو میں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں، کہ اس وقت تک انہیں کئی بار لگا ہوگا کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ حقیقت نہیں ہے، ایک خواب

Scanned with CamScanner

[illegible] جانے کی کیا ضرورت ہے۔

[illegible] سکتا ہے۔

[illegible]

ایک سب سے بڑی بدقسمتی بھی پیش آئی۔ ہمارے گاؤں کی گرام پنچایت کے سرپنچ اور پتاجی کے بچپن کے پرانے دوست پنڈت کندن رام تیواری ٹھیک ساڑھے تین بجے نیشنل ریسٹورنٹ کے سامنے، سڑک سے گزر رہے تھے۔ وہ رکشے پر تھے۔ انہیں اگلے چوراہے پر سے بس سے گاؤں لوٹنا تھا۔ انہوں نے اس ڈھابے کے سامنے کسی بھیڑ کو بھی دیکھا اور انہیں یہ پتہ بھی چل گیا کہ وہاں پر کسی آدمی کو مارا جا رہا ہے۔ ان کی یہ خواہش بھی ہوئی کہ وہاں جا کر دیکھیں کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ انہوں نے رکشا رکوا بھی لیا۔ لیکن ان کے پوچھنے پر کسی نے کہا کہ کوئی پاکستانی جاسوس پکڑا گیا ہے جو پانی کی ٹنکی میں زہر ڈالنے جا رہا تھا، اسی کو لوگ مار رہے ہیں۔ ٹھیک اسی وقت پنڈت کندن رام کو گاؤں جانے والی بس آتی ہوئی دکھی اور انہوں نے رکشے والے سے اگلے چوراہے تک جلدی جلدی چلنے کو کہا۔ شام [illegible] کے بعد گاؤں جانے والی یہ آخری بس تھی۔ اگر اس بس کے آنے میں تین چار منٹ کی بھی دیر ہو جاتی تو وہ یقیناً وہاں جا کر پتاجی کو دیکھتے اور انہیں پہچان لیتے۔ عموماً ریسٹورنٹ کا یہ شام کی وہ بس آدھا پون گھنٹہ لیٹ رہا کرتی تھی لیکن اس دن، اتفاق سے، وہ بالکل ٹھیک وقت پر آ رہی تھی۔

ستنام سنگھ کا کہنا تھا کہ وہ بھیڑ نیشنل ریسٹورنٹ کے سامنے سے ہٹ گئی اور وہاں تڑپتے ہوئے جب بڑی دیر تک پتاجی زمین سے اٹھے ہی نہیں۔ پیٹ کا ایک زخم [illegible] بہہ رہا تھا۔ ان کے منہ سے خون آنا شروع ہو گیا تھا [illegible]۔ ستنام سنگھ نے بتایا کہ [illegible] بہت دیر تک نہیں ہلے جلے تو لڑکوں کے جھنڈ میں سے کسی نے کہا کہ لگتا ہے مر گیا۔ جب بھیڑ چھٹنے لگی [illegible] پتاجی نہیں ہلے جلے تو ستنام سنگھ نے سوچا کہ وہ دکان سے جا کر پانی کے چھینٹے مار کر دیکھے کہ اگر وہ صرف بے ہوش ہیں تو ہو سکتا ہے کہ [illegible] ہیں۔ لیکن [illegible] کی وجہ سے رہا تھا۔ بعد میں ستنام سنگھ نے خود ہی ایک بالٹی پانی ان کے اوپر ڈالا تھا۔ وہ [illegible] پانی ڈالنے [illegible] زمین کی مٹی گیلی ہو کر پتاجی کے بدن سے چپک گئی تھی۔

سردار ستنام سنگھ اور [illegible] دونوں کا کہنا تھا کہ لگ بھگ پانچ بجے تک [illegible] پڑے ہوئے تھے۔ تب تک پولیس نہیں آئی تھی۔ یہ ستنام سنگھ نے [illegible] کہ [illegible] اس لیے اس نے ڈھابا بند کر دیا تھا اور [illegible] میں [illegible] دیکھنے چلا گیا تھا۔

اس وقت تک شام ہو چلی تھی جب [illegible] کی دکانوں میں سے ایک موچی شیشو کی نظر پتاجی کے [illegible] پر [illegible]۔ اس وقت تک ان [illegible] میں [illegible] بھی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل [illegible] چپ چاپ [illegible] دیکھتا رہا تھا۔ [illegible] پر کالک اور [illegible] لگی ہوئی تھی اور جگہ جگہ چوٹیں تھیں۔

شیشو ہمارے گاؤں کے [illegible] کے پاس والے ٹیلے کا موچی ہے۔ اس نے بتایا کہ [illegible] دیکھ لیا

وہ ماسٹر صاحب کو پہچان ہی نہیں پایا۔ ان کا چہرہ زرد اور سوجا ہوا تھا اور جسم لی میں نہیں آتا تھا۔ میں ڈر کر کشتی سے باہر نکل آیا اور شور مچانے لگا۔ دوسرے مچھیروں کے علاوہ وہاں کچھ اور لوگ بھی اکٹھے ہو گئے تھے۔ لوگوں نے جب سیتو کی کشتی میں آ کر دیکھا تو کشتی کے اندر، اس کے سب سے اندر کے کونے میں، ٹوٹے پھوٹے موتی، ہنڈے کے ٹکڑوں اور زیور چاندی کے بیچ پنڈت جی دبکے ہوئے تھے۔ ان کی سانس تھوڑی سی چل رہی تھی۔ انہیں وہاں سے کھینچ کر باہر نکالا گیا۔ تبھی سیتو نے انہیں پہچان لیا۔ سیتو کا کہنا تھا کہ اس نے پنڈت جی کے کان میں کچھ آوازیں سی لگائی تھیں لیکن وہ کچھ بول نہیں پا رہے تھے۔ صرف دیر بعد ہونٹوں سے ... اور شکل میں کچھ کہا تھا۔ پھر چپ ہو گئے تھے۔

پنڈت جی کی موت ساڑھے نو بجے کے آس پاس ہوئی تھی۔ تاریخ تھی ۲۰ مئی ۱۹۷۲۔ تو ہم گھنٹے پہلے تک کسی وقت ہمیں شکل میں آ رہے سے قاتل تھا۔ تو ہمیں گھنٹے پہلے ہی پنڈت جی ان واقعات اور اس موت کا اندازہ کر سکتے تھے؟

پولیس نے پنڈت جی کی لاش شہر کے ... میں بھجوا دی تھی۔ پوسٹ مارٹم میں پتا چلا تھا کہ ان کی ہڈیوں میں کئی جگہ فریکچر تھا، دماغ میں ... چوٹ لگی تھی، کان کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔ ان کی موت دماغی صدمے اور زیادہ خون بہہ جانے کے سبب سے ہوئی تھی۔ رپورٹ کے مطابق ان کا معدہ خالی تھا، پیٹ میں کچھ نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ... ہونٹوں کا ... پہلے ہی نکل چکا تھا۔

حالانکہ ... سے ... ہوئے تھے ... سے کوئی نہیں بچ سکتا؛ شک یہ بھی کتنے ... سے ... دیکھا اور پنڈت جی کی موت ہوئی۔ پنڈت ... اوتار ... کہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ پنڈت ... ہو ... ہے ... سکتے ہوں ... یقین ... چاہتے ہوں ... سے ... کا پنڈت جی کی موت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

میں سوچتا ہوں ... لگانے کی کوشش کرتا ہوں کہ شاید ... تھے، جب سیتو نے اپنی کشتی کے باہر پنڈت جی کے ... آ ... کی ... پنڈت جی موت سے ... گئے ہوں گے ... ہوں گے ... ان کو ... کوئی ... ہوگا ... ندی کی طرف چلے گئے ہوں گے ... ندی کے ٹھنڈے پانی سے ... ہوگا ... ہوگا، اور اس کے ڈوبنے سے موت ... گئے ہوں گے ... ان کے ... ہے ... ہوگا۔ ... کے ... کی طرح ... نہیں پریشان کیا ہوگا۔

... پچھلے ... سے ... ہوں ... آتا ہے۔ وہ یوں ہے کہ میں کھونٹوں کی ... کی ... ہوں ... تیج کیا ہوں۔ میں رکتا ہوں، کیکر کے پیڑ کو دیکھتا ہوں۔ وہ ... تنہا ... کی ... بارش ... کے پانی میں ڈوبی رہتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں ... کی ... ہوئی ہے۔ مجھے ایک ... خوشی ہے ... میں ... سے ... میں ... کے ... تو کھینچے لگتا ہوں زور زور سے اسے مارتا ہوں۔ میرے پاس ... تو

Scanned with CamScanner

مٹی کا تیل ڈرم جیسے لیے کھڑے ہے۔ تبھی، اچانک ہی میں پاتا ہوں کہ میں اس چٹان پر نہیں ہوں۔ چٹان تو ہی وہاں نہیں ہے۔ وہاں کوئی جنگل نہیں ہے بلکہ میں دراصل شہر میں ہوں۔ میرے کپڑے بہت ہی میلے، پھٹے اور چیتھڑوں جیسے ہو گئے ہیں۔ میرے گالوں کی ہڈیاں نکل آئی ہیں، بال بکھرے ہیں۔ مجھے پیاس لگی ہے اور میں بولنے کی کوشش کرتا ہوں۔ شاید میں پہلی، اپنے گھر جانے کا راستہ پوچھنا چاہتا ہوں اور تبھی اچانک چاروں طرف شور اٹھتا ہے۔۔۔ گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔۔۔ ہزاروں ہزاروں گھنٹیاں۔۔۔ میں بھاگتا ہوں۔

میں بھاگتا ہوں۔۔۔ میرا جسم بے دم ہونے لگتا ہے، پھیپھڑے پھول جاتے ہیں۔ میں پاس پاس قدم رکھ کر اچانک لمبی لمبی چھلانگیں لگاتا ہوں۔ اڑنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن لگتا ہے میرے سر پاس پیچھے والی ہوتی ہے۔ ایک عجیب سی، گرم اور بھاری سی جو مجھے بس کر دیتی ہے۔ اپنے قتل کی سانسیں مجھے چھونے لگتی ہیں۔۔۔ اور آخر کار وہ پل آ جاتا ہے جب میری زندگی کا خاتمہ ہونے والا ہوتا ہے۔۔۔

میں روتا ہوں۔۔۔ جاگنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرا پورا بدن نیند میں ہی پسینے میں ڈوب جاتا ہے۔ میں زور زور سے ہل کر جاگنے کی کوشش کرتا ہوں۔۔۔ میں یقین کر جاتا ہوں کہ یہ خواب ہے۔۔۔ اور ابھی آنکھ کھولتے ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ میں خواب کے اندر ہی آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا ہوں۔۔۔ دور تک۔۔۔ لیکن وہ پل آخر آ ہی جاتا ہے۔۔۔

ماں باہر سے مجھے دیکھتی ہیں۔ میرا ماتھا سہلا کر وہ مجھے رضائی سے ڈھانپ دیتی ہیں اور میں وہاں اکیلا چھوڑ دیا جاتا ہوں۔ اپنی موت سے بچنے کی کوشش میں جوجھتا، بے دم ہوتا، روتا، چیختا اور بھاگتا۔

ماں کہتی ہیں مجھے سب کی نیند میں بڑبڑانے اور چیخنے کی عادت ہے۔ لیکن میں پوچھنا چاہتا ہوں، وہی سوال مجھے ہمیشہ پریشان کرتا ہے، کہ مجھے صاحب ترچھ کا خوف کیوں نہیں آتا۔

**

# لکھنے والوں کا تعارف

## امر کانت

[illegible]

## رام کمار

[illegible]

## اُشا پریم ودا

[illegible]

## راجندر یادو

[illegible]

[illegible] ١٩٨٦ سے [illegible] شائع ہوتے [illegible] ترتیب، چھوٹے اور کامیاب [illegible] سے ہندی [illegible] [illegible] کھیل کھولے [illegible] جھوٹے [illegible] تک [illegible] ٹوٹی، ڈھول [illegible] تک پہنچے [illegible] کاش [illegible] منتخب [illegible] شاعری کا مجموعہ "آواز تیری ہے" [illegible] اس کے علاوہ تنقید اور متفرق مضامین پر مشتمل کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

## موہن راکیش

١٩٢٥ میں امرتسر (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ [illegible] میں تعلیم پائی۔ [illegible] ہندی [illegible] [illegible] ١٩٧٢ میں [illegible] شامل [illegible] کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ [illegible] "آدھے ادھورے" کئی زبانوں میں کھیلا جا چکا ہے۔

## بھیشم ساہنی

١٩١٥ میں راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ اسکول کی تعلیم وہیں مکمل کی۔ [illegible] پھر راولپنڈی واپس آ کر وہاں کے ایک کالج میں [illegible] ١٩٥٣ [illegible] ١٩٥٧ میں بھیشم ساہنی غیر ملکی [illegible] ١٩٦٥ سے ١٩٦٧ تک [illegible] ١٩٧٥ میں [illegible] اس کے علاوہ بھیشم ساہنی کو [illegible] [illegible] شائع ہو چکے ہیں۔

## نرمل ورما

۱۹۲۹ میں شملہ میں پیدا ہوئے۔ [illegible] سینٹ سٹیفنز کالج، دلی، سے تاریخ میں [illegible] ۱۹۵۹ میں [illegible] ۱۹۷۲ میں ہندوستان واپس [illegible] انسٹیٹیوٹ [illegible] ۱۹۷۷ [illegible] "ہر بارش میں"، "کوا اور کالا پانی" [illegible]

## شانی

[illegible]

## صفر وجاہت

[illegible]

## منو بھنڈاری

[illegible] ۱۹۳۱ میں [illegible]

## راجی سیٹھ

اکتوبر ۱۹۳۵ میں نوشہرہ، صوبہ سرحد، میں پیدا ہوئیں۔ اب دلی میں رہتی ہیں۔ لکھنے کا آغاز ۱۹۷۵ میں کیا۔ کہانیوں کے مجموعے: اندھے موڑ سے آگے، تیسری ہتھیلی۔

## سودیش دیپک

اگست ۱۹۴۲ میں راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۷۰ سے گاندھی میموریل کالج، امبالہ چھاؤنی میں پڑھا رہے ہیں۔ لکھنے کی ابتدا ۱۹۶۰ کی دہائی میں کی۔ کہانیوں کے مجموعے: اشواروہی، ماتم، تماشا۔ ناول: نمبر ستاون اسکواڈرن، مایاپوت۔

## گووند مشر

اگست ۱۹۳۹ میں باندا، اتر پردیش، میں پیدا ہوئے۔ انگریزی میں ایم اے کیا۔ کہانیوں کے مجموعے: "رگڑ کھاتی آتم ہتیائیں"، "نئے پرانے ماں باپ"، "انت پور"، "دھانسو"، "خود کے خلاف"، "خاک اتہاس"، "پاچ"۔ ناول: "وہ اپنا چہرہ"، "اترتی ہوئی دھوپ"، "لال پیلی زمین"، "حضور دربار"، "تمہاری روشنی میں"۔ سفرنامے: "دھند بھری سرخی"، "دروازوں کے پار شام"۔

## عبدل بسم اللہ

جولائی ۱۹۴۹ میں حلوارا، الہ آباد، میں پیدا ہوئے۔ ہندی ادب میں ایم اے اور ڈی لٹ کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دلی، کے ہندی شعبے میں استاد ہیں۔ کہانیوں کا مجموعہ: دو چھوٹے ہتوں کا بیان۔ ناول: جھینی جھینی بینی چدریا، سمر شیش ہے، زہر باد، دنت کتھا۔ نظموں کے مجموعے: ٹوٹا ہوا پنکھ، کتنے کتنے سوال۔

## شری لال شکل

۱۹۲۵ میں لکھنؤ، اتر پردیش، کے ایک قریبی گاؤں اترولی میں پیدا ہوئے۔ الہ آباد یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد سول سروس میں شامل ہوئے۔ ۱۹۵۷ میں ان کا پہلا ناول شائع ہوا اور کچھ ہی عرصے بعد طنزیہ کہانیوں کا ایک مجموعہ۔ ان کا شاہکار ناول "راگ درباری" ۱۹۶۸ میں شائع ہوا اور ۱۹۷۰ میں اسے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا۔ اس کے بعد سے ان کے کئی ناول، کہانیوں، مضامین اور طنزیہ خاکوں کے مجموعے، بھگوتی چرن ورما کی سوانح وغیرہ شائع ہو چکی ہیں۔ شری لال شکل اب ریٹائر ہو چکے ہیں اور لکھنؤ میں رہتے ہیں۔

## گیان رنجن

[illegible] ۱۹۳۶ میں [illegible] میں پیدا ہوئے۔ [illegible]

[illegible]

## اودے پرکاش

[illegible] ۱۹۵۲ میں [illegible] کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ [illegible] شاعر اور کہانی کار کی حیثیت سے معروف ہیں [illegible] ۱۹۸۱ میں [illegible] ۱۹۸۳ میں [illegible]

**

پ کی خوشحالی کے لیے ایک نیا منصوبہ
نیشنل بینک
ماہانہ
آمدنی
اسکیم
اس اسکیم میں کم از کم دس ہزار اور زیادہ سے
زیادہ جتنی رقم چاہیں جمع کرائیں اور متوقع
منافع فیصد سالانہ کے حساب سے حاصل کریں۔
جمع شدہ رقوم پر حکومت پاکستان کی ضمانت
تفصیلات کے لیے بینک کی کسی بھی شاخ سے رجوع کریں
نیشنل بینک آف پاکستان

# آج

## سالانہ خریداری

پاکستان
چار شماروں کی قیمت: ۲۰۰ روپے
آٹھ شماروں کی قیمت: ۳۵۰ روپے

بینک ڈرافٹ کے ذریعے رقم بھیجنے کے لیے پتا
B-140, Sector 11-B,
North Karachi Township, Karachi 75850

امریکا، کینیڈا، یوروپ اور مشرقِ وسطیٰ
چار شماروں کی قیمت: ۲۵ امریکی ڈالر
آٹھ شماروں کی قیمت: ۳۵ امریکی ڈالر

رقم بھیجنے کے لیے پتا
Dr Muhammad Umar Memon
5417, Regent Street,
Madison, Wisconsin 53705, USA.

لاطینی امریکا کے ملک کولمبیا سے تعلق رکھنے والے نوبیل انعام یافتہ ادیب
گابریئل گارسیا مارکیز
کی تحریروں کا ایک جامع انتخاب

دو مکمل ناول
"کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" اور "ایک پیش گفتہ موت کی روداد"
تیرہ منتخب کہانیاں
دو ناولوں "تنہائی کے سو سال" اور "وبا کے دنوں میں محبت" کے منتخب ابواب
مارکیز کی نوبیل انعام پیش کیے جانے کے موقعے کی تقریر اور ایک اہم مضمون
مارکیز کے فن پر دو مغربی نقادوں کے مضامین
ادبی زندگی، فن اور خیالات پر مارکیز کی ایک طویل گفتگو
مارکیز کی شخصیت اور حالاتِ زندگی کے بارے میں
ان کے ایک ہم وطن دوست ادیب کی ایک طویل تحریر

قیمت ۲۰۰ روپے

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

قیمت دس روپے

آج کی کتابیں
پی ۳۰۰، بلاک ۱۲ بی، نارتھ کراچی ٹاؤن شپ، کراچی ۷۵۸۵۰

تقسیم کار

مکتبۂ دانیال، صدر، کراچی
تھامس اینڈ تھامس، بک سیلرز، صدر، کراچی
کلاسیک، شاہراہِ قائداعظم، لاہور
پاکستان میں [illegible] رسالہ، لاہور